معارف القرآن

16

تصنیف

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

سورۃ العلق۔ تا۔ سورۃ الناس

جِلد 16

تصنیف

اُستاذ العُلماء شیخ الحدیث والتفسیر

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ

سابق اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی و مہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اِدارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبرز 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ⑯

اپنی بات (مولانا محمود الرشید حدوٹی)	۵	(سورۃ الفیل)	۱۸۶
(سورۃ العلق)	۸	اصحاب الفیل، کنکر، پرندے، ابرہہ	۱۸۶
تعلیم، تخلیق اور ابو جہل	۸	ولادت مصطفےٰ کریم ﷺ	۲۰۲
(سورۃ القدر)	۳۷	لشکر ابرہہ کو فوری عذاب کیوں؟	۲۰۴
قرآن، شب قدر، نزول ملائکہ	۳۷	(سورۃ القریش)	۲۱۲
(سورۃ البینہ)	۶۴	قریش کے تجارتی اسفار، پرامن زندگی	۲۱۲
یہود، نصاریٰ، مشرکین اور مسلمان	۶۴	(سورۃ الماعون)	۲۲۴
(سورۃ الزلزلہ)	۷۷	منکرین روز جزا اور منافقین کا انجام	۲۲۴
قیامت، زمین، انسان، اعمال	۷۷	(سورۃ الکوثر)	۲۳۸
(سورۃ العادیات)	۹۲	کوثر، نماز، قربانی اور دشمن رسول ﷺ	۲۳۸
گھوڑوں کی پانچ حالتیں اور انسانی ناشکری	۹۲	(سورۃ الکافرون)	۲۶۲
(سورۃ القارعہ)	۱۰۴	کفار کی فرمائش پر دندان شکن جواب	۲۶۲
احوالِ قیامت، وزن اعمال، جنت، دوزخ	۱۰۴	(سورۃ النصر)	۲۶۷
(سورۃ التکاثر)	۱۲۰	فتح مکہ کے ثمرات	۲۶۷
باہمی فخر و مباہات، موت، جہنم، نعمتیں	۱۲۰	(سورۃ المسد)	۳۹۸
(سورۃ العصر)	۱۴۷	ابولہب، ام جمیل اور ان کا انجام	۳۹۸
زمانہ، انسان، نقصان، اعمال صالحہ	۱۴۷	سورۃ الاخلاص::(۳۱۵) سورۃ کے نام	۳۱۹
(سورۃ الھمزہ)	۱۶۶	سورۃ الفلق::(۳۲۹) نبی ﷺ پر جادو	۳۵۱
غیبت، طعن، مال اور جہنم	۱۶۶	سورۃ الناس::جنات و انسانی وساوس	۳۵۵

اپنی بات

اَلْحَمْدُللّٰہِ نَحْمَدُہ وِنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُور اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا،مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہ فَلَامُضِلَّ لَہُ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہُ،اَمَّابَعْدُ

آج میرے دل ودماغ میں مسرت وشادمانی کے وہ جذبات مچل رہے ہیں جن کا اظہار نوک زبان ونوک قلم سے میرے لیے دشوار ہے، میں ہر بن موسے اپنے پروردگار جل شانہ کا شکر گزار ہوں، سجدہ شکر بجالاتا ہوں جس نے گزشتہ پانچ سالوں میں مجھے عظیم الشان تفسیری کام میں مشغول ومنہمک رکھا، الحمدللہ فی البدایہ والنہایہ

تفسیر معارف الفرقان سولہ جلدوں میں پایہ تکمیل کو پہنچی، وقفے وقفے سے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر شائقین اوراہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچتی رہی، میرے مشائخ اوراساتذہ کرام کی ادعیہ صالحہ اوردعائے سحر خیزی ہمہ وقت میرے ہمسفر رہیں، جن کی بدولت میں اس عظیم الشان کام سے آج سبکدوش ہورہا ہوں، میرے مخلصین، معاونین، مساعدین اور بہی خواہوں کی مخلصانہ ہمدردیوں اوردعاؤں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک عاجزومسکین بندہ اپنے پروردگار کی عظیم الشان کتاب قرآن کریم کی تفسیر معارف الفرقان امت مرحومہ کے اہل ذوق وشوق کے مطالعہ کی نذر کررہا ہے۔

شروع شروع میں میرا بالکل یہ خیال نہیں تھا کہ سولہ جلدوں پر معارف الفرقان پھیل جائے گی، میرا یہی گمان تھا کہ شاید دس جلدوں میں کام مکمل ہوجائے گا یابارہ میں، مگرجوں جوں تفسیری کام آگے بڑھتارہاتوں توں مضامین پھیلتے رہے، سمیٹنے کی خواہش کے باوجود مضامین سمیٹے نہیں جاسکے اور بالکل آخر میں مضامین کا اتنا عظیم الشان سلسلہ شروع ہوگیا کہ تیسویں پارے کو دوجلدوں پر مکمل کرنا پڑا۔

مجھ سے کئی ساتھیوں اور جاننے والوں نے دریافت کیا کہ تفسیر معارف الفرقان کی کچھ خصوصیات بیان فرمائیں، تو اس سوال پر میں ٹھٹھک کر رہ گیا، پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ میں اپنی اس متواضع اور عاجزانہ سی طالب علمانہ کاوش کی کیا خصوصیات بیان کروں؟ اور بڑے بڑے اہل علم و دانش کی تفاسیر اور رشحات قلم کے سامنے میری تفسیر معارف الفرقان کی کیا خصوصیات ہو سکتی ہیں سوائے ایک طالب علم کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ اور ثمر اور قدرت خداوندی کا بے بہا اثر۔

لیکن یہ ضرور عرض کیا کہ معارف الفرقان باقی تفاسیر سے اس لیے ذرا ہٹ کر ہے کہ اس میں پرانے مفسرین کا اسلوب نگارش اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں معروضی احوال کے پیش نظر سوال وجواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، جو اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں حتی کہ اب دینی مدارس میں بھی معروضی سوالات سے طلباء کی ذہنی آزمائش کی جاتی ہے، اس طریقہ کو فی زمانہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، تو بندہ نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

پھر رب تعالیٰ نے مطالعہ اور کتب بینی کی جو سہولیات آج مہیا فرمار کھی ہیں شاید اس سے پہلے نہیں تھیں، اگرچہ علم و عرفان پر گہری نظر سابقین مفسرین کی زیادہ تھی، مگر گلوبل دنیا میں آج تمام عربی اور اردو تفاسیر کسی لکھنے والے کے لیے ہمہ وقت مشعل راہ رہتی ہیں، وہ ایک ایک آیت کے ذیل میں مختلف مفسرین کرام کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے مزید خوبصورت اور شاندار توجیہات پیش کر سکتا ہے، بندہ کی معارف الفرقان میں اپنے اسلاف واکابر کی تفاسیر سے کماحقہ استفادہ دکھائی دیتا ہے اور جی بھر کر سابقین اہل تفسیر کی علمی تفاسیر سے استفادہ کیا گیا، جو بہت سے ناظرین کو بے شمار تفاسیر سے مستغنی کر دے گی۔

تفسیر معارف الفرقان دیکھنے والے کرم فرماؤں کو محسوس ہو گا کہ اس میں جس قدر مواد سمویا گیا ہے وہ باقی کسی تفسیر میں نہیں ہے، جن احباب نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ساتھ کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بہت سی باتیں معارف الفرقان میں ہی دیکھی گئی ہیں کسی اور تفسیر میں نظر

سے نہیں گزریں، اللہ کرے کہ ہمارے ناظرین اور شائقین کا حسن ظن قائم رہے اور معارف الفرقان ان کی علمی تشنگی بجھاتی رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی کتاب ہدایت سے کماحقہ فیض حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، یہ علم کا بحر ذخار ہے، جو جس قدر اس میں شناوری کرے گا اسی قدر نت نئے موتی اور گوہر ہائے آبدار تلاش کر کے امت کی آغوش میں منتقل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

یکم دسمبر ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت سوا دس بجے علی الصبح

سورۃ العلق

تعلیم، تخلیق اور ابو جہل

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ {۱}خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ {۲}اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ {۳}الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ {۴}عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ {۵}كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی {۶}اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی {۷}اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی {۸}اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی {۹}عَبْدًا اِذَا صَلّٰی {۱۰}اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰۤی {۱۱}اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی {۱۲}اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی {۱۳}اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی {۱۴}كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ {۱۵}نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ {۱۶}فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ {۱۷}سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ {۱۸}كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ {۱۹}العلق.

جواب ترجمہ: پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلی سرکشی کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارے پروردگار ہی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو ایک بندے کو منع کرتا ہے۔ جب وہ نماز پڑھتا ہے؟ بھلا بتلاؤ کہ اگر وہ (نماز پڑھنے والا) ہدایت پر ہو۔ یا تقوی کا حکم دیتا ہو (تو کیا اسے روکنا گمراہی نہیں؟) بھلا بتلاؤ کہ اگر وہ (روکنے والا) حق کو جھٹلاتا ہو، اور منہ موڑتا ہو۔ کیا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ خبردار! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم (اسے) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ اس پیشانی کے بال جو جھوٹی ہے، گنہگار ہے۔ اب وہ بلا لے اپنی مجلس والوں کو۔ ہم دوزخ کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ ہرگز نہیں! اس کی بات نہ مانو، اور سجدہ کرو، اور قریب آجاؤ۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ جو کچھ قرآن کریم میں سے آپ ﷺ پر اتارا جاتا ہے اسے اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیے، جس نے ہر انسان کو خون کے جمے ہوئے سرخ ٹکڑے سے پیدا کیا ہے۔

اے نبی ﷺ ! جو کچھ آپ ﷺ کی طرف اتارا جاتا ہے اسے پڑھیے، آپ ﷺ کا رب بہت احسان کرنے والا اور بہت زیادہ سخاوت کے دریا بہانے والا ہے، جس نے اپنی مخلوق کو قلم کے ذریعے لکھنے کا طریقہ سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھادیا جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا، اسے ظلمت جہل سے نور علم کی طرف منتقل کیا، جب کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے، جب اسے مالداری، تونگری اور ثروت مغرور بناتی ہے، ہر سرکش اور باغی کو جان لینا چاہیے کہ انجام کار اللہ کی طرف جانا ہے، وہ ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

آپ نے ابو جہل کی سرکشی نہیں دیکھی، وہ ہمارے بندے محمد ﷺ کو اپنے رب کی بارگاہ میں نماز کی ادائیگی سے رکاوٹ بنتا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں نمائندہ حق اور نمائندہ باطل کی معرکہ آرائی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ: حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کے آغاز میں حالت نیند میں آپ پر سچے خواب آتے آپ خواب نہ دیکھتے مگر وہ اس طرح واضح ہوتے جیسے صبح ہوتی ہے پھر آپ کو خلوت محبوب ہونے لگی تو آپ غار حرا میں خلوت گزین ہونے لگے آپ گھر لوٹنے سے پہلے کئی کئی دن عبادت کرتے رہتے تھے اور ان کے لیے زادِ راہ بھی لے جایا کرتے تھے پھر آپ خدیجۃ الکبری کی طرف لوٹتے تو اس کی مثل زادِ راہ لے جاتے یہاں تک کہ حق ان پر اچانک عیاں ہوا جب کہ آپ غار حرا میں تھے ایک فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا، اقرأ (پڑھو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ماانا بقاری (میں پڑھنے والا نہیں) فرمایا، اس فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ مجھے مشقت ہوئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اس نے کہا، اقرأ میں نے کہا، ماانا

بقاری، اس نے مجھے پھر پکڑا اور مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی پھر مجھے چھوڑ دیا، پھر کہا اقرأ میں نے کہا، ماانابقاری اس نے مجھے پکڑا اور تیسری دفعہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا پھر اس فرشتے نے کہا اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (بخاری و مسلم)

علامہ کاندھلوی اپنی کتاب سیرت المصطفےٰ ﷺ میں لکھتے ہیں ماانابقاری کے بظاہر معنیٰ یہ ہیں کہ میں پڑھا ہوا نہیں امی ہوں لیکن اس معنیٰ میں اشکال یہ ہے کہ قرأت یعنی زبان سے پڑھنا اُمیّت کے منافی نہیں، اُمی شخص بھی کسی کے تعلیم و تلقین سے قرأت اور تلفظ کر سکتا ہے خصوصاً جبکہ فصاحت وبلاغت اس کی غلام ہو، اُمیّت کتابت کے منافی ہے، اُمی شخص لکھی ہوئی تحریر کو نہیں پڑھ سکتا لیکن زبانی تعلم و تلقین سے تلقین کردہ الفاظ کی قرأت کر سکتا ہے پس اگر جبریل امین کوئی لکھی ہوئی تحریر لے کر آئے تھے کہ جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اور اس کی نسبت یہ کہتے تھے کہ اقرأ یعنی اس تحریر کو پڑھو تو پھر اس کے جواب میں ماانابقاری کہنا ظاہر اور مناسب ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جبریل ایک حریری صحیفہ لے کر آئے جو جواہرات سے مرصع تھا اور وہ صحیفہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اقرأ یعنی اس حریری صحیفہ کو پڑھیے، آپ نے فرمایا ماانابقاری یعنی میں اُمی ہوں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ نہیں سکتا۔

زرقانی شرح مواہب ص ۲۱۸ میں ہے قَدرَوَی ابنُ اِسحَاق فی مُرسل عُبیدبن عُمَیر جَاءَ جبریلُ بنَمطٍ مِّن دِیبَاجٍ فِیهِ کِتَابٌ (سیرت المصطفےٰ ﷺ)

بعض مفسرین کا قول ہے کہ الٓمٓ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ میں اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے جو جبریل امین لے کر آئے تھے اور اگر جبریل امین کوئی تحریر لے کر نہیں آئے تھے اور اقرأ سے کسی لکھی ہوئی تحریر کا پڑھنا مطلوب نہ تھا بلکہ محض زبان سے قرأت اور تلفظ مطلوب تھا تو اس صورت میں ماانابقاری کے یہ معنیٰ نہیں کہ میں اُمی ہوں، پڑھا ہوا نہیں بلکہ یہ معنیٰ ہیں کہ وحی کی ہیبت

اور دہشت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتا، رویت ملک اور مشاہدہ انوار وحی کی وجہ سے قلب پر اس درجہ ہیبت طاری ہے کہ زبان اٹھتی نہیں کس طرح پڑھوں جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کیف اقرأ اس بنا پر ہم نے ماانابقاری کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ میں پڑھ نہیں سکتا جو اس معنٰی کے بھی مناسب ہے اور پہلے معنٰی کے ساتھ بھی درست ہو سکتا ہے، ھذا ماتوضیح ماافادہ الشیخ عبدالحق المحدث الدھلوی۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۵۲۲)

ابورجاعُطاردی نے کہا، حضرت ابوموسی اشعری ہماری اس مسجد (مسجد نمرہ) میں ہمارے ہاں تشریف لاتے ہمیں حلقوں میں بٹھاتے اور ہمیں قرآن پڑھاتے گویا میں انہیں دو سفید کپڑوں میں دیکھ رہا ہوں ان سے ہی میں نے یہ سورت لی ہے، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ یہ وہ پہلی سورت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ ماوردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ وہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی اس کے بعد ن والقلم اس کے بعد یاایھا المدثر، اور اس کے بعد والضحیٰ نازل ہوئی۔

علامہ زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلی سورت اِقرَاء باسمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ، سے مَالَم یَعلَم۔ تک نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ غمگین ہوئے آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے تو حضرت جبریل امین ان کے پاس آتے تو آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس لوٹے اور کہا، دَثِّرُونِی وَصُبُّوا عَلَیَّ مَاءً بَارِدًا مجھے چادر اوڑھادو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی انڈیلو تو یہ آیت نازل ہوئی، یاایھا المدثر

اِقرَاء باسمِ رَبِّكَ کا معنٰی ہے قرآن حکیم میں سے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اپنے رب کے نام سے شروع کرتے ہوئے پڑھیے، یہاں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ شریف پڑھیے۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: الانسان سے مراد ابن آدم ہے، علق سے مراد خون ہے، یہ علقۃ کی جمع ہے علقہ سے مراد جامد خون ہے، جب وہ چلے تو اسے مسفوح کہتے ہیں یہاں علق فرمایا، اور جمع کا صیغہ

ذکر کیا، کیونکہ الانسان سے مراد بھی جمع ہے سب کے سب نطفہ کے بعد علق سے پیدا کیے گئے، العلقہ ترخون کا ایک حصہ ہے اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہ اپنی رطوبت کی وجہ سے ہر اس چیز کے ساتھ چمٹ جاتا ہے جو اس پر گزرتی ہے جب وہ خشک ہو جائے تو وہ علقہ نہیں ہوتا۔

انسان کا خصوصاً ذکر کیا مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے ایک قول یہ کیا گیا، یہ ارادہ کیا کہ اس پر جو احسان کیا ہے اس کی قدر و منزلت کو بیان کرے اس طرح کہ اسے حقیر جمے ہوئے خون سے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ مکمل انسان، عقل مند اور امتیاز کرنے والا ہو گیا۔ (تفسیر قرطبی)

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ: اقراء یہ تاکید کے لیے ہے کلام مکمل ہوئی پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا اور فرمایا، وربک الاکرم، یہاں الاکرم کریم کے معنی میں ہے کلبی نے کہا، معنی ہے بندوں کے جاہلانہ طرز عمل پر حلم کرتا ہے انہیں جلدی سزا نہیں دیتا پہلا معنی معنوی طور پر زیادہ مناسب ہے کیونکہ جب جو نعمتیں پہلے ہوئیں ان کا ذکر کیا تو ان کے وسیلہ سے اپنے کرم پر دلالت کی ایک قول یہ کیا گیا ہے، اقراء وربک کا معنی ہے اے محمد! پڑھیے جب کہ آپ کا رب تیری مدد کرے گا اور تجھے سمجھا دے گا اگرچہ آپ پڑھے ہوئے نہیں اور الاکرم کا معنی ہے وہ بندوں کی جہالتوں سے درگزر فرمانے والا ہے۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔ خط و کتابت انسان کے لیے اظہار مافی الضمیر کا بہت بڑا اور اہم ذریعہ ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سورۃ نون والقلم میں قلم کی قسم کھا کر اس کی عظمت و رفعت کو چار چاند لگائے، اب یہاں قلم کے ساتھ تعلیم دینے کا ذکر فرما کر اس کی عظمت مزید اجاگر کر دی، جن لوگوں کا قلم کے ساتھ دن رات کا واسطہ ہے وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ قلم اللہ کی کس قدر عظیم نعمت ہے، آج تک پوری دنیا میں اگر معلومات کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے تو وہ اسی قلم کا کارنامہ ہے، جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال و حوادث کو لکھا، جس نے پرانی آسمانی کتابوں کو لکھا، جس نے ابتدائے آفرینش سے انسانی واقعات کو محفوظ کیا، جس پر تاریخ کی کتب گواہ ہیں، کتابیں

مدون کی گئیں، رفتہ رفتہ ذخیرہ کرنے کے لیے سائنس نے ترقی کی، کمپیوٹر وجود میں آئے، چھوٹی چھوٹی ایسی ڈیوائیسز زوجود میں آئیں جن میں ہزاروں، لاکھوں صفحات محفوظ کر دیے جاتے ہیں اور پوری دنیا کے لوگ اس سے حسب استعداد وصلاحیت فائدہ اٹھارہے ہیں، ان ساری چیزوں کا وجود اپنی جگہ اہم ہے مگر قلم کا کام ان سب سے اہم اور بنیادی ہے۔

رحمت دوعالم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز اور افتخار بخشا کہ ان میں سے خدا کے چنیدہ لوگوں نے اپنی زندگیاں قلم اور کتاب کے ساتھ گزار دیں، شبانہ روز مصروف ومشغول رہ کر اس امت کے خوش نصیبوں نے آنے والی نسلوں تک تاریخی واقعات پہنچائے، عبرتناک داستانیں رقم کیں، چشم دید واقعات قلم بند کیے، انبیاء کی سیرتیں محفوظ کیں، قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھی اور اسے نسلاً بعد نسل، قرناً بعد قرن آگے سے آگے پہنچایا۔

خوش بختانِ امت نے ذخیرہ احادیث کو جمع کیا، ان کے ایک ایک لفظ کو نوک قلم سے محفوظ کیا، ان احادیث کے رواۃ کی چھان پھٹک کی، ان کے احوال وسیرتیں قلم بند کیں، ان کے شجرے محفوظ کیے، ان کے احوال جانے پھر انہیں رقم کیا، یوں ایک علم اسماء الرجال کا وجود میں آیا، اس سارے فن کی آمد سے پہلے قلم نے نمایاں اور بنیادی کام کیا۔

آج دنیا میں کائنات کے عظیم انسان، رحمت انس وجان نبی کریم ﷺ کی سیرت وکردار، حالات وواقعات، ارشادات وفرمودات، آپ کا نشیب وفراز، آپ کی گفتار وکردار، آپ کے سونے جاگنے کے احوال اگر اصحاب پیغمبر ﷺ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، کانوں سے سنے تو نوک قلم نے انہیں محفوظ کیا، آج دنیا بھر کے خوش نصیب اہل قلم وتحریر پہلے لکھنے والے سیرت نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے حوالوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی سیرت وکردار، حالات وواقعات کو لکھ رہے ہیں اور بیان کر رہے ہیں، اس میں قلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ قلم وکتابت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

الْقَلَمُ نِعْمَةٌ مِنَ اللهِ تَعَالَى عَظِيمَةٌ، لَوْلَا ذَالِكَ لَمْ يَقُمْ دِينٌ، وَلَمْ يَصْلُحْ عَيْشٌ. فَدَلَّ عَلَى كَمَالِ كَرَمِهِ سُبْحَانَهُ، بِأَنَّهُ عَلَّمَ عِبَادَهُ مَا لَمْ يَعْلَمُوا، وَنَقَلَهُمْ مِنْ ظُلْمَةِ الْجَهْلِ إِلَى نُورِ الْعِلْمِ، وَنَبَّهَ عَلَى فَضْلِ عِلْمِ الْكِتَابَةِ، لِمَا فِيهِ مِنَ الْمَنَافِعِ الْعَظِيمَةِ، الَّتِي لَا يُحِيطُ بِهَا إِلَّا هُوَ. وَمَا دُوِّنَتِ الْعُلُومُ، وَلَا قُيِّدَتِ الْحِكَمُ، وَلَا ضُبِطَتْ أَخْبَارُ الْأَوَّلِينَ وَمَقَالَاتُهُمْ، وَلَا كُتُبُ اللهِ الْمُنَزَّلَةُ إِلَّا بِالْكِتَابَةِ، وَلَوْلَا هِيَ مَا اسْتَقَامَتْ أُمُورُ الدِّينِ وَالدُّنْيَا

یہ اللہ تعالیٰ کے کمال کرم پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتے تھے اور انہیں جہالت کی ظلمت سے علم کے نور کی طرف نکالا اور علم کتابت کی فضیلت پر آگاہ کیا کیونکہ اس میں ایسے عظیم منافع ہیں جس کا احاطہ اس ذات کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، نہ علوم مدون ہوئے، نہ حکمتیں مقید ہوئیں، نہ پہلے لوگوں کی خبریں اور مقالات ضبط ہوئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابیں محفوظ ہوئیں مگر کتابت کے ذریعے ہی یہ سب کچھ ہوا اگر ایسا نہ ہوتا تو دین و دنیا کے امور درست نہ ہوتے۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ قلم کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قلم کو قلم اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اسے کاٹا جاتا ہے اس معنی میں تقلیم الظفر ہے جس کا معنی ناخن کاٹنا ہے ایک شاعر نے قلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

فَكَأَنَّهُ وَالْحِبْرُ يَخْضِبُ رَأْسَهُ ... شَيْخٌ لِوَصْلِ خَرِيدَةٍ يَتَصَنَّعُ

لِمَ لَا أُلَاحِظُهُ بِعَيْنِ جَلَالَةٍ ... وَبِهِ إِلَى اللهِ الصَّحَائِفُ تُرْفَعُ

گویا وہ قلم جب کہ روشنائی اس کے سر کو رنگین کرتی ہے ایک بوڑھا شخص ہے جو دوشیزہ کو پانے کے لیے تصنع کرتا ہے میں اس قلم کو شرف کی آنکھ سے کیوں نہ دیکھوں، جب کہ اس کے ذریعے صحائف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند کیے جاتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عرض کیا یَا رَسُولَ اللّٰہِ، أَأَكْتُبُ مَا أَسْمَعُ مِنْكَ مِنَ الْحَدِيثِ؟ قَالَ: نَعَمْ فَاكْتُبْ، فَإِنَّ اللّٰهَ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، یارسول اللہ! جو بات میں آپ ﷺ سے سنوں کیا میں اسے لکھ لیا کروں؟ فرمایا، ہاں لکھو بیشک اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

مجاہد رحمہ اللہ نے ابو عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أَرْبَعَةَ أَشْيَاءَ بِيَدِهِ، ثُمَّ قَالَ لِسَائِرِ الْحَيَوَانِ: كُنْ فَكَانَ، الْقَلَمَ، وَالْعَرْشَ، وَجَنَّةَ عَدْنٍ، وَآدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ (قرطبی) اللہ تعالیٰ نے چار چیزیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیں پھر باقی تمام چیزوں کے لیے فرمایا، کن ہو جا تو وہ ہر چیز ہو گئی، قلم، عرش، جنت عدن، اور حضرت آدم علیہ السلام۔

اللہ تعالیٰ نے قلم کے ساتھ کسے تعلیم دی، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس بارے میں تین اقوال نقل فرمائے ہیں، پہلا قول حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو قلم کے ساتھ تعلیم دی، کیونکہ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے لکھا۔

دوسرا قول حضرت ضحاک رحمہ اللہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو بذریعہ قلم تعلیم دی، کیونکہ وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے تیسرا قول ذکر کرتے ہوئے قائل کا نام نہیں لیا اور فرمایا أَنَّهُ أَدْخَلَ كُلَّ مَنْ كَتَبَ بِالْقَلَمِ، لِأَنَّهُ مَا عُلِّمَ إِلَّا بِتَعْلِيمِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ، وَجَمَعَ بِذَلِكَ نِعْمَتَهُ عَلَيْهِ فِي خَلْقِهِ، وَبَيَّنَ نِعْمَتَهُ عَلَيْهِ فِي تَعْلِيمِهِ، اسْتِكْمَالًا لِلنِّعْمَةِ عَلَيْهِ، جس نے بھی بذریعہ قلم تحریر کیا وہ اس نے اس فرمان میں داخل کیا، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے ہی یہ فن جانا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کر کے جو نعمت کی اور اس کو تعلیم دے کر جو نعمت کی سب کو جمع کر دیا تا کہ اس پر اپنی نعمت کو مکمل کرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ، فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ: إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي، جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا

کیا تو اپنی کتاب میں لکھا جب کہ وہ کتاب اس کے پاس عرش کے اوپر تھی کہ بے شک میری رحمت میرے غصے پر غالب ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللهُ: القَلَمَ، فَقَالَ لَهُ اُكْتُب، فَكَتَبَ مَا يَكُونُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَهُوَ عِنْدَهُ فِي الذِّكْرِ فَوْقَ عَرْشِهِ، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اسے فرمایا لکھو تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا اس نے لکھ دیا، جب کہ وہ عرش کے اوپر ذکر میں اس کے پاس تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا إِذَا مَرَّ بِالنُّطْفَةِ ثِنْتَانِ وَأَرْبَعُونَ لَيْلَةً، بَعَثَ اللهُ إِلَيْهَا مَلَكًا فَصَوَّرَهَا، وَخَلَقَ سَمْعَهَا وَبَصَرَهَا وَجِلْدَهَا وَلَحْمَهَا وَعَظْمَهَا، ثُمَّ يَقُولُ، يَا رَبِّ، أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثَى؟ فَيَقْضِي رَبُّكَ مَا شَاءَ وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ ثُمَّ يَقُولُ: يَا رَبِّ أَجَلُهُ، فَيَقُولُ رَبُّكَ مَا شَاءَ، وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ، ثُمَّ يَقُولُ يَا رَبِّ رزقُه، ليقضى رَبُّكَ مَا شَاءَ، وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ، ثُمَّ يَخْرُجُ الْمَلَكُ بِالصَّحِيفَةِ فِي يَدِهِ، فَلَا يَزِيدُ عَلَى مَا أُمِرَ وَلَا يَنْقُصُ، (تفسیر قرطبی)

جب نطفہ پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں جو اس کی صورت بناتا ہے، اور اس کے کان، آنکھ، جلد، گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے پھر وہ عرض کرتا ہے، اے میرے رب! کیا یہ مذکر ہے یا مونث؟ تو تیرا رب جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے پھر فرشتہ عرض کرتا ہے، اے میرے رب! اس کی اجل؟ تو تیرا رب جو چاہتا ہے فرماتا ہے فرشتہ وہ لکھ لیتا ہے پھر فرشتہ عرض کرتا ہے اس کا رزق؟ تیرا رب جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے پھر فرشتہ اپنے ہاتھ میں صحیفہ لے کر نکل جاتا ہے۔ اسے جو حکم دیا گیا ہوتا ہے اس میں نہ اضافہ کرتا ہے اور نہ کمی کرتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے فرمایا، اصل میں قلم تین ہیں

الْقَلَمُ الْأَوَّلُ:الَّذِی خَلَقَهُ اللّٰهُ بِیَدِهٖ وَأَمَرَهُ أَنْ یَکْتُبَ. وَالْقَلَمُ الثَّانِی: أَقْلَامُ الْمَلَائِکَةِ، جَعَلَهَا اللّٰهُ بِأَیْدِیهِمْ یَکْتُبُونَ بِهَا الْمَقَادِیرَ وَالْکَوَائِنَ وَالْأَعْمَالَ. وَالْقَلَمُ الثَّالِثُ: أَقْلَامُ النَّاسِ، جَعَلَهَا اللّٰهُ بِأَیْدِیهِمْ، یَکْتُبُونَ بِهَا کَلَامَهُمْ، وَیَصِلُونَ بِهَا مَآرِبَهُمْ

پہلا قلم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا اوراسے لکھنے کا حکم دیا، دوسرا فرشتوں کی وہ قلمیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دی ہیں جن کے ساتھ وہ تقدیریں، قیامت تک ہونے والی باتیں اوراعمال لکھتے ہیں، تیسرا لوگوں کی قلمیں جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ہاتھوں میں دی ہیں جن کے ساتھ وہ اپنا کلام لکھتے ہیں اوران کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔(تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتابت اور لکھنے کے بہت سے فضائل ہیں، کتابت بیان کا حصہ ہے، بیان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ آدمی کو خاص کیا گیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ عرب لوگوں میں سے سب سے کم لکھنا جانتے تھے، عربوں میں سے سب سے کم اس کی پہچان رکھنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے اس لیے دور رکھا گیا تھا کہ یہ امر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کو سب سے زیادہ ثابت کرنے والا اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت میں سے زیادہ مضبوط اور قوی ہو۔(قرطبی)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قلم کے ذریعے سکھایا، اس کی دووجوہ ہیں، ایک یہ کہ قلم سے مراد لکھنا ہے جس کے ذریعے امور غیبیہ معلوم ہوتے ہیں،، قلم کو اسی سے کنایہ بنایا گیا ہے، دوسرا یہ کہ انسان کو قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا، دونوں باتیں قریب قریب ہیں، کیونکہ اس سے لکھائی کی فضیلت پر خبر دار کرنا مراد ہے۔

منقول ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ایک عفریت سے کلام کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ کلام وہ ہوا ہے جو باقی نہیں رہتی، سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کہ اسے قابو میں کیسے کیا جائے؟ اس نے کہا کہ کلام کو قابو کرنے کا طریقہ لکھائی ہے، قلم شکاری ہے جو علوم کو شکار کرتا ہے، روتا ہے، ہنستا ہے، اس کے رکوع کے ساتھ لوگ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، اس کی حرکت کے ساتھ گردش شام و سحر میں علوم کی بقاء ہے، اس کی مثال حضرت زکریا علیہ السلام کا فرمان ہے، کہ وہ اپنے رب کو چپکے چپکے پکارتے رہے، یہ چھپاتے بھی رہے اور سناتے بھی رہے، اسی طرح قلم بھی ہے جو بولتا نہیں ہے پھر مشرق و مغرب کو سناتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، **لَا تُسْكِنُوا نِسَاءَكُمُ الْغُرَفَ، وَلَا تُعَلِّمُوهُنَّ الْكِتَابَةَ**، اپنی عورتوں کو بالاخانوں میں نہ رکھو اور نہ ہی انہیں لکھنا سکھاؤ۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے لوگوں کو خبر دار کیا کیونکہ جب عورتوں کو بالاخانوں میں رکھا جائے گا تو وہ مردوں کی طرف جھانکیں گی، نہ اس میں ان کے لیے پاکدامنی رہے گی اور نہ ہی پردہ ہو گا اس کی وجہ یہ ہے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتیں، یہاں تک کہ وہ مردوں کی طرف جھانکتی ہیں تو فتنہ و آزمائش جنم لیتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبر دار کیا کہ وہ ان کے لیے بالاخانے نہ بنائیں جو ان کے فتنہ کا ذریعہ ہیں، یہ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، **لَيْسَ لِلنِّسَاءِ خَيْرٌ لَهُنَّ مِنْ أَلَّا يَرَاهُنَّ الرِّجَالُ، وَلَا يَرَيْنَ الرِّجَالَ**، عورتوں کے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ مرد انہیں نہ دیکھیں، اور وہ مردوں کو نہ دیکھیں۔

اس کی وجہ یہ ہے عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے اس کا اشتیاق مرد میں ہے مرد میں شہوت پیدا کی گئی ہے اور عورت کو اس کے لیے سکون بنا دیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے بارے میں امن میں نہیں، اسی طرح لکھنے کی تعلیم ہے بعض اوقات یہ فتنہ کا سبب ہوتا ہے اس کی صورت یہ ہے

جب اسے لکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے تو وہ اسے خط لکھتی ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے کتابت بھی آنکھوں میں سے ایک آنکھ ہے اس کے ذریعے، حاضر، غائب کو دیکھتا ہے خط ہاتھ کے آثار میں سے ہے۔ اس لکھائی میں مافی الضمیر کی تعبیر ہوتی ہے جب کہ زبان کے ساتھ نہیں بولا جاتا یہ زبان سے بھی زیادہ بلیغ ہے رسول اللہ ﷺ نے یہ پسند کیا کہ ان سے فتنہ کے اسباب منقطع ہو جائیں تا کہ ان کی عصمت باقی رہے اور ان کے دل پاک رہیں۔

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعہ کا ذکر تھا جو عام طور پر تعلیم کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی قلمی تعلیم۔ ذریعہ علم صرف قلم نہیں بلکہ بے شمار ذرائع ہیں، اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ اصل تعلیم دینے والا اللہ تعالیٰ سبحانہ ہے اور اس کے لئے ذرائع تعلیم بیشمار ہیں، کچھ قلم ہی کیساتھ مخصوص نہیں اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے ناواقف تھا، اس میں قلم یا کسی دوسرے ذریعہ تعلیم کا ذکر نہ فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی ابتداء آفرینش سے جاری ہے کہ اول اس میں عقل پیدا کی جو سب سے بڑا ذریعہ علم ہے، انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے پھر اس کے پس و پیش میں اپنی قدرت کاملہ کے ایسے مناظر اور دلائل قدرت رکھ دیئے جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکے۔

پھر وحی اور الہام کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم انسان کو عطا فرمایا اور بہت سی ضروری چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں خود بخود پیدا فرما دیا جس میں کسی زبان یا قلم کی تعلیم کا دخل نہیں، ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی غذا کے مرکز یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے پھر چھاتی سے دودھ اتارنے کے لئے منہ کو دبانا (اس کو کس نے سکھایا اور کون سکھا سکتا تھا، پھر اس کو ایک ہنر رونے کا اللہ تعالیٰ نے اول ولادت ہی سے سکھا دیا، بچے کا یہ رونا اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اس کو روتا ہوا دیکھ کر ماں باپ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کو کیا تکلیف ہے؟

اس کی بھوک پیاس، سردی، گرمی کی سب ضروریات اسی رو دینے سے ہی پوری ہوتی ہیں، یہ رونے کی تعلیم اس نومولود کو کون کر سکتا تھا اور کس طرح کرتا؟ یہ سب وہبی علم ہے جو اللہ تعالیٰ ہر جاندار کے خصوصاً انسان کے ذہن میں پیدا فرما دیتا ہے۔

اس ضروری علم کے بعد پھر زبانی تعلیم پھر قلبی تعلیم کے ذریعہ اس کے علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مالم یعلم یعنی جس کو وہ نہیں جانتا تھا اس کے کہنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ عادۃ تعلیم تو اسی چیز کی ہوتی ہے جس کو انسان نہیں جانتا اس کے فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس خداداد علم وہنر کو انسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے، مالم یعلم سے اشارہ فرمادیا کہ انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا یعنی اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، معلوم ہوا کہ انسان کو بھی جو بھی علم وہنر ملا ہے وہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ سب خالق ومالک کا عطیہ ہے۔ (مظہری، معارف القرآن للمفتی)

انسان جو خون کی ایک پھٹکی سے بنا ہے وہ چیزیں سکھائیں کہ جن کو وہ جانتا نہ تھا، حضرات انبیاء علیہم السلام کو اسرار غیب بتائے، بندوں کو تجارت اور دنیاوی انتظام کے قانون سکھائے، عرفاء کو مواجید و اشواق کے رستے بتائے، ذات وصفات کے علوم عطا کئے، حکماء کو صدہا علوم اور علوم کے اصول سکھائے، جن سے انہوں نے دنیا میں وہ وہ عجائب فنون ایجاد و اختراع کئے جو حیرت بخش ہیں، عام ہے کہ قلم کے ذریعہ سے یا خود اس کے دل میں القاء کئے ہیں، ان آیات میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تعلیم الٰہی کے دو طریقے ہیں ایک تعلیم قلم یعنی تعلیم کتابی یہ کسی دوسرے کا فیض ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو حاصل ہوا کرتا ہے۔

دوم تعلیم روحانی یالدنی جو وحی والہام کے ذریعے سے انبیاء کو ہوتی اور قرآن تعلیم لدنی ہے اور یہ قلم کے ذریعہ سے پچھلوں تک متوارث ہوتا رہے گا، بعض عرفاء فرماتے ہیں کہ قلم سے مراد قلم اعلیٰ

ہے یعنی روح اعظم جو واسطہ ہے علوم غیبیہ کا، اس کے ذریعے سے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو جانتا نہ تھا۔ (تفسیر حقانی)

مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کو جن وسائل سے علم آتا ہے بہت سے ہیں، ازانجملہ قلم ہے جس کا ذکر ہوا، ازانجملہ حواس ظاہرہ و باطنہ ہیں، یہ جزئیات مادیات کے علم میں کام آتے ہیں، ازانجملہ استدلال و نظر و فکر ہے جو چند معلومات کے مرتب کرنے سے مجہول چیز معلوم ہو جاتی ہے، ازانجملہ کشف ہے، ازانجملہ رویاء صادقہ ہیں، ازانجملہ وحیٔ الہام ہے، نجوم و رمل و جفر علم معین یقین کے ذرائع نہیں ان سے جو حاصل ہوتا ہے وہ ظن ہے اور وہ کار آمد نہیں (تفسیر حقانی)

اس آیت میں الانسان ہے، اس کے بارے میں ارباب تفسیر دو قول نقل کرتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی چیزوں کے نام سکھا کر فرشتوں کے سامنے ان کی برتری اور عظمت ظاہر کی تھی، جس کا ذکر قرآن کریم کی سورت بقرہ میں موجود ہے، بعض یہ فرماتے ہیں کہ الانسان سے یہاں مراد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس پر دلیل سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۱۳ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے حبیب! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ سکھا دیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے، ایک مقام پر تو یہاں تک فرمایا کہ آپ کتاب نہیں جانتے تھے لیکن ہم نے اس کتاب کو روشنی بنا دیا۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى: حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلی سرکشی کر رہا ہے۔ اس کے بعد سورت کے آخر تک جو آیتیں ہیں، وہ غار حراء کے واقعے کے کافی بعد نازل ہوئی تھیں، اور ان کا واقعہ یہ ہے کہ ابو جہل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، اس نے آپ کو نماز پڑھنے سے منع کیا، اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ نے نماز پڑھی تو میں (معاذاللہ) آپ کی گردن کو پاؤں سے کچل دوں گا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ (آسان ترجمہ)

یہاں لِیَطْغٰی کا لفظ ہے، اس کا مصدر طغیان ہے، اس کا معنٰی ہے اللہ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا، مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں اور مشرکین نے انہیں سنا تو ابو جہل نے آپ کے پاس آکر کہا یَا مُحَمَّدُ تَزْعُمُ أَنَّهُ مَنِ اسْتَغْنَى طَغَى، فَاجْعَلْ لَنَا جِبَالَ مَكَّةَ ذَهَبًا، لَعَلَّنَا نَأْخُذُ مِنْهَا، فَنَطْغَى فَنَدَعَ دِينَنَا وَنَتَّبِعَ دِينَكَ اے محمد ﷺ آپ کا یہ زعم ہے کہ جو مستغنی ہوتا ہے، وہ سرکشی کرتا ہے تو آپ ہمارے لئے مکہ کے پہاڑوں کو سونا بنادیں، شاید ہم اس سے کچھ سونا لے لیں، پھر ہم اپنا دین چھوڑ کر آپ کے دین کی پیروی کریں گے، تب آپ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور کہا،

يَا مُحَمَّدُ خَيِّرْهُمْ فِي ذَلِكَ فَإِنْ شَاءُوا فَعَلْنَا بِهِمْ مَا أَرَادُوهُ: فَإِنْ لَمْ يُسْلِمُوا فَعَلْنَا بِهِمْ كَمَا فَعَلْنَا بِأَصْحَابِ الْمَائِدَةِ

اے محمد! ﷺ آپ ان کو اختیار دیں، اگر یہ چاہیں تو ہم پہاڑ کو سونا بنادیں اس کے باوجود اگر انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو ہم ان پر وہ عذاب نازل کریں گے، جو اصحاب مائدہ پر نازل کیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کو علم ہو گیا کہ وہ اس کو قبول نہیں کریں گے، اس لئے آپ نے ان کو ان کے اسی حال پر باقی رکھا۔

أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى: اس نے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ لیا ہے، یعنی اپنے قبیلہ اور دیگر مددگاروں کے ہونے کی بناء پر اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ لیتا ہے اور اس کو جب مل جاتا ہے تو وہ اپنے کھانے، پینے، لباس اور سواریوں میں بہت اضافہ کرتا ہے، حالانکہ یہ چیزیں مل جانے کے بعد انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے رب کا زیادہ شکر گزار بندہ بن جائے، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام مسکینوں کو اپنے پاس بٹھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ایک مسکین دوسرے مسکین کے پاس بیٹھا ہوا ہے، نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں حضرت عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مالدار انسان تھے، مگر انہوں نے کبھی کبر و غرور اور نخوت و بیزاری کا اظہار نہیں کیا، اس لیے کہ ایک عاقل و دانا انسان کے لیے ضروری ہے کہ جب

اس کے پاس مال کی فراوانی اور دولت کی کثرت ہو تو وہ زیادہ اللہ کی طرف رجوع کرے، بہ نسبت زمانہ فقر کے، کیونکہ زمانہ فقر میں اسے صرف اپنے فقر کی پریشانی لاحق ہوتی ہے، جب کہ مالداری وثروت کے زمانے میں اسے اپنے مال، اپنی جان اور اپنے ممالیک کی فکر بھی دامن گیر ہوتی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استغنیٰ کی سین طلب کے معنیٰ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان دیکھتا ہے کہ اس نے مالداری، تونگری اور ثروت پالی ہے اور یہ جو کچھ اسے ملا ہے یہ اس کی جہد وکاوش کا نتیجہ ہے، حالانکہ یہ اس کی کاوش وکوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کی عطا اور توفیق سے ہے، مستغنی اور بے نیاز انسان جس طرح سوچتا ہے یہ جہالت اور حماقت ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ کتنے ہیں جو حرص وطلب میں جانفشانی سے کام لیتے ہیں مگر وہ بھوک میں مر جاتے ہیں، پھر آپ لوگ آخرت میں بہت سے مالداروں، تونگروں اور صاحبان ثروت کو دیکھیں گے کہ ڈرتے ہوئے پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں دکھائے گا کہ یہ مالداری اور تونگری ان کے کسی فعل اور ان کی کسی قوت کی وجہ سے نہیں تھی۔

اس سورت کا اسلوب بیان بہت ہی عجیب ہے، اس کے شروع میں علم کی مدح کی گئی جب کہ اس کے آخر میں مال کی مذمت کی گئی، اور یہ بات دین وعلم میں رغبت اور شوق رکھنے والے کے لیے اور دنیا ومال سے نفرت کرنے والے کے بارے میں کافی ہے۔

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ: بیشک آپ کے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ الرجعی، المرجع اور الرجوع یہ تینوں مصدر ہیں، اس کا معنیٰ ہے لوٹنا، یہاں بتایا جارہا ہے کہ جب ابوجہل آخرت میں پہنچے گا تو اسے اپنے تکبر اور سرکشی کی سزا مل جائے گی۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے ظاہر معنیٰ تو یہی ہیں کہ مرنے کے بعد سب کو اللہ کے پاس جانا اور اچھے برے اعمال کا حساب دینا ہی اس وقت اس طغیانی اور سرکشی کے انجام بد کو آنکھوں سے دیکھ لے گا اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس جملے میں مغرور انسان کے غرور کا علاج بتلایا گیا ہو کہ اے احمق! تو اپنے آپ کو سب سے بے نیاز خود مختار سمجھتا ہے اگر غور کرے گا تو اپنی ہر حالت بلکہ

ہر حرکت و سکون میں تو اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا محتاج پائے گا، اگر اس نے تجھے کسی انسان کا محتاج بظاہر نہیں بنایا تو کم از کم اس کو تو دیکھ کہ اللہ تعالیٰ کا تو ہر چیز میں محتاج ہے۔

اور انسانوں کی محتاجی سے بے نیاز سمجھنا بھی صرف ظاہری مغالطہ ہی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے وہ اکیلا اپنی ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کو بھی پورا نہیں کر سکتا، اپنے ایک لقمہ کو دیکھے تو پتہ چلے گا کہ ہزاروں انسانوں اور جانوروں کی محنت شاقہ اور مدت دراز تک کام میں لگے رہنے کا نتیجہ یہ لقمہ تر ہے جو بے فکری کے ساتھ نگل رہا ہے اور اتنے ہزاروں انسانوں کو اپنی خدمت میں لگالینا کسی کے بس کی بات نہیں۔

یہی حال اس کے لباس اور تمام دوسری ضروریات کا ہے کہ ان کے مہیا کرنے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں اور جانوروں کی محنت کا دخل ہے جو تیرے غلام نہیں اگر تو ان سب کو تنخواہیں دے کر بھی چاہتا کہ اپنے اس کام کو پورا کرے تو ہر گز تیرے بس میں نہ آتا، ان باتوں میں غور و فکر انسان پر یہ راز کھولتا ہے کہ اس کی تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا نظام خود اس کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خالق کائنات نے اپنی حکمت بالغہ سے بنایا اور چلایا ہے کسی دل میں ڈال دیا کہ زمین میں کھیتی باڑی کا کام کرے، کسی کے دل میں یہ پیدا کر دیا کہ وہ لکڑی اور نجاری کا کام کرے۔

کسی کے دل میں لوہار کے کام کی رغبت ڈال دی، کسی کو محنت مزدوری کرنے ہی میں راضی کر دیا، کسی کو تجارت و صنعت کی طرف راغب کر کے انسانی ضروریات کے بازار لگا دیئے۔ نہ کوئی حکومت اس کا نظم قانون سے کر سکتی تھی نہ کوئی فرد، اس لئے اس غور و فکر کا لازمی نتیجہ الی ربک الرجعیٰ ہے یعنی انجام کار سب چیزوں کا حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے تابع ہونا مشاہدہ میں آجاتا ہے۔ (معارف)

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّى: کیا آپ نے اس کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔ ہمارے بندہ کو جب وہ نماز پڑھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: کیا میں تمہارے سامنے (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ خاک آلود کروں؟ لوگوں نے کہا: ہاں اس نے کہا: میں قسم کھاتا ہوں

کہ اگر میں نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو میں ان کی گردن کو اپنے پیروں سے روندوں گا۔

اسے بتایا گیا کہ دیکھو وہ سامنے نماز پڑھ رہے ہیں، وہ آپ کی گردن کو روندنے کے لئے آگے بڑھا، پھر فوراً الٹے پاؤں لوٹ آیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کر رہا تھا، لوگوں نے اس سے پوچھا: اے ابوالحکم! کیا ہوا، کیوں واپس آ گئے؟ اس نے کہا: میرے اور ان کے درمیان آگ کی خندق ہے اور اس میں ہولناک چیزیں ہیں، پھر نبی ﷺ نے فرمایا: اگر یہ ذرا بھی میرے قریب آتا تو فرشتے اس پر جھپٹ پڑتے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں۔

عَبْداً إِذا صَلَّى: کیا آپ نے اس کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔ ہمارے بندہ کو جب وہ نماز پڑھے۔

بندے سے مراد خود رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس طریقے سے حضور ﷺ کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، مثلاً **سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی** (اسراء) پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ** (الکہف ۱) تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی **وَّاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا** (الجن ۱۹) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسول محمد ﷺ کا ذکر فرماتا ہے۔

أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَى ○ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى: اے مخاطب یہ بتادے کہ اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو، یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو (تو کیا اسے روکنا گمراہی نہیں؟)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کافر سے خطاب فرمایا ہے کہ اے کافر! یہ بتا کر نبی ﷺ جو نماز پڑھ رہے ہیں ان کا نماز پڑھنا عین ہدایت ہے اور وہ جو دین کی تبلیغ کر رہے ہیں اور لوگوں کو عذاب سے ڈرا رہے ہیں اور خوف خدا کا حکم دے رہے ہیں اور تو ان کو ان نیک کاموں سے ڈرا رہا ہے۔

مفسر قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ان آیات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ابو جہل نے دونوں چیزوں کی روک کی تھی، نماز پڑھنے کی بھی اور دعوتِ توحید کی بھی لیکن پہلے جملہ میں صرف نہی صلوٰۃ کا ذکر کیا (ممانعت توحید کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ اس جگہ دونوں کا ذکر کرنا تھا، اس کے علاوہ وہ دعوت بالفعل تھی اور یہ بھی احتمال ہے کہ نہی العبد سے مراد عام ممانعت ہو، نماز کی ممانعت ہو یا کسی دوسری چیز کی اور رسول اللہ ﷺ کے عمومی احوال (اس وقت) انہی دونوں چیزوں پر محصور تھے۔

تکمیل نفس کے لیے عبادت اور دوسروں کی تکمیل کے لیے دعوت توحید (پس نہی عبد کا انحصار صرف ممانعت نماز میں نہ ہو گا بلکہ دعوتِ توحید کی ممانعت بھی اسی نہی میں داخل ہو گی) بہر حال جملہ ان کان شرط ہے اور جزا محذوف ہے، سیاق کا تقاضا یہی ہے مثلاً اگر رسول اللہ ﷺ کا ہدایت پر ہونا اور دعوت توحید دینا حق ہے تو پھر ابو جہل اس کی ممانعت کیسے کرتا ہے، یا یہ ممانعت کرنے والا ہلاک ہو جائے گا، یا یہ بندہ کامیاب ہو جائے گا' وغیرہ۔ (تفسیر مظہری)

أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى: عربی میں لفظ أَرَأَيْتَ محاورہ کے اعتبار سے اَخبرنی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں تین جگہ لفظ أَرَأَيْتَ وارد ہوا ہے جو ہر صاحب فہم و بصیرت کو خطاب ہے، ہر سمجھنے والا بتائے کہ جو شخص نماز پڑھنے والے کو نماز سے روکتا ہے اور یہ نماز پڑھنے والا خود ہدایت پر رہتے ہوئے دوسروں کو تقویٰ کا حکم دیتا ہے اس کو نماز سے روکنے والے کا عمل کیسا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ جو شخص جھٹلانے والا اور اعراض کرنے والا ہے پھر اوپر سے نماز پڑھنے والے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے اس کا انجام سوچ لیا جائے پھر اس انجام کو اجمالی طور پر یوں بیان فرمایا کہ **أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ:** کیا اسے معلوم نہیں ہے بے شک اللہ دیکھتا ہے؟

جب اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے نماز پڑھنے والے اور نماز سے روکنے والے کی حالت کا علم ہے تو وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدل دے دے گا، نمازی کو نماز کا ثواب ملے گا اور نماز سے روکنے والے کو روکنے کی سزا ملے گی اور عذاب ہو گا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے سے روکا تو آپ ﷺ نے ابو جہل کو جھڑک دیا، اس پر ابو جہل نے کہا (کہ مجھے جھڑکتے ہو) میں پوری وادی کو گھوڑوں سے اور فوجی لوگوں سے بھر دوں گا اس پر آیات ذیل نازل ہوئیں۔ (تفسیر انوار البیان)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں خطاب کسے ہے؟ اس میں دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہاں ارأیت میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے، اور یہ اس لیے کہ جو دلائل اس سورت کے شروع میں ذکر کیے گئے وہ واضح اور ظاہر ہیں، ہر کوئی اپنی عقل کی بداہت کے ساتھ انہیں جانتا ہے۔ کہ اپنے مولا اور آقا کی خدمت بجالانے والے بندے کو اس خدمت سے روکنا باطل ہے اور واضح بے وقوفی ہے، اس لیے ہر وہ شخص جو ان دلائل کو جھٹلائے گا اور اپنے مولا کی خدمت سے روگردانی کرے گا بلکہ دوسروں کو بھی اپنے مولا کی خدمت سے روکے گا تو وہ اپنی عقل سلیم سے جان لے گا کہ یہ باطل ہے۔

اور یہ کام وہ عناد کی بناء پر کر رہا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ اے محمد! اگر یہ کافر ان واضح دلائل کو جھٹلاتا ہے اور اپنے خالق کی خدمت سے منہ پھیرتا ہے تو کیا وہ اپنی عقل سے نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے یہ قبیح اور برے اعمال دیکھ رہا ہے اور اللہ انہیں جانتا ہے، کیا وہ اسے ان اعمال قبیحہ سے روکتا نہیں ہے؟ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خطاب کافر سے ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ: خبر دار! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم (اسے) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ اس پیشانی کے بال جو جھوٹی ہے، گنہگار ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے دشمن اور گستاخ کو خبر دار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بے مقصد نہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ اس کی دنیا میں ٹھاٹھ باٹھ، کروفر اور رعب و دبدبہ ہے، شان و شوکت ہے اس کے مراتب دنیویہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے چشم پوشی نہیں کی جائے گی، اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔

اگر وہ اپنی سرکشی اور تمرد سے باز نہ آیا تو ہم اس کی عزت ذلت میں بدل دیں گے، اس کی پیشانی کے بالوں سے ہم اسے کھینچیں گے، پیشانی کے بالوں سے کھینچنا اسے خوب ذلیل و رسوا کرنا ہے، اس لیے کہ جسم انسانی کے تمام اعضاء میں زیادہ محترم جگہ یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تعظیم و توقیر کے مواقع

پر سلاطین واہل اقتدار اور صاحبان ثروت کے سروں کی قسم کھانے کا رواج ہے، جب یہ اپنی شاطرانہ، شیطانی چالوں اور ہفوات سے باز نہیں آئے گا تو ہم اسے انتہائی ذلیل کریں گے، اس کی پیشانی سے اسے کھینچیں گے۔

اگرچہ یہ آیت ابو جہل لعین کے بارے میں اتری، لیکن اس میں ان تمام لوگوں کے لیے عبرت وموعظت کا سامان ہے جو اللہ کی نافرمانی میں انتہاؤں کو چھو رہے ہیں، اس میں ان تمام لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرا جارہا ہے جو اوامر خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے، ماننے کی بجائے سرکشی اور تمرد سے کام لیتے ہیں، رحمت دوعالم ﷺ کی نافرمانی اور استہزا کرکے انہیں اذیت پہنچاتے ہیں۔

آیت میں لَنَسْفَعاً کا لفظ ہے سفع کا معنی ہے کسی چیز کو پکڑ کر سختی سے کھینچنا اور ناصیہ کا معنی ہے پیشانی کے اوپر سر کے بال، اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اسے اس کی پیشانی سے ضرور بہ ضرور پکڑیں گے اور اسے کھینچ کر جہنم کی طرف لے جائیں گے، سورۃ الرحمان کی آیت ۴۲ میں نواصی (پیشانیوں) اور قدموں سے پکڑنے کا ذکر موجود ہے، السفع کا ایک معنٰی منہ پر طمانچے رسید کرنا ہے، السفع کا ایک معنٰی چہرے کو کالک پھیرنا ہے، جب کسی آدمی کے چہرے کو آگ نے جھلسادیا ہو، آگ کی لپٹوں نے اس کے چہرے کی رنگت معمولی سی اڑادی ہو تو اس وقت یہ لفظ بولا جاتا ہے سَفَعَتْهُ النَّارُ، عربی میں السفع ان تین پتھروں کو بھی کہا جاتا ہے جن میں آگ جلا کر اوپر ہنڈیا رکھی جاتی ہے، ان کے کالے پن کی وجہ سے انہیں السفع کہا جاتا ہے، السفعۃ عربی میں دو رخساروں کے بیچ میں موجود سیاہی کو کہا جاتا ہے، چہرہ کالا کرنا ذلیل کرنے اور اہانت کرنے کی علامت ہوتا ہے، اس کا ایک معنٰی یہ ہے کہ ہم اسے ہر صورت میں ذلیل کریں گے۔

ابو جہل کی سیاہ اعمالیوں اور بد بختیوں پر قیامت کے دن اسے کون اس طرح رسوا اور ذلیل کرے گا، یہاں لفظ اس طرح استعمال فرمایا گیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اسے ذلیل ورسوا کریں گے، اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اسے جہنم میں پھینکیں گے۔

ابو جہل کے ساتھ یہ عبرت ناک سلوک دنیا میں بھی ہوا اور آخرت میں بھی ہو گا، دنیا میں ابو جہل نے کہا تھا کہ إِنْ رَأَيْتُهُ يُصَلِّي لَأَطَأَنَّ عُنُقَهُ، اگر میں نے محمد ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا تو میں ان کی گردن لتاڑوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی، اور جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ یہ سورت ابو جہل کے سامنے تلاوت کیجیے اور اس کے آخر میں سجدہ ریز ہو جایئے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا، جب آپ ﷺ سجدہ میں گئے تو ابو جہل آپ ﷺ کی گردن لتاڑنے کے لیے ادھر کو آیا، جب آپ ﷺ کے قریب پہنچا تو واپس پلٹ گیا، تو اس سے پوچھا گیا کہ تجھے کیا ہوا؟ اس پر ابو جہل نے کہا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک آگ کی خندق تھی اور پروں کی آواز معلوم ہوتی تھی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا بخدا اگر وہ میرے ہاتھ لگاتا تو اس کو فرشتے اچک لے جاتے اور تم سب کے سامنے پرزے پرزے کر ڈالتے (رواہ مسلم واحمد ونسائی وغیرہم) یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت جبریل اور میکائیل دونوں فرشتے آپ ﷺ کے دونوں کاندھوں پر شیر کی شکل میں تھے۔ (تفسیر کبیر)

دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد یوم بدر ہو، کہ اس میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہو کہ ابو جہل کی پیشانی پکڑ کر اسے قتل گاہ کی طرف کھینچیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یوم بدر میں اسے عبرت کا نشان بنایا کہ دو چھوٹے بچوں معاذ اور معوذ نے اسے زمین پر گرایا، اس پر وار کیا، عبد اللہ بن مسعود اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور اس کی اکڑی ہوئی سرکش گردن کاٹ کر عبرت کا نشان بنا دیا۔

یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب سورت الرحمان نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس سورت کو قریش کے سرداروں کے سامنے پڑھے؟ تو صحابہ کرام کو قریش کی اذیت کے ڈر کی وجہ سے یہ بات بوجھ محسوس ہوئی، اتنے میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے یا رسول اللہ! میں ان کے سامنے اس سورت کی تلاوت کروں گا، نبی کریم ﷺ نے انہیں بٹھا دیا اور پھر پوچھا کہ ان کے سامنے کون اس سورت کی تلاوت کرے گا؟ اب کی بار بھی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اٹھے، پھر تیسری بار آپ ﷺ نے پوچھا تو تیسری بار بھی عبد اللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی اٹھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قریش سرداروں کے سامنے سورۃ رحمان تلاوت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کمزوری اور چھوٹے سراپا کے باعث انہیں چھوڑ رہے تھے، پھر جب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان کی طرف پہنچ گئے تو انہیں خانہ کعبہ کے گرد اکٹھے دیکھ کر سورت کی تلاوت شروع کر دی، تلاوت سن کر ابوجہل نے اٹھ کر انہیں طمانچہ مار دیا، جس سے ان کا کان چر گیا اور وہ خون آلود ہو گئے، پھر وہ پلٹا تو عبداللہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھا تو دل میں رقت طاری ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غم زدہ ہو کر سر جھکا لیا، اتنے میں جبریل ہنستے ہوئے اور خوشخبری دیتے ہوئے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جبریل! آپ ہنس رہے ہیں اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رو رہے ہیں، جبریل نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب جان لیں گے۔

پھر جب مسلمان یوم بدر میں غالب ہوئے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ بات تلاش کر رہے تھے کہ انہیں مجاہدین میں وافر حصہ ملے، چنانچہ انہوں نے مقتولین بدر کو دیکھنا شروع کر دیا، اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ابوجہل میدان بدر میں گرا پڑا ہے، عبداللہ گھبرا گئے کہ کہیں اس میں ابھی قوت موجود ہو اور وہ کوئی نقصان نہ پہنچا دے چنانچہ انہوں نے دور سے ہی تاک کر تیر اس کے نتھنے میں پیوست کر دیا۔

جب انہیں معلوم ہو گیا کہ اب وہ عاجز ہو چکا ہے تو کسی حیلے سے اس کے سینے پر چڑھ گئے، جب ابوجہل نے انہیں دیکھا تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اے بکریاں چرانے والے تو تو مشکل مقام پر چڑھ گیا ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اَلْإِسْلَامُ يَعْلُو وَلَا يُعْلَى عَلَيْهِ، اسلام بلند ہوتا ہے اور اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی۔ پھر ابوجہل نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اپنے صاحب (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس سے زیادہ مبغوض میری زندگانی میں مجھے کوئی نہیں ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی شخص میری حالت موت میں زیادہ مبغوض ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جب ابو جہل کا یہ پیغام سنا تو فرمانے لگے فِرْعَوْنِي أَشَدُّ مِنْ فِرْعَوْنِ مُوسَى فَإِنَّهُ قَالَ آمَنْتُ وَهُوَ قَدْ زَادَ عُتُوًّا، میرا فرعون موسیٰ علیہ السلام کے فرعون سے زیادہ سخت ہے، کیونکہ اس نے تو کہا تھا میں ایمان لے آیا ہوں جب کہ اس کی سرکشی بڑھ گئی ہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا اقْطَعْ رَأْسِي بِسَيْفِي هَذَا لِأَنَّهُ أَحَدُّ وَأَقْطَعُ، میرا سر میری اس تلوار سے کاٹنا کیونکہ یہ زیادہ دھاری دار اور زیادہ کاٹ دار ہے۔ پھر جب آپ نے اس کا سر کاٹ ڈالا تو بوجہ کمزوری اسے اٹھا نہیں سکتے تھے، حکیم ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہو سکتا ہے کہ انہیں اسی لیے کمزور پیدا کیا ہو تا کہ وہ اسے اٹھا نہ سکیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابو جہل ایک کتا تھا اور کتے کو اٹھایا نہیں گھسیٹا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے خانہ کعبہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو طمانچہ مار کر ان کا کان چیر دیا تھا، تو اب کان کے بدلے کان کا قصاص لیا جانا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہم اس کی پیشانی سے کھینچیں گے تو یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس سر کو آگے سے پکڑ کر کھینچا جائے، پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب طاقت نہیں رکھتے تھے تو انہوں نے اس کا کان چیر کر اس میں دھاگہ ڈالا اور اسے گھسیٹ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حال میں لے گئے کہ جبریل امین ان کے سامنے ہنس رہے تھے، اور فرما رہے تھے يَا مُحَمَّدُ أُذُنٌ بِأُذُنٍ لٰكِنِ الرَّأْسُ هَاهُنَا مَعَ الْأُذُنِ اے محمد! کان بدلے کان کے ہے، لیکن یہاں کان کے ساتھ سر بھی ہے۔

ناصیہ پیشانی کو کہا جاتا ہے، یہاں پیشانی کے بالوں کی جگہ صرف پیشانی کا ذکر فرمایا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں ناصیہ ذکر کر کے چہرے اور سر سے کنایہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ابو جہل اپنی پیشانی کے بالوں کی کنگھی پٹی کرنے اور اس پر خوشبوئیں ملنے کا زیادہ اہتمام کرتا تھا، بعض اوقات وہ انہیں کالا کرنے کا بھی اہتمام کرتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پیشانی کو اس کے چہرے سمیت کالا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں ناصیہ کو حرف تعریف کے ساتھ معرف باللام لاکر یہ بات واضح کر دی کہ ایک وہ پیشانی ہے جس کی ذات تمہارے ہاں مشہور و معروف ہے جب کہ اس کی صفات تمہارے ہاں مجہول ہیں، وہ کون سی پیشانی ہے، وہ قول کے اعتبار سے جھوٹی اور فعل کے لحاظ سے خطاکار ہے، اس پیشانی کو کذب، دروغ اور جھوٹ کے ساتھ کیوں موصوف کیا گیا؟

اس لیے کہ اس پیشانی والا شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا تھا کہ اس نے حضرت محمد ﷺ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا، اس پیشانی والا شخص رسول کریم ﷺ پر جھوٹ باندھتا تھا کہ وہ جادوگر ہیں، یا نعوذ باللہ وہ کذاب اور دروغ گو ہیں، یا وہ آپ ﷺ کے بارے میں کہتا تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی نہیں ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کو جھٹلاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں اس وادی میں وہ شخص ہوں جس کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں، اس پیشانی کو ناصیہ خاطئہ کے ساتھ اس لیے موصوف فرمایا گیا کیونکہ اس پیشانی والا شخص اللہ کے سامنے سرکشی کرنے والا تھا، اس خاطی کی سزا یہ ہے کہ اسے جہنم میں ڈالا جائے گا، اسے کھینچا اور گھسیٹا جائے گا، اسے وہ کھانے دوزخ میں کھلائے جائیں گے جو خطاکاروں کو کھلائے جائیں گے۔

خاطی اور مخطی دونوں اسم فاعل ہیں مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خاطی اسے کہتے ہیں جو جان بوجھ کر ارتکاب گناہ کرے اور مخطی اسے کہتے ہیں جو جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب نہ کرے، اسی لیے قرآن کریم میں خاطی کے لیے جس عذاب کا ذکر کیا گیا وہ سخت اور شدید عذاب ہے، اور وہ غسلین کھانا ہے، غسلین جہنمیوں کی وہ پیپ اور کچ لہو ہے جو حرارت و گرمی کی شدت کے باعث ان کے جسموں سے گوشت اور چربی کے جلنے سے نکلے گا، اس غسلین کو خطاکار ہی کھائیں گے، جب کہ مخطی کے لیے درگزر کا وعدہ ہے تو یہاں ناصیہ کو خاطئہ کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے، جس طرح قرآن کریم میں چہروں کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ: اسے چاہیے کہ اپنے ہم مجلس مددگاروں کو بلائے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم بھی عن قریب دوزخ کے مقرر کردہ فرشتوں کو بلائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابو جہل نبی ﷺ کے پاس سے گزرا، اس وقت آپ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، ابو جہل کہنے لگا: یا محمد ﷺ کیا میں نے آپ کو نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ نبی ﷺ نے اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا تو ابو جہل کہنے لگا، يَا مُحَمَّدُ بِمَنْ تُهَدِّدُنِي وَإِنِّي لَأَكْثَرُ هَذَا الْوَادِي نَادِيًا، اے محمد! آپ مجھے کس چیز سے ڈرا رہے ہیں؟ اللہ کی قسم! اس وادی کے اکثر لوگ میری مجلس میں بیٹھنے والے ہیں، تب اللہ سبحانہ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ تم اپنی مجلس کے مددگاروں کو بلاؤ، ہم دوزخ کے فرشتوں کو بلائیں گے۔

نادیہ، النادی اور ندوہ تین الفاظ قریب المعنیٰ ہیں، النادی کا معنیٰ ہے جمع کرنے والا، وہ مجلس جس میں لوگ مشورہ یا دیگر اغراض کے لیے جمع ہوں یا جمع ہوتے ہوں، ہم مشرب لوگوں کی بیٹھک یا مجلس، بزم، محفل، کلب، عربی میں نادی الرجل کہتے ہیں آدمی کے اہل خانہ کو، کنبہ کے لوگوں کو، قرآن کریم میں اس مقام پر ابو جہل سے کہا گیا کہ وہ اپنے اہل خانہ کو بلالے، اپنے جتھے کو بلالے، نادیہ کی جمع اندیۃ اور نواد آتی ہے، الندوہ ایک دفعہ کا اجتماع، مجلس و محفل، کسی خاص مقصد اور مشورہ کے لیے جمع ہونے والے لوگ، دارالندوہ کا معنیٰ ہے دارالمشورہ، زمانہ جاہلیت میں مکہ میں قریش کا دارالمشورہ اسی نام سے موسوم تھا جسے قصی بن کلاب نے بنایا تھا، بعد میں اس کے لڑکے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خرید کر دارالامارۃ (گورنر ہاؤس) بنادیا تھا۔

الزَّبَانِيَةَ: الزِّبْنِيَةُ جنوں اور انسانوں میں سے ہر سرکش کو کہا جاتا ہے، اس کا ایک معنیٰ شدید اور سخت بھی ہے، الزبانیہ عربوں کے ہاں پولیس کو کہتے ہیں، سپاہی، ان الفاظ میں دھکیلنا، دور کرنا اور دفع کرنا کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

اخفش کہتے ہیں کہ الزبانیہ کی واحد الزبانی ہے، بعض کہتے ہیں کہ الزبانیہ ایسی جمع ہے جس کی واحد نہیں ہے، جس طرح ابابیل اور عبادید کی واحد نہیں ہے، الزبانیہ سے مراد عذاب کے لیے مخصوص فرشتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فرشتوں میں بڑی قوت اور طاقت رکھی گئی ہے، حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الزبانیہ جہنم کے داروغے ہیں، جن کے پاؤں زمین میں ہیں اور سر آسمان میں۔

الزبانیہ سخت اور شدید فرشتے، دوزخ کے فرشتوں کو الزبانیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو دوزخ کی طرف دھکیلیں گے۔

اس آیت میں ابو جہل کی ڈینگ اور لاف زنی کا جواب دیا گیا ہے کہ تجھے اپنے لاء ولشکر، اپنے جھتے اور کنبے پر بڑا فخر وناز ہے تو تو انہیں جمع کرلے، بلالے اور ہمارے حبیب حضرت محمد ﷺ کے مقابلے میں لے آ، اگر وہ ایسا کر گزرے تو پھر ہم بھی اپنے زبانیہ فرشتوں کو حاضر کیے دیتے ہیں، جن کا مقابلہ کرنے کی ان کے جتھوں اور لشکروں کے پاس طاقت وقوت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر وہ اپنے لاء ولشکر اور نادیہ کو بلاتا تو زبانیہ فرشتے اسے اس کی آنکھوں کے سامنے پکڑ لیتے، بعض کہتے ہیں کہ یہاں اللہ کی طرف سے اسے خبردار کیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں کتے کی طرح گھسیٹا جائے گا اور میدانِ بدر میں اس کے ساتھ ایسا ہوا بھی تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ زبانیہ فرشتے اسے آخرت میں دوزخ کی طرف گھسیٹیں گے۔

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ: ہرگز نہیں، آپ اس کی کوئی بات نہ مانیں، آپ سجدہ کریں اور زیادہ قریب ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابو جہل جو آپ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، آپ ہرگز اس کی کوئی بات نہ مانیں، آپ اللہ کے لئے نماز پڑھتے رہیں اور اس کی اطاعت اور عبادت کرکے اس کا رب حاصل کریں، ایک قول یہ ہے کہ جب آپ سجدہ کریں تو اللہ سے دعا کرکے اس کا قرب حاصل کریں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ، وَأَحَبُّهُ إِلَيْهِ، جَبْهَتُهُ فِي الْأَرْضِ سَاجِدًا لِلَّهِ**، بندہ کا اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ قرب اور سب سے زیادہ محبت اس وقت ہوتی ہے، جب اس کی پیشانی زمین پر اللہ کے لئے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ (مسلم)

چونکہ سجدہ کی حالت عبودیت اور ذلت کی انتہا ہے جب کہ ساری کی ساری عزتوں، بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس کی عزتوں، رفعتوں، عظمتوں اور بلندیوں کی کوئی انتہاء نہیں ہے، وہ لامتناہی ہیں، اس لیے اے انسان! تو جتنا اللہ کی اس صفت سے دور ہوگا اتنا ہی اس کی جنت کے

قریب ہو گا، اور اس کے گھر میں اس کے جوار رحمت کے قریب ہو گا، نبی کریم نے ارشاد فرمایا، أَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ. وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَإِنَّهُ قَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ، جہاں تک کہ رکوع کا تعلق ہے اس میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو، جہاں تک سجدے کا تعلق ہے تو دعا میں کوشش کرو کیونکہ وہ اس لائق ہے کہ وہ تمہارے حق میں قبول کی جائے۔

ایک شاعر نے اس کی کیا خوب ترجمانی کی ہے وہ کہتا ہے

وَإِذَا تَذَلَّلَتِ الرِّقَابُ تَوَاضُعًا ... مِنَّا إِلَيْكَ فَعِزُّهَا فِي ذُلِّهَا

جب ہماری گردنیں تیری بارگاہ میں تواضع کرتے ہوئے جھک جائیں تو ان کی عزت ان کی عاجزی میں ہے۔

زید بن اسلم نے کہا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کیجئے، اے ابو جہل! تو آگ کے قریب ہو جا۔ واسجد یہ سجود سے مشتق ہے، یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد نماز میں سجدہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سورت میں تلاوت کا سجدہ ہو۔

ابن عربی فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد نماز کا سجدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى عَبْدًا إِذَا صَلَّى ۔ تا۔ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، اگر ایسا نہ ہوتا تو امام مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث سے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت نہ ہوتا انہوں نے کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اذا السماء انشقت اور اقرا باسم ربک الذی خلق کے ساتھ دو سجدے کیے یہ اس امر پر نص ہے کہ مراد سجدہ تلاوت ہے۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے روایت ہے کہ عَزَائِمُ السُّجُودِ أَرْبَعٌ الٓمٓ وحٰمٓ تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ والنَّجْمُ واقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ، لازمی سجدہ تلاوت چار ہیں، الم، حم تنزیل من الرحمن الرحیم اور اقرا باسم ربک۔

ابن عربی فرماتے ہیں کہ یہ اگر صحیح ہے تو اس پر سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ بھی لازم ہو گا اگرچہ وہ

رکوع کے ساتھ ملا ہوا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہو گا رکوع کے موقع پر رکوع کرو اور سجدہ کے موقع پر سجدہ کرو۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ اس سورت کے اختتام پر خاص طور پر خود سجدہ کیا کرتے تھے ابن وہب اس سجدہ کو لازمی سجدہ خیال کرتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اسے لکھو، تو انہوں نے تختی، قلم اور سیاہی کی دوات لی پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اسے لکھا، جب كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ پر پہنچے تو تختی، قلم اور دوات نے سجدہ کیا اور زبان حال سے دعا کی کہ اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ بِهٖ ذِكْرًا، اَللّٰهُمَّ احْطُطْ بِهٖ وِزْرًا، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ بِهٖ ذَنْبًا اے اللہ! اس کے ساتھ ذکر کو بلند کر، اے اللہ! اس کے ساتھ بوجھ اتار دے، اے اللہ! اس کے ذریعے گناہ بخش دے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اسے تحریر میں لانے کے بعد سجدہ کیا اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی اطلاع دی، جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سجدہ کیا، فرماتے ہیں سَجَدْتُ، وَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَجَدَ میں نے سجدہ کیا اور رسول اللہ کو بتایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سجدہ کیا۔ (قرطبی)

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزارا کرتا تھا ایک مرتبہ (نماز تہجد کے لیے) میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وضو کا پانی اور دوسری ضرورت کی چیزیں حاضر کر دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو میں نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ جنت میں آپ کے ساتھ رہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے علاوہ اور کچھ؟ میں نے کہا کہ میرا تو یہی مطلوب ہے آپ نے فرمایا اچھا تو اپنے نفس کے مقابلہ میں میری مدد کرو خوب سجدے کیا کرو۔ (مسلم)

حو دمل ال حو دمل ل آج سورۃ العلق کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی۔

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (جامعہ رشیدیہ منساواں لاہور

۳۰ اپریل ۲۰۲۰ء ۶ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروز جمعرات ۴ بجے سہ پہر

حروف بینی: ۱۴ نومبر ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ، رات ۱۲ بجے

القدر

قرآن، شب قدر، نزول ملائکہ

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ {۱} وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ {۲} لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ {۳} تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ {۴} سَلٰمٌ ۣ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ {۵} القدر

جواب ترجمہ: بیشک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا چیز ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کی اجازت سے ہر کام کے لیے اترتے ہیں۔ وہ رات سراپا سلامتی ہے فجر کے طلوع ہونے تک۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ: اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ اس نے یہ قرآن شب قدر میں نازل فرمایا، اسی کو دوسرے مقام پر شب مبارک بھی کہا گیا ہے، جیسے سورۃ الدخان میں ہے {إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ} (الدُّخَانِ: ۳) بے شک ہم نے اس قرآن کو شب مبارک میں نازل کیا ہے۔

جس شب کو شب مبارک کہا گیا یہی شب قدر ہے، یہ شب رمضان کے مہینے میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ} (الْبَقَرَةِ: ۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا کے بیت العزت کی طرف ایک ہی بار اتارا، پھر حسب وقائع واحوال تیئس سالوں میں رسول کریم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر کیا جو ایک ہزار مہینہ تک اللہ کی راہ میں یعنی جہاد میں ہتھیار بند رہا مسلمانوں کو یہ سن کر تعجب ہوا تو اللہ عزوجل نے یہ سورت اتاری کہ ایک شب قدر کی عبادت اس شخص کی ایک ہزار مہینے کی عبادت سے افضل ہے۔ (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ

كَانَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ رَجُلٌ يَقُومُ اللَّيْلَ حَتَّى يُصْبِحَ، ثُمَّ يُجَاهِدُ الْعَدُوَّ بِالنَّهَارِ حَتَّى يُمْسِيَ، فَفَعَلَ ذَلِكَ أَلْفَ شَهْرٍ (ابن جریر، تفسیر ابن کثیر)

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو رات کو قیام کرتا تھا صبح تک اور دن میں دشمنانِ دین سے جہاد کرتا تھا شام تک، ایک ہزار مہینے تک یہی کرتا رہا، اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی کہ اس امت کے کسی شخص کا صرف شب قدر کا قیام اس عابد کی ایک ہزار مہینے کی اس عبادت سے افضل ہے۔

حضرت علی بن عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

ذَكَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا أَرْبَعَةً مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، عَبَدُوا اللهَ ثَمَانِينَ عَامًا، لَمْ يَعْصُوهُ طَرْفَةَ عَيْنٍ: فَذَكَرَ أَيُّوبَ، وَزَكَرِيَّا، وحِزْقِيل بْنَ الْعَجُوزِ، وَيُوشَعَ بْنَ نُونٍ قَالَ: فَعَجِبَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ذَالِكَ، فَأَتَاهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، عَجِبَتْ أُمَّتُكَ مِنْ عِبَادَةِ هٰؤُلَآءِ النَّفَرِ ثَمَانِينَ سَنَةً، لَمْ يَعْصُوهُ طَرْفَةَ عَيْنٍ، فَقَدْ أَنْزَلَ اللهُ خَيْرًا مِنْ ذَالِكَ. (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے چار عابدوں کا ذکر کیا جنہوں نے اسی سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی تھی ان میں حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت حزقیل بن عجوز، حضرت یوشع بن نون علیہم السلام کا ذکر کیا، اصحاب رسول ﷺ کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا، آپ ﷺ کے پاس حضرت جبریل تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ اے محمد! ﷺ آپ کی امت نے اس جماعت کی اس عبادت پر تعجب کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی افضل

چیز آپ پر نازل فرمائی، پھر سورۃ القدر کی یہ آیات تلاوت فرمائیں اور فرمایا کہ یہ افضل ہے اس سے جن پر آپ اور آپ کی امت نے تعجب ظاہر کیا تھا پس آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بے حد خوش ہوئے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک حضرت مجاہد رحمہ اللہ کی یہ بات پہنچی کہ

لیلۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِنْ أَلْفِ شَھْرٍ. قَالَ: عَمَلُھَا، صِیَامُھَا وَقِیَامُھَا خَیْرٌ مِنْ أَلْفِ شَھْرٍ،

شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے کا مطلب یہ ہے کہ اس رات کا نیک عمل، اس کا روزہ، اس کی نماز ایک ہزار مہینوں کے روزے اور نماز سے افضل ہے جن میں شب قدر نہ ہو۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مختلف روایات میں مختلف اعمال کے فضائل بیان فرمانے کے بعد کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ مراد ایک ہزار مہینے سے وہ مہینے ہیں جن میں لیلۃ القدر نہ آئے جیسے ایک ہزار راتوں سے مراد وہ راتیں ہیں جن میں کوئی رات اس عبادت کی نہ ہو اور جیسے جمعہ کی طرف جانے والے کو ایک سال کی نیکیاں یعنی وہ سال جس میں جمعہ نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت عمرو بن قیس ملائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عَمَلٌ فِیھَا خَیْرٌ مِنْ عَمَلِ أَلْفِ شَھْرٍ، اس رات کا عمل ایک ہزار مہینے کے عمل سے بہتر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رمضان آگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

قد جَاءَکُمْ شَھْرُ رَمَضَانَ، شَھْرٌ مُّبَارَکٌ، افْتَرَضَ اللہُ عَلَیْکُمْ صِیَامَہُ، تُفْتَحُ فِیْہِ أَبْوَابُ الْجَنَّۃِ، وَتُغْلَقُ فِیْہِ أَبْوَابُ الْجَحِیْمِ، وَتُغَلُّ فِیْہِ الشَّیَاطِیْنُ، فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَھْرٍ، مَنْ حُرِمَ خَیْرَھَا فَقَدْ حُرِمَ (مسند احمد)

لوگو! تم پر رمضان کا مہینہ آگیا یہ بابرکت مہینہ آگیا اس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کیے ہیں اس میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں شیاطین قید کر لیے جاتے ہیں اس میں ایک رات ہے جو ایک ہزار مہینے سے افضل ہے اس کی خیر و بھلائی سے محروم رہنے والا شخص حقیقی بد قسمت ہے اور محروم ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (بخاری) جو شخص لیلۃ القدر کا قیام ایمانداری اور نیک نیتی سے کرے اس کے تمام سابقہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

اس رات میں قرآن کریم اتار کر اس رات کی عظمت و شرف کو چار چاند لگائے گئے ہیں، یہ رات نزول قرآن کی وجہ سے باقی راتوں سے ممتاز قرار پائی ہے، یہ مہینہ نزول قرآن کی وجہ سے اعزاز وافتخار والا مہینہ بن گیا، قرآن کلام اللہ ہے، بادشاہ کا کلام ہے، بادشاہ کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوا کرتا ہے، جس رات میں قرآن اترا وہ ساری راتوں سے افضل واشرف رات قرار پائی، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرماتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں اس رات کی قدر کیا ہے؟ اس رات کا شرف کیا ہے؟ اس رات کا اعزاز کیا ہے؟ یہ رات شب مبارک ہے، اس کی فضیلت ان ہزار مہینوں سے بہتر ہے جن میں شب قدر نہ ہو۔

قدر کا مفہوم و مطلب: اس رات کو شب قدر اس لئے فرمایا ہے کہ قدر کا معنی تقدیر ہے۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔ (الفرقان: ۲) اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا مناسب اندازہ کیا اس رات میں اللہ تعالیٰ آئندہ سال کے لئے جو امور چاہتا ہے وہ مقدر فرما دیتا ہے کہ اس سال میں کتنے لوگوں پر موت آئے گی، کتنے لوگ پیدا ہوں گے اور لوگوں کو کتنا رزق دیا جائے گا۔ پھر یہ امور اس جہان کی تدبیر کرنے والے فرشتوں کو سونپ دیئے جاتے ہیں اور وہ چار فرشتے ہیں: اسرافیل، میکائیل، عزرائیل اور جبریل علیہم السلام

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوح محفوظ سے لکھ دیا جاتا ہے کہ اس سال کتنا رزق دیا جائے گا اور کتنی بارشیں ہوں گی، کتنے لوگ زندہ رہیں گے اور کتنے مر جائیں گے؟ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: لیلۃ القدر میں بیت اللہ کا حج کرنے والوں کے نام اور ان کے آباء کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کسی نام کی کمی کی جاتی ہے اور نہ کسی نام کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ

أَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقْضِي الْأَقْضِيَةَ فِي لَيْلَةِ نِصْفِ شَعْبَانَ، وَيُسَلِّمُهَا إِلَى أَرْبَابِهَا فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات میں مستقبل میں ہونے والے امور کے متعلق فیصلے فرماتا ہے اور ان فیصلوں کو ان فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے جو ان کو نافذ کرتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اس رات کو لیلۃ القدر فرمانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قدر کا معنیٰ عظمت اور شرف ہے، وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (الانعام ۹) انہوں نے اللہ کی ایسی قدر نہیں کی جس طرح قدر کرنا چاہیے تھی، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کی بہت قدر و منزلت ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس رات میں عبادت کرنے کی بہت قدر و منزلت ہے اور اس کا بہت زیادہ اجر و ثواب ہے، حضرت ابو وراق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو جب وہ اس رات کو عبادت کرتا ہے تو وہ بہت قدر اور عظمت والا ہو جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس رات کو شب قدر اس لئے فرمایا ہے کہ اس رات میں بہت قدر و منزلت والی کتاب، بہت عظیم الشان رسول پر، بہت عظمت والی امت کے لئے نازل کی گئی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس رات کو شب قدر اس لئے فرمایا ہے کہ اس رات میں بہت قدر و منزلت والے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ بہت خیر اور برکت اور مغفرت نازل فرماتا ہے، سہل نے کہا: اس رات کو شب قدر فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے رحمت کو مقدر کر دیا ہے۔

خلیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قدر کا معنی تنگی بھی ہے، جیسا قرآن مجید کی اس آیت میں ہے، وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الطلاق: ۷) جس شخص پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا، اس رات میں اتنی کثرت سے فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ زمین ان پر تنگ ہو جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر، تفسیر قرطبی، تبیان القرآن ۳)

شب قدر کی عظمت، رفعت اور بلندی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے مخفی رکھا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بہت ساری اشیاء کو مخفی رکھا ہے اس شب کو بھی مخفی رکھا ہے، اس نے اپنی رضا کو نیکیوں میں پوشیدہ رکھا ہے تاکہ تمام نیکیوں میں

رغبت اور شوق رکھا جائے، اس نے اپنا غیظ وغضب معاصی اور نافرمانی میں پوشیدہ رکھا ہے تاکہ تمام نافرمانیوں سے بچا جائے۔

اس نے اپنے ولی کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے تاکہ وہ سب لوگوں کی تعظیم کریں، اس نے دعا کی اجابت وقبولیت کو مخفی رکھا ہے تاکہ تمام دعائیں خوب خوب مانگیں، اس نے اسم اعظم پوشیدہ رکھا ہے تاکہ وہ تمام اسماء الحسنیٰ کی تعظیم کریں۔

اس نے صلاۃ الوسطیٰ کو پوشیدہ رکھا ہے تاکہ تمام نمازوں کی حفاظت کی جائے، اس نے قبولیت توبہ کو مخفی رکھا ہے تاکہ مکلف شخص توبہ کی تمام اقسام پر مواظبت کرے، اس نے موت کو پوشیدہ رکھا ہے تاکہ مکلف شخص خوف زدہ رہے، اسی طرح اس نے شب قدر کو پوشیدہ رکھا ہے تاکہ رمضان کی تمام راتوں کی تعظیم کی جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ یوں فرمارہے ہیں کہ اگر میں شب قدر کو متعین کر دیتا تو میں گناہوں اور نافرمانیوں پر تمہاری جسارت اور دلیری کو جانتا تھا، بہت دفعہ تمہیں اس شب میں شہوت گناہ کی طرف دعوت دیتی تو آپ گناہ میں پڑ جاتے، جب آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ رات قدر والی ہے پھر بھی اس میں گناہ کرتے تو یہ زیادہ سخت اور شدید بات ہوتی اس سبب سے میں نے شب قدر کو مخفی رکھا ہے۔

اس کی مثال ایک روایت میں دیکھیے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو ایک شخص کو سوتے ہوئے دیکھا، تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اسے جگاؤ تاکہ یہ وضو کرے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے جگادیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یارسول اللہ! آپ ﷺ تو نیکیوں میں سب سے آگے بڑھنے والے ہیں آپ ﷺ نے اسے کیوں بیدار نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا آپ کو انکار کرنا کفر نہیں ہے میں نے اس لیے اسے خود نہیں جگایا کہ میرے جگانے پر وہ انکار کرتا تو یہ زیادہ گناہ گار ہوتا اور میرے جگانے پر انکار کفر تھا، اس لیے میں نے آپ سے کہا تاکہ انکار کی صورت میں اس کا گناہ ہلکا ہو۔

آپ اندازہ فرمالیں کہ جب رسول کریم ﷺ کی رحمت اور مہربانی اس قدر ہے تو رب تعالیٰ کی رحمت ومہربانی کو قیاس کر لیجیے کہ وہ کس قدر ہو گی؟ گویا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرمارہے ہیں جب آپ کو شب قدر کا علم ہو جائے پھر آپ اس میں نیکی کمائیں تو گویا آپ نے ہزار مہینوں کا ثواب کمالیا اور اگر آپ نے نافرمانی اور گناہ کا ارتکاب کیا تو گویا آپ نے ہزار مہینوں کا گناہ کر لیا، اس لیے سزا کو دور کرنا یہ ثواب کمانے سے زیادہ بہتر ہے۔ تیسری وجہ شب قدر کو مخفی رکھنے کی یہ ہے کہ مکلف انسان شب قدر کو تلاش کرنے کی کوشش کرے تاکہ اسے کوشش کرنے کا ثواب ملے۔ چوتھی وجہ شب قدر کو چھپانے اور مخفی رکھنے کی یہ ہے کہ بندے کو جب تک شب قدر کا یقین نہیں ہو گا تب تک وہ تمام راتوں میں اطاعت وبندگی کی کوشش کرے گا۔

اس امید پر کہ ہو سکتا ہے کہ یہی رات شب قدر ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے اس بندے پر فخر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمہی تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ فساد مچائے گا اور زمین میں خونریزی کرے گا، اس کی یہ جدوجہد اور کوشش وکاوش دیکھو کہ ایک گمانی رات کے بارے میں کتنا کوشاں ہے اگر یہ رات اس کے لیے یقینی ہو جائے تو پھر اس کی کوشش اس کے لیے کس قدر ہو گی؟ یہی وہ لمحہ ہے جس میں اللہ کے اس فرمان کا راز طشت از بام ہوتا ہے جس میں اس نے فرشتوں کے سامنے فرمایا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ: اس رات کی برکت کی زیادتی کی وجہ سے بکثرت فرشتے اس میں نازل ہوتے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ فرشتوں کی نگاہ ارواح پر ہوتی ہے، جب کہ انسانوں کی نگاہ بدن اور جسم پر ہوتی ہے، جب فرشتے انسانی روح کو دیکھتے ہیں جو شہوت، غصہ، غیظ وغضب جیسی مذموم اور قبیح صفات کا محل ہے تو وہ اسے قبول نہیں کرتے، ایسی مذموم وقبیح صفات انسان میں دیکھ کر فرشتوں کو اپنا وہ قول یاد آجاتا ہے جو انسان کی تخلیق سے پہلے انہوں نے اللہ کے سامنے کہا تھا کہ اے اللہ! کیا تو زمین میں ایسی مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے جو زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزی کرے گی، اور انسان کے والدین جب ابتدائی مراحل میں اس کی بری صورت دیکھتے ہیں جب کہ انسان ایک پانی کی پھٹکی، بوند،

قطرہ ناپاک منی اور گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے تو وہ بھی اسے قبول نہیں کرتے بلکہ اس قطرہ منی جیسی گندی چیز کو دیکھ کر اظہارِ نفرت کرتے ہیں۔

منی اور جمے ہوئے خون سے انہیں گھن آتی ہے، جب منی اور خون ان کے کپڑوں پر لگ جائے تو وہ اسے صاف کرتے ہیں اور اسے پانی سے دھوتے ہیں، پھر کتنے لوگ ہیں جو مختلف حیلوں بہانوں سے اِسقاطِ حمل کرتے ہیں اور اسے ضائع کر دیتے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ اس انسان کو خوبصورت شکل عطا کرتا ہے، اس کے بعد جب والدین اس حسین صورت اور جمیل شکل کو دیکھتے ہیں تو اسے قبول کرتے ہیں، اس کی طرف ان کی طبیعت مائل ہوتی ہے، اسی طرح فرشتوں کا معاملہ ہے جب وہ انسان کی اس خوبصورت روح کو دیکھتے ہیں جس میں اللہ کی معرفت اور اس کی اطاعت کے جذبات ہوتے ہیں تو وہ اسے پسند کرتے ہیں، پھر وہ انسان کی طرف معذرت کرنے کے لیے اترتے ہیں ان کلمات سے جو انہوں نے انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ کے سامنے کہے تھے۔

یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مراد ہے جس میں فرمایا کہ فرشتے اترتے ہیں، جب فرشتے اترتے ہیں تو انسانی روح کو شب بدن کی تاریکی میں دیکھتے ہیں اور جسمانی قوتوں کی تاریکی کی طرف نظر کرتے ہیں تو اس وقت وہ معذرت کرتے اور اہل ایمان کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔

اللہ فرماتے ہیں کہ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ فرشتے اترتے ہیں، اس فرمان گرامی کے ظاہر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سارے ہی فرشتے اترتے ہیں، پھر فرشتوں کی بہت بڑی تعداد ہے، سب کے اترنے کا زمین تحمل و برداشت نہیں کر سکتی، اسی وجہ سے اہل علم اس کی مراد جاننے اور بتانے میں ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ سارے ہی فرشتے آسمان دنیا پر اتر آتے ہیں، اس صورت میں یہ اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے آسمان میں تو پہلے اس قدر فرشتے ہیں کہ ایک بالشت جگہ بھی خالی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ موجود نہ ہو، تو پھر سارے فرشتے ایک ہی آسمان میں کیسے سما سکتے ہیں؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد کی وجہ سے عموم کتاب کا فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا، وہ اس طرح کہ فرشتے تو فوج در فوج اترتے ہیں، کوئی اتر رہا ہے اور کوئی چڑھ رہا ہے، جس طرح حجاج

کرام کثرت سے خانہ کعبہ میں سارے کے سارے داخل ہوتے ہیں، کوئی طواف کررہا ہے، کوئی نوافل ادا کررہا ہے، کوئی زم زم پی رہا ہے، کوئی صفاومروہ کے درمیان سعی میں مصروف ہے، کوئی حلق وقصر کروارہا ہے، کوئی رہائش گاہوں کی سمت رواں دواں ہے، کوئی مسجد الحرام میں بیٹھ کر دیدار کعبہ سے شرف یاب ہورہا ہے، ہزاروں لوگ وہاں دکھائی دیتے ہیں، کوئی آرہا ہے اور کوئی جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ فرشتوں کا نزول طلوع فجر تک جاری رہتا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں تَنَزَّلُ استعمال ہوا ہے جو ایک بار کے بعد دوسری بار نزول کا فائدہ دیتا ہے۔

دوسرا قول اکثر اہل علم کا ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے، کہ فرشتے زمین کی طرف اترتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فرمان سے غرض تو انسانوں کو اس رات کی بیداری کی ترغیب دینا ہے، اور اس لیے بھی کہ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ فرشتے عام دنوں میں ذکر کی مجلسوں اور دینی محافل کی طرف اترتے ہیں، تو اس رات میں اگر یہ سعادت حاصل ہو جائے اس کے عظیم الشان مقام ومرتبہ کی وجہ سے تو یہ سب سے بہتر بات ہے۔

پھر فرشتوں کے زمین پر اترنے کی کیا وجوہات ہیں اس میں ایک قول یہ ہے کہ فرشتے انسانوں کی عبادت، جدوجہد اور اطاعت وبندگی میں ان کی محنت دیکھنے کے لیے اترتے ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے، وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کے احکامات کی نافرمانی نہیں کرتے، جیسے سورۃ مریم میں ہے وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ (مَرْيَمَ: ٦٤) اور ہم تیرے رب کے امر کے بغیر نہیں اترتے۔ یہ آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ فرشتے اللہ کی طرف سے اس اترنے پر مامور ہوتے ہیں۔

بِإِذْنِ رَبِّهِمْ: یہ کلمات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پہلے فرشتے زمین پر اترنے کی اجازت مانگتے ہیں تو انہیں اجازت دی جاتی ہے، یہ انتہائی محبت پر دلالت ہے، اس لیے کہ وہ ہماری ملاقات میں رغبت رکھتے ہیں اور ہماری ملاقات کی تمنا کرتے ہیں لیکن وہ اجازت ملنے کی انتظار کرتے رہتے ہیں۔

سورۃ الصافات کی آیت ۱۶۵ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ کو سامنے رکھتے ہوئے اگر اس آیت تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ کو دیکھا جائے تو بظاہر دونوں میں الگ الگ بات دکھائی دیتی ہے، سورۃ الصافات والی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے صفوں میں ہوتے ہیں جب کہ یہاں ایسا نہیں فرمایا گیا، اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں ہے، دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، دونوں الگ الگ حالتوں کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آخرت سے متعلق ایک وعدہ یہ فرمایا کہ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (الرَّعْدِ: ۲۳، ۲۴) فرشتے ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے اور سلام علیکم کہہ رہے ہوں گے۔ وہاں آخرت میں ہر دروازے سے سلام کہنے کے لیے داخل ہوں گے جب کہ یہاں دنیا میں بھی بندگانِ خدا اگر بندگی پروردگار میں مشغولیت اختیار کریں گے تو فرشتے انہیں سلام کرنے اور ان کی زیارت کرنے کے لیے آئیں گے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ أَنَّهُمْ يَنْزِلُونَ لِيُسَلِّمُوا عَلَيْنَا وَلِيَشْفَعُوا لَنَا فَمَنْ أَصَابَتْهُ التَّسْلِيمَةُ غُفِرَ لَهُ ذَنْبُهُ (تفسیر کبیر للرازی) فرشتے آسمان سے اس لیے اترتے ہیں تاکہ ہمیں سلام کریں اور ہمارے لیے شفاعت کریں، جس کو فرشتوں کا سلام پہنچ گیا اس کے گناہ معاف ہوگئے۔ شب قدر میں زمین پر اللہ کی اطاعت وبندگی میں لوگوں کی مشغولیت کے باعث فضیلت ملی، فرشتے اس رات میں زمین کی طرف اس لیے اترتے ہیں تاکہ ان کی اطاعت وبندگی کا ثواب زیادہ ہو، جیسے ایک شخص مکہ کی طرف جاتا ہے تاکہ وہاں اسے عبادت، طاعت اور بندگی کا زیادہ ثواب ملے، تو اس سب میں انسان کے لیے ترغیب ہے۔

انسان کی عبادت، طاعت اور بھلائی ایک تو خلوت میں ہوتی ہے اور ایک اپنے بڑے علماء اور زہاد کے سامنے ہوتی ہے، تو بڑوں کے سامنے کی جانے والی بھلائی تنہائی میں کی جانے والی بھلائی سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ مقرب فرشتوں کو بھیجتے ہیں تاکہ ایک مکلف شخص کو پتہ چل جائے کہ اس کی عبادت،

طاعت اور بھلائی جو ان بڑے علماء، زہاد اور عبادت گزاروں کے سامنے کی گئی ہے وہ اعلیٰ اور اتم درجہ کی ہے جو نقصان سے بہت دور ہے۔

کعب بیان کرتے ہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان کے اس کنارے پر ہے، جو جنت کے قریب ہے، پس اس کے نیچے دنیا ہے، اس کی چوٹی کے اوپر جنت ہے اور اس کی جڑیں اور تنا کرسی کے نیچے ہے، اس میں فرشتے ہیں جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور سدرہ کی ہر شاخ پر فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہیں اور جبریل علیہ السلام کا مقام اس کے وسط میں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر شب قدر میں حضرت جبریل کو آواز دیتا ہے کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ کے فرشتوں کے ساتھ زمین پر نازل ہوں اور ان میں سے ہر فرشتے کو مؤمنین کے لئے شفقت اور رحمت دی جاتی ہے، پھر وہ غروب آفتاب کے وقت حضرت جبریل کے ساتھ زمین پر نازل ہوتے ہیں، پھر زمین کے ہر حصہ پر فرشتے سجدہ اور قیام میں مؤمنین اور مؤمنات کے لئے دعا کرتے ہیں، سوا ان مقامات کے جہاں یہودیوں اور عیسائیوں کا معبد ہو یا آتش کدہ ہو یا بت خانہ ہو یا کچرا کنڈی ہو یا جس گھر میں کوئی نشہ کرنے والا ہو۔

وَجِبْرِيلُ لَا يَدَعُ أَحَدًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ إِلا صَافَحَهُ وَعَلامَةُ ذَلِكَ مَنِ اقْشَعَرَّ جِلْدُهُ وَرَقَّ قَلْبُهُ وَدَمَعَتْ عَيْنَاهُ فَإِنَّ ذَالِكَ مِنْ مُصَافَحَةِ جبريل، جبریل ہر مؤمن سے مصافحہ کرتے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس وقت ہر مؤمن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کا دل بہت نرم ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس وقت حضرت جبریل اس سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم، تفسیر فخر الدین رازی)

امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر میں ہے کہ جو شخص اس رات میں تین بار لا الٰہ الا اللہ کہہ دے تو ایک بار تو اس کی بخشش ہو جاتی ہے، اور ایک بار اس کی دوزخ سے نجات ہو جاتی ہے، اور ایک بار اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے، اور سب سے پہلے جو اوپر جاتا ہے وہ جبریل امین ہوتے ہیں یہاں تک کہ

سورج کے سامنے اپنے دونوں سبز رنگ کے پر بچھادیتے ہیں یہ پروہ اسی دن کی رات کی گھڑی میں پھیلاتے ہیں۔

پھر ایک ایک فرشتے کو بلاتے ہیں، پھر سارے فرشتے اوپر جاتے ہیں، فرشتوں کا نور اور جبریل کے پروں کا نور یکجا ہو جاتا ہے، اس کے بعد جبریل اور ان کے ساتھ والے فرشتے آسمان دنیا اور اس دن کے سورج کے درمیان کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر اہل ایمان کے لیے اور جن لوگوں نے ثواب کی نیت سے روزے رکھے ان کے لیے دعا، رحمت اور استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

جب شام ہو جاتی ہے تو آسمان دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر حلقے بنا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر آسمان دنیا کے فرشتوں کو جمع کیا جاتا ہے، پھر ان سے ایک ایک بندے کے بارے میں پوچھتے ہیں ایک ایک عورت کے بارے میں پوچھتے ہیں، یہاں تک پوچھتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا؟ اور تم نے اسے کیسے پایا؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے سال تو اسے عبادت گزار پایا تھا اور اس سال اسے بدعتی پایا اور فلاں شخص پہلے سال بدعتی تھا اور اس سال عبادت گزار، پھر وہ پہلے والے کے لیے دعا کرنے سے رک جاتے ہیں اور اس دوسرے کے لیے دعا کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

فرشتے بتاتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو تلاوت کرنے والا، فلاں کو رکوع کرنے والا فلاں کو سجدہ کرنے والا پایا، دن بھر اور رات بھر یونہی معاملہ ہوتا ہے پھر وہ دوسرے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں، یونہی وہ سارے آسمانوں میں کرتے ہیں یہاں تک کہ سدرہ (بیری کا درخت) تک پہنچ جاتے ہیں، سدرہ ان سے کہتا ہے

يَا سُكَّانِي حَدِّثُونِي عَنِ النَّاسِ فَإِنَّ لِي عَلَيْكُمْ حَقًّا، وَإِنِّي أُحِبُّ مَنْ أَحَبَّ اللهَ، فَذَكَرَ كَعْبٌ أَنَّهُمْ يَعُدُّونَ لَهَا الرَّجُلَ وَالْمَرْأَةَ بِأَسْمَائِهِمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِهِمْ، ثُمَّ يَصِلُ ذٰلِكَ الْخَبَرُ إِلَى الْجَنَّةِ، فَتَقُولُ الْجَنَّةُ: اَللّٰهُمَّ عَجِّلْهُمْ إِلَيَّ، وَالْمَلَائِكَةُ، وَأَهْلُ السِّدْرَةِ يَقُولُونَ: آمِينَ آمِينَ

اے میرے رہائشیو! میرا تم پر حق ہے مجھے لوگوں کے بارے میں بتاؤ، میں اس سے محبت رکھتا ہوں جو اللہ سے محبت رکھتا ہے، حضرت کعب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یوں فرشتے سدرہ کو مردوں اور عورتوں کو گنواتے ہیں، ان کے نام بتاتے ہیں، ان کے والدین کے نام بتاتے ہیں، پھر یہ خبر جنت تک چلی جاتی ہے، جنت کہتی ہے کہ اے اللہ! انہیں میری طرف جلدی لے آ، فرشتے اور سدرہ والے اس دعا پر آمین آمین کہتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ جہاں بھی اچھائی کا اجتماع ہوتا ہے، بھلائی کا جوڑ ہوتا ہے وہاں بہت زیادہ رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، اسی لیے سب سے بڑا اور عظمت والا اجتماع حج کا ہوتا ہے، اس لیے یقینی طور پر وہاں رحمتوں کا نزول بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح شب قدر مقرب فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے تو یقینی طور پر رحمتوں کا بہت زیادہ نزول ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

الرُّوح: روح سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں بہت سے اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ روح ایک بڑے فرشتے کا نام ہے، اگر وہ آسمانوں اور زمینوں کو لقمہ بنالے تو یہ اس کا ایک ہی لقمہ ہوں۔ دوسرا قول یہ ہے روح سے مراد فرشتوں کی وہ ٹولی اور جماعت ہے جسے فرشتوں نے بھی آج کی رات کے علاوہ نہیں دیکھا ہوتا، جس طرح زاہدین لوگوں کو اجتماع عید میں ہی دیکھا جاسکتا ہے، فرشتوں کی یہ جماعت غروب آفتاب سے طلوع فجر تک زمین پر اترتی رہتی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے روح سے مراد اللہ کی مخلوق میں سے کوئی مخلوق ہے جو کھاتی ہے، لباس پہنتی ہے، مگر یہ فرشتوں میں سے نہیں ہے، نہ ہی انسانوں میں سے ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنت کے خدام میں سے ہو۔

چوتھا قول یہ ہے روح کی مراد میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ ان کا نام بھی روح اللہ ہے، اس قول کی روشنی میں ایک ممکناتی بات کہی جاسکتی ہے کہ ہوسکتا ہے عیسیٰ علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں زمین پر آتے ہوں تاکہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو جھانک سکیں۔ (واللہ اعلم) پانچواں قول یہ ہے کہ روح سے مراد قرآن کریم ہے، جیسے سورۃ الشوریٰ میں وحی کو روح فرمایا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوْحاً مِّنْ أَمْرِنَا (الشُّورَى: ۵۲)

چھٹا قول یہ ہے کہ روح سے مراد رحمت ہے، جیسے قرآن کریم میں رحمت کو رَوحِ اللہ کہا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے لَا تَيْأَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (یُوسُف: ۸۷) گویا اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ فرشتے میری رحمت کو اتارتے ہیں اور اس کے پیچھے پیچھے خود بھی اتر جاتے ہیں پھر وہ دنیا اور آخرت دونوں جہان کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں۔ ساتواں قول یہ ہے کہ الروح سب سے اشرف اور افضل فرشتے کو کہتے ہیں۔

آٹھواں قول یہ ہے روح سے مراد محافظ، نگہبان، کراماً کاتبین فرشتے ہیں، دائیں کاندھے والا فرشتہ بندے کے واجبات کی ادائیگی لکھتا ہے، بائیں کاندھے والا بندے کی بری چیزیں چھوڑنے کو لکھتا ہے، لیکن درست اور صحیح بات یہ ہے کہ یہاں الروح سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، ملائکہ کا ذکر کرنے کے بعد الروح کو خاص طور پر ذکر کرنا حضرت جبریل امین کی شرافت، بزرگی، عظمت اور باقی فرشتوں پر ان کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے، گویا اللہ تعالیٰ اس بات کا اظہار فرمانا چاہتے ہیں کہ سارے فرشتے میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور اکیلا جبریل میزان کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، فرمایا إِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي كَبْكَبَةٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّونَ عَلَى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ أَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ (شعب الایمان) جب شب قدر ہوتی ہے تو جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں اترتے ہیں دعائیں کرتے اور سلام کرتے ہیں ہر اس بندے پر جو کھڑے یا بیٹھے اللہ کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شب قدر میں حضرت جبریل کو حکم دیتا ہے کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ سے ستر ہزار فرشتے لے کر زمین پر جائیں، ان کے ساتھ نور کے جھنڈے ہوتے ہیں، جب وہ زمین پر اترتے ہیں تو جبریل علیہ السلام اور باقی فرشتے چار جگہوں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں، کعبہ پر، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر بیت المقدس کی مسجد پر اور طور سینا کی مسجد پر، پھر جبریل علیہ السلام کہتے

ہیں کہ زمین پر پھیل جاؤ، پھر فرشتے تمام زمین پر پھیل جاتے ہیں اور جس مکان یا خیمے یا پتھر پر یا کشتی میں غرض جہاں بھی کوئی مسلمان مرد یا عورت ہو، وہاں فرشتے پہنچ جاتے ہیں۔

ہاں! جس گھر میں کتا یا خنزیر یا شراب ہو یا تصویروں کے مجسمے ہوں یا کوئی شخص زناکاری سے جنبی ہو، وہاں نہیں جاتے، وہاں پہنچ کر فرشتے تسبیح و تقدیس کرتے ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی امت کے لیے استغفار کرتے ہیں پھر فجر کے وقت آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں آسمان دنیا کے فرشتے ان کا استقبال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ تم کدھر سے آرہے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں تھے کیونکہ آج کی رات امت محمدیہ کی شب قدر تھی، پھر آسمان دنیا والے فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آج امت محمدیہ ﷺ کی حاجات کا کیا کیا؟ حضرت جبریل امین انہیں بتاتے ہیں کہ إِنَّ اللّٰہ تَعَالَی غَفَرَ لِصَالِحِھِم وَشَفَّعَھُم فِی طَالِحِھِم، اللہ تعالیٰ نے ان کے نیکوکاروں کو معاف کر دیا اور ان کے گناہ گاروں کی شفاعت قبول کر لی۔

یہ بات سن کر آسمان دنیا کے فرشتے سبحان اللہ کی صدا لگاتے ہیں اور اللہ کی پاکی بیان کرتے ہوئے اس کی ثناء کرتے ہیں، یہ تسبیح، تقدیس اور ثنائے رب العالمین اس چیز کے شکرانے کے طور پر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی بخشش کر دی ہے اور اسے اللہ کی رضا مل گئی ہے۔

اس کے بعد وہ فرشتے دوسرے آسمان پر جاتے ہیں اور آسمان دنیا کے فرشتے دوسرے آسمان تک ان کے ساتھ چلتے ہیں، ساتویں آسمان تک اسی طرح گفتگو ہوتی ہے، ساتویں آسمان سے جبریل تمام آسمانوں کے فرشتوں سے کہتے ہیں تم واپس چلے جاؤ، پھر تمام آسمان کے فرشتے اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ جاتے ہیں۔

جب یہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں تو سدرۃ المنتہیٰ کے فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کہاں تھے؟ تو یہ یہاں بھی اسی طرح جواب دیتے ہیں جس طرح سات آسمان کے فرشتوں نے جواب دیا تھا، تو سدرۃ المنتہیٰ والے فرشتے اپنی آوازیں بلند کرتے ہوئے تسبیح، تہلیل اور ثنائے رب العالمین کرتے ہیں

جسے جنت الماویٰ، جنت نعیم، جنت عدن اور جنت الفردوس اور عرش الٰہی اس کو سنتا ہے تو وہ بھی تسبیح، تقدیس اور ثنائے رب جلیل میں اپنی آواز بلند کرتا ہے، اس شکرانہ میں جو اللہ نے امت محمدیہ کو دیا۔

اور اللہ تعالیٰ کا عرش کہتا ہے إِلٰهِي بَلَغَنِي عَنكَ أَنَّكَ غَفَرتَ البَارِحَةَ لِصَالِحِي أُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَشَفَّعتَ صَالِحَهَا، اے اللہ! مجھے خبر پہنچی ہے کہ گزشتہ رات تو نے محمد ﷺ کی امت کے صالحین کو بخش دیا اور گنہگاروں کے حق میں نیکوکاروں کی شفاعت قبول کرلی۔

یہ سن کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے صَدَقتَ يَا عَرشِي وَلِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ عَلَيهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عِندِي مِنَ الكَرَامَةِ مَا لَا عَينٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلبِ بَشَرٍ، اے عرش! تو نے سچ کہا، محمد ﷺ کی امت کے لئے میرے پاس بڑی عزت اور کرامت ہے اور ایسی نعمتیں ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں کسی کان نے سنا نہیں اور نہ ہی کسی کے دل میں ان نعمتوں کا کبھی خیال آیا۔ (غنیۃ الطالبین، روح المعانی)

حضرت کعب کی روایت میں ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے تمام فرشتے جبریل کے ساتھ اترتے ہیں ان کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جبریل کسی کو مصافحہ کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ (روح المعانی)

ایک روایت میں ہے کہ جبریل کسی مومن مرد اور مومن عورت کو سلام کیے بغیر نہیں چھوڑتے، مگر شراب کے عادی، خنزیر خور، زعفران کے ساتھ لتھڑے ہوئے کو سلام نہیں کرتے، جبریل مصافحہ کرتے ہیں، ان کے مصافحہ کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل میں رقت طاری ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ (روح المعانی)

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس رات میں اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی رحمتوں کو جبریل تقسیم کرتے ہیں، زندہ ایمان والوں کو یہ رحمتیں گھیر لیتی ہیں، پھر عرض کرتے ہیں یارب! رحمت میں سے بہت کچھ باقی ہے میں کیا کروں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے امت محمد ﷺ کے مردوں پر تقسیم کر دیجیے، پھر وہ اسے ان مردوں میں تقسیم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ انہیں بھی

گھیر لیتی ہے، پھر عرض کرتے ہیں کہ یارب! رحمت میں سے بہت کچھ باقی ہے اس کا میں کیا کروں؟ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں اسے کافروں پر تقسیم کر دیجیے، چنانچہ جبریل اسے کافروں پر تقسیم کر دیتے ہیں، جس کافر کو اس رحمت میں سے کچھ حصہ ملتا ہے وہ ایمان پر مرتا ہے۔ (روح المعانی)

بِإِذْنِ رَبِّهِمْ: ملائکہ امت محمدیہ کے عبادت گزاروں کے ساتھ ملاقات کے مشتاق رہتے ہیں، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگتے ہیں، اللہ کی طرف سے انہیں اجازت دی جاتی ہے تو وہ زمین کی طرف اترتے ہیں، وہ بلا اذن واجازت کوئی کام سرانجام نہیں دیتے، وہ معصوم مخلوق ہیں، امر خداوندی کی عدولی نہیں کرتے۔

اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ ہم گناہ گار وسیاہ کار لوگ ہیں، ہماری ملاقات کا فرشتوں کو کیسے اشتیاق ہو سکتا ہے؟ تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ فرشتے ہمارے گناہوں اور نافرمانیوں کی تفصیلات سے مطلع نہیں ہوتے، جب وہ لوح محفوظ میں ہمارے احوال کو دیکھتے ہیں تو وہ مکلف لوگوں کی نیکیوں کو تفصیل سے دیکھتے ہیں، جب وہ اس کے معاصی اور گناہوں تک پہنچتے ہیں تو ان پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے جس کے باعث وہ انہیں دیکھ نہیں سکتے اس وقت وہ کہتے ہیں وہ ذات پاک ہے جس نے خوبصورت چیز کو ظاہر کیا اور بری چیز پر پردہ ڈال دیا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں قند مکرر کے طور پر فرشتوں کے نزول کے فوائد ذکر فرمائے ہیں کہ فرشتے زمین میں طاعات کی انواع میں سے بہت سی اشیاء دیکھتے ہیں جنہیں وہ آسمانوں میں نہیں دیکھتے، وہ دیکھتے ہیں کہ مالدار لوگ اپنے گھروں سے کھانا لے کر آتے ہیں اور فقیروں کی ضیافت کرتے ہیں، فقرا مالداروں کا کھانا تناول کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت بجالاتے ہیں، یہ اطاعت کی ایسی قسم ہے جو آسمانوں میں نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **لَأُنِينُ الْمُذْنِبِينَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِينَ** گناہ گاروں کا رونا مجھے تسبیح کرنے والوں کی آواز سے زیادہ محبوب ہے۔ اس پر پھر فرشتے کہتے ہیں کہ ہم زمین کی طرف

جاتے ہیں تاکہ ہم اس آواز کو سن سکیں جو ہمارے پروردگار کو ہماری تسبیح کی آواز سے زیادہ محبوب ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ تسبیح کرنے والوں کی آواز تو اطاعت گزاروں کی حالت کے کمال کو ظاہر کرنے کے لیے ہے اور گناہ گاروں کا رونا آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی غفاریت کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

رَبِّهِمْ: یہ فرشتوں کی تعظیم اور گناہ گاروں کی تحقیر کا فائدہ دیتا ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ میرے تھے اور میں ان کا ہوں، اس کی مثال ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّماواتِ وَالْأَرْضَ (الأعراف: ۵۴) بے شک تمہارا پروردگار اللہ ہے، وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے لیے فرمایا کہ وَإِذْ قالَ رَبُّكَ (البقرة: ۳۰) اس کی مثال جیسے حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی مرض الوفات میں فرمایا کہ إِلٰهِي كُنْ لِسُلَيْمَانَ كَمَا كُنْتَ لِي، اے میرے اللہ! تو سلیمان کے لیے ایسے ہو جا جیسے تو میرے لیے تھا، تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی اور فرمایا کہ فَنَزَلَ الْوَحْيُ وَقَالَ: قُلْ لِسُلَيْمَانَ فَلْيَكُنْ لِّي كَمَا كُنْتَ لِي، آپ سلیمان سے یہ کہیں کہ وہ میرے لیے ایسے ہو جائے جیسے آپ میرے لیے تھے۔

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی بات نقل کی جاتی ہے کہ جب بہت دنوں تک ان کے پاس مہمان نہیں آیا تو وہ دستر خوان لے کر مہمان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، تو اچانک ایک خیمہ کے پاس پہنچ گئے، تو آواز دی کہ تم مہمانی چاہتے ہو؟ تو انہیں جواب دیا گیا کہ ہاں، پھر میزبان نے کہا کیا تمہارے پاس دودھ کا سالن یا شہد ہے؟

چنانچہ ایک آدمی نے دو چٹانیں اٹھائیں اور ایک دوسرے پر انہیں مارا، وہ پھٹیں تو ان میں ایک سے دودھ نکلا اور دوسری سے شہد، تو ابراہیم علیہ السلام حیران ہو گئے اور عرض کیا، اے میرا اللہ! میں تیرا دوست ہوں اور میں نے اس طرح اکرام نہیں پایا، اس کے لیے یہ کیا ہے؟ تو اللہ نے وحی نازل فرمائی

کہ اے میرے خلیل! یہ شخص ہمارے لیے تھا اور ہم اس کے لیے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

مِنْ كُلِّ أَمْرٍ: اس کا مطلب یہ ہے فرشتے اور روح الامین اس میں ہر کام کے لیے اترتے ہیں، مطلب یہ کہ ہر ایک ان میں سے اہم کام کے لیے اترتا ہے، چنانچہ عبادات بہت زیادہ ہیں، کوئی تور کوع کے لیے، کوئی سجدہ کے لیے، کوئی دعا کے لیے اترتا ہے، بعض اس رات کی فضیلت جاننے کے لیے اترتے ہیں یا ایمان والوں کو سلام کرنے کے لیے اترتے ہیں۔

ہر اس کام کے لیے فرشتے اترتے ہیں جو اس سال خیر یا شر کے ہوں گے، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کا اترنا عبادت ہے، گویا کہ وہ کہتے ہیں ہم اپنی خواہش نفسانی کے تحت زمین کی طرف نہیں اترے، لیکن ہر اس کام کے لیے جس میں مکلفین کی مصلحت پوشیدہ ہو، یہاں الامر کا لفظ عام ہے جو دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے لیے عام ہے، مطلب یہ ہے کہ فرشتے مکلف آدمی کی دنیوی واخروی بھلائیوں کی خاطر آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں، گویا کہ سائل پوچھتا ہے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اس سوال کا کوئی مقصد نہیں ہے، یہ پوچھو کہ آپ کس کام کے لیے آئے ہیں؟ کیونکہ اس میں آپ کا حصہ ہے۔

ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ کل امر سے مراد ہر انسان کے لیے، جیسے روایت میں ہے کہ جس بھی مومن مرد اور عورت سے وہ ملاقات کرتے ہیں تو اسے سلام کرتے ہیں۔

یہاں ایک اشکال ہے کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ عمریں اور رزق شعبان کی پندرہویں شب میں تقسیم کیا جاتا ہے، جب کہ اب کہا جارہا ہے کہ یہ شب قدر میں ہوتا ہے؟ اس کا جواب نبی کریم ﷺ کے فرمان گرامی میں موجود ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **إِنَّ اللّٰهَ يُقَدِّرُ الْمَقَادِيرَ فِي لَيْلَةِ الْبَرَاءَةِ، فَإِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ يُسَلِّمُهَا إِلَى أَرْبَابِهَا**، بے شک اللہ تعالیٰ تقدیریں شب برأت پر مقدر کرتا ہے، پھر جب شب قدر ہوتی ہے تو ان کے ذمہ داروں کے سپرد کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شب برأت پر عمریں اور رزق مقدر کیا جاتا ہے اور شب قدر میں خیر، برکت اور سلامتی کے امور مقدر کیے جاتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شب قدر میں وہ امور مقدر کیے جاتے ہیں جو دین کو عزت دینے اور مسلمانوں کے عظیم نفع سے متعلق ہوتے ہیں جب کہ شب برأت میں ان لوگوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو مریں گے اور ملک الموت کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ: شب قدر میں طلوع فجر تک فرشتے اطاعت گزار بندوں کو سلام کرتے رہتے ہیں، فرشتے رات کے ابتدائی حصہ میں کثیر تعداد میں آسمان سے زمین کی طرف اتر آتے ہیں، پھر ان کا اترنا لگاتار رہتا ہے تاکہ کثرت سے اطاعت گزاروں پر سلام کریں۔

شب قدر میں فرشتوں کی طرف سے اطاعت گزار بندوں پر کیے جانے والے اس سلام کو حقیر نہ سمجھا جائے، معمولی نہ خیال کیا جائے، کیونکہ سات فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں تشریف لائے تو انہوں نے انہیں سلام کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کے اس سلام سے وہ خوشی اور مسرت ہوئی کہ اس کے مقابلہ میں اگر دنیا کی بادشاہی بھی انہیں دی جاتی تو وہ خوش نہ ہوتے، پھر جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا تو نمرودی آگ ان کے لیے گل وگلزار بن گئی تھی۔

برد وسلامتی والی بن گئی تھی، تو کیا فرشتوں کی طرف سے ہمیں سلام کرنے کی برکت سے اللہ کی آگ ہمارے لیے برد وسلامتی والی نہیں بن سکتی، ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے فرشتوں کی مہمانی کے لیے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا گیا تھا جب کہ وہ ہم سے بھنا ہوا دل مانگتے ہیں، بلکہ اس میں ایک اور باریکی ہے وہ یہ کہ یہاں اس امت کی فضیلت کا اظہار کرنا مقصود ہے، وہ اس طرح کہ وہاں تو فرشتے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام پر اترے تھے اور یہاں امت محمدیہ پر اترتے ہیں۔

اور یہ سلامتی شرور اور آفات سے سلامتی ہے، اس رات فرشتے خیرات، سعادات کے ساتھ نازل ہوتے ہیں، اس شب میں مضرت رسانی نہیں بلکہ سلامتی ہی سلامتی اترتی ہے، نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر اترتی ہے۔

حضرت ابو مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلام کا مطلب ہے ہواؤں، ایذاؤں، بجلیوں، کڑک اور اس جیسی اور چیزوں سے محفوظ رات۔ سلامتی سے ایک مراد یہ ہے کہ شیطان اس میں برائی کی طاقت نہیں رکھتا۔

شب قدر کی فضیلت طلوع فجر تک رہتی ہے، سلام ھی حتی مطلع الفجر کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا کہ ابتدائے شب سے لے کر طلوع فجر تک یہ رات سالم ہے، اس کے ہر جزء میں عبادت ہزار مہینوں سے بہتر ہے، باقی راتوں کی طرح نہیں کہ جن میں فرض نماز کی ادائیگی ابتدائی ثلث میں مستحب ہے، عبادت کے لیے نصف رات اور دعا وغیرہ کے لیے سحری کا وقت بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ شب قدر متساویۃ الاوقات ہے، اس کے تمام اجزا میں عبادت، دعا، نوافل، سب برابر فضیلت اور درجہ رکھتے ہیں۔

سلام کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ سلام ہے یعنی جنت ہے، کیونکہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام دارالسلام بھی ہے۔ عبدالرحمن بن ابو یعلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس رات میں ہر امر سے سلامتی ہے یعنی کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ رات سراسر سلامتی والی ہے کوئی برائی صبح ہونے تک نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شب قدر آخری دس راتوں میں ہے جو ان میں طلب ثواب کی نیت سے قیام کرے اللہ تعالیٰ اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دیتا ہے یہ رات اکائی کی ہے یعنی اکیسویں یا تئیسویں یا پچیسویں یا ستائیسویں یا آخری رات۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یہ رات بالکل صاف اور ایسی ہوتی ہے کہ گویا چاند چڑھا ہوا ہے اس میں سکون اور دلجمعی ہوتی ہے نہ سردی زیادہ ہوتی ہے نہ گرمی صبح تک ستارے نہیں جھڑتے ایک نشانی اس کی یہ بھی ہے کہ اس صبح کو سورج تیز شعاؤں کے ساتھ نہیں نکلتا بلکہ وہ چودھویں رات کی طرح صاف نکلتا ہے۔ اس دن اس کے ساتھ شیطان بھی نہیں نکلتا۔ (مسند احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شب قدر صاف پر سکون سردی گرمی سے خالی رات ہے اس کی صبح مدھم روشنی والا سرخ رنگ نکلتا ہے۔ (ابو داؤد طیالسی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا مجھے شب قدر دکھلائی گئی، پھر بھلا دی گئی، یہ آخری دس راتوں میں ہے یہ صاف شفاف سکون و وقار والی رات ہے نہ زیادہ سردی ہوتی ہے نہ زیادہ گرمی اس قدر روشن رات ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا چاند چڑھا ہوا ہے سورج کے ساتھ شیطان نہیں نکلتا یہاں تک کہ دھوپ چڑھ جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں علماء کا اختلاف ہے کہ شب قدر اگلی امتوں میں بھی تھی یا صرف اسی امت کو خصوصیت کے ساتھ عطا کی گئی ہے؟ ایک حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب نظر ڈالی اور یہ معلوم کیا کہ سابقہ لوگوں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی تھیں تو آپ ﷺ کو خیال گزرا کہ میری امت کی عمریں ان کے مقابلہ میں کم ہیں تو نیکیاں بھی کم رہیں گی اور پھر درجات اور ثواب میں بھی کمی رہے گی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ رات عنایت فرمائی اور اس کا ثواب ایک ہزار مہینے کی عبادت سے زیادہ دینے کا وعدہ فرمایا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ روایت اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف اسی امت کو یہ رات دی گئی ہے بلکہ صاحب عدۃ نے جو شافعیہ میں سے ایک امام ہیں جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات جس طرح اس امت میں ہے، اگلی امتوں میں بھی تھی، چنانچہ حضرت مرثد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے شب قدر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کیا سوال کیا تھا؟

آپ نے فرمایا سنو! میں حضور ﷺ سے اکثر باتیں دریافت کرتا رہتا تھا ایک مرتبہ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو فرمایئے کہ شب قدر رمضان میں ہی ہے یا اور مہینوں میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا رمضان میں، میں نے عرض کیا اچھا یا رسول اللہ ﷺ یہ انبیاء کے ساتھ ہی ہے کہ جب تک وہ ہیں یہ بھی ہے جب انبیاء قبض کئے جاتے ہیں تو یہ اٹھ جاتی ہے یا یہ قیامت تک باقی رہے گی؟

حضور ﷺ نے جواب دیا کہ نہیں وہ قیامت تک باقی رہے گی، میں نے کہا اچھا رمضان کے کس حصہ میں ہے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا اسے رمضان کے پہلے اور آخری عشرہ میں تلاش کرو، پھر میں خاموش ہو گیا، آپ ﷺ بھی اور باتوں میں مشغول ہو گئے، میں نے پھر موقع پاکر سوال کیا کہ یارسول اللہ! ان دونوں عشروں میں سے کس عشرے میں اس رات کو تلاش کروں ؟

آپ ﷺ نے فرمایا آخری عشرے میں، بس کچھ نہ پوچھنا میں پھر چپکا ہو گیا لیکن پھر موقع پاکر میں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! آپ کی قسم ہے میرا بھی کچھ حق آپ پر ہے فرمادیجئے کہ وہ کونسی رات ہے ؟ آپ سخت غصے ہوئے میں نے تو کبھی آپ ﷺ کو اپنے اوپر اتنا غصہ ہوتے ہوئے دیکھا ہی نہیں اور فرمایا آخری ہفتہ میں تلاش کرو، اب کچھ نہ پوچھا۔ (نسائی، تفسیر ابن کثیر)

یہ روایت نقل کرنے کے بعد بھی علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رات اگلی امتوں میں بھی تھی اور اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ رات نبی ﷺ کے بعد بھی قیامت تک ہر سال آتی رہے گی۔ بعض روافض کا قول ہے کہ یہ رات بالکل اٹھ گئی، ان کا یہ قول غلط ہے ان کو غلط فہمی اس حدیث سے ہوئی ہے جس میں ہے کہ وہ اٹھالی گئی اور ممکن ہے کہ تمہارے لیے اسی میں بہتری ہو یہ حدیث پوری بھی آئے گی، مطلب حضور ﷺ کے اس فرمان سے یہ ہے کہ اس رات کی تعیین اور اس کا تقرر بھی ساتھ گیا نہ یہ کہ سرے سے شب قدر ہی اٹھ گئی۔

ابورزین رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ رمضان کی پہلی رات ہی شب قدر ہے امام محمد بن ادریس شافعی کا فرمان ہے کہ یہ سترھویں شب ہے۔ ابو داؤد میں اس مضمون کی ایک حدیث مرفوع مروی ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ سے موقوف بھی مروی ہے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی نقل کیا گیا ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ رمضان المبارک کی یہی سترھویں رات شب جمعہ تھی اور یہی رات بدر کی رات تھی اور سترھویں تاریخ کو جنگ بدر واقع ہوئی تھی جس دن کو قرآن نے یوم الفرقان کہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انیسویں رات لیلۃ القدر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکیسویں رات ہے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف کے پہلے دس دن کا اعتکاف کیا ہم بھی آپ کے ساتھ ہی اعتکاف بیٹھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ جسے آپ ڈھونڈتے ہیں وہ تو آپ کے آگے ہے۔ پھر آپ نے دس سے بیس تک کا اعتکاف کیا اور ہم نے بھی، پھر حضرت جبریل آئے اور یہی فرمایا کہ جسے آپ ڈھونڈتے ہیں وہ تو ابھی بھی آگے ہے یعنی شب قدر، پس رمضان کی بیسویں تاریخ کی صبح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ فرمایا.

اور فرمایا کہ میرے ساتھ اعتکاف کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ پھر اعتکاف میں بیٹھ جائیں میں نے شب قدر دیکھ لی لیکن میں بھول گیا شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے میں نے دیکھا ہے کہ گویا میں کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔

راوی حدیث فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کی چھت صرف کھجور کے پتوں کی تھی آسمان پر اس وقت ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہ تھا پھر ابر اٹھا اور بارش ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا ہوا اور میں نے خود دیکھا کہ نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر تر مٹی لگی ہوئی تھی۔

اس روایت کے ایک طریق میں ہے کہ یہ اکیسویں رات کا واقعہ ہے یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم دونوں میں ہے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمام روایتوں میں سے زیادہ صحیح یہی حدیث ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شب قدر رمضان شریف کی تئیسویں رات ہے اور اس کی دلیل حضرت عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی صحیح مسلم والی ایسی ہی ایک روایت ہے واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ چوبیسویں رات ہے ابو داؤد طیالسی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شب قدر چوبیسویں شب ہے اس کی سند بھی صحیح ہے مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے لیکن اس کی سند میں ابن لہیعہ ہیں جو ضعیف ہیں بخاری میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن ہیں

مروی ہے کہ یہ پہلی ساتویں ہے آخری دس میں سے یہ موقوف روایت ہی صحیح ہے واللہ اعلم۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما جابر رضی اللہ عنہ، حسن رضی اللہ عنہ، قتادہ رحمہ اللہ، عبد اللہ بن وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چوبیسویں رات شب قدر ہے، حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ قرآن کریم رمضان شریف کی چوبیسویں رات کو اترا، بعض کہتے ہیں پچیسویں رات لیلۃ القدر ہے ان کی دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے رمضان کے آخری عشرے میں ڈھونڈو۔ نو باقی رہیں تب، سات باقی رہیں تب، پانچ باقی رہیں تب۔

اکثر محدثین نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اس سے مراد طاق راتیں ہیں یہی زیادہ ظاہر ہے اور زیادہ مشہور ہے گو بعض اوروں نے اسے جفت راتوں پر بھی محمول کیا ہے جیسے کہ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابو سعید نے اسے جفت پر محمول کیا ہے واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ستائیسویں رات ہے اس کی دلیل صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یہ ستائیسویں رات ہے مسند احمد میں ہے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ کے بھائی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں جو شخص سال بھر راتوں کو قیام کرے گا وہ شب قدر کو پائے گا آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے وہ جانتے ہیں کہ یہ رات رمضان میں ہی ہے یہ ستائیسویں رات رمضان کی ہے پھر اس بات پر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی میں نے پوچھا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ جواب دیا کہ ان نشانیوں کو دیکھنے سے جو ہمیں بتائی گئی ہیں کہ اس دن سورج شعاعوں کے بغیر نکلتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اُبیّ رضی اللہ عنہ نے کہا اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ یہ رات رمضان میں ہی ہے آپ نے اس پر انشاء اللہ بھی نہیں فرمایا اور پختہ قسم کھالی پھر فرمایا مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ کونسی رات ہے جس میں قیام کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے یہ ستائیسویں رات ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کی صبح کو سورج سفید رنگ نکلتا ہے اور تیزی زیادہ نہیں ہوتی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ رات ستائیسویں رات ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مختار مسلک بھی یہی ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ایک روایت اسی قول کی منقول ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں شب قدر کی خبر دینے کے لیے (کہ فلاں رات شب قدر ہے) نکلے، دو مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں شب قدر کی خبر دینے کے لیے آیا تھا لیکن فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے وہ اٹھالی گئی اور ممکن ہے کہ اسی میں تمہاری بہتری ہو اب اسے نویں ساتویں اور پانچویں میں ڈھونڈو وجہ دلالت یہ ہے کہ اگر اس کا تعین ہمیشہ کے لیے نہ ہوتا تو ہر سال کی شب قدر کا علم حاصل نہ ہوتا اگر شب قدر کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا تو صرف اس سال کے لیے تو معلوم ہو جاتا کہ فلاں رات ہے لیکن اور برسوں کے لیے تعیین نہ ہوتی ہاں یہ ایک جواب اس کا ہو سکتا ہے کہ آپ صرف اسی سال کی اس مبارک رات کی خبر دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑائی جھگڑا خیر و برکت اور نفع دینے والے علم کو غارت کر دیتا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ بندہ اپنے گناہ کے باعث اللہ کی روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے یہ یاد رہے کہ اس حدیث میں جو آپ نے فرمایا کہ وہ اٹھالی گئی اس سے مراد اس کے تعین کے علم کا اٹھالیا جانا ہے نہ یہ کہ بالکل شب قدر ہی دنیا سے اٹھالی گئی جیسے کہ جاہل روافض کا قول ہے اس پر بڑی دلیل یہ ہے کہ اس لفظ کے بعد ہی یہ ہے کہ آپ نے فرمایا اسے نویں، ساتویں اور پانچویں میں ڈھونڈو۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ آپ رمضان شریف کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دس راتیں رمضان شریف کی رہ جاتیں تو اللہ کے رسول ﷺ ساری رات جاگتے اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور کمر کس لیتے (بخاری)

مسلم شریف میں ہے کہ حضور ﷺ ان دنوں میں جس محنت کے ساتھ عبادت کرتے اتنی محنت سے عبادت آپ کی اور دنوں میں نہیں ہوتی تھی۔ مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ باقی رہ جاتا تو آپ تہمد مضبوط باندھ لیتے اور عورتوں سے الگ رہتے امام مالک فرماتے ہیں کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں شب قدر کی یکساں جستجو کرے کسی ایک رات کو دوسری رات پر ترجیح نہ دے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر مجھے شب قدر مل جائے تو میں کیا دعا پڑھوں؟ آپ نے یہ دعا بتائی اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ العَفوَ، فَاعفُ عَنِّی، امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر ان روایات واحادیث کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو شب قدر کے فضائل میں وارد ہوئی ہیں، ہم نے بھی کوشش کی ہے کہ ان روایات کا ایک خاطر خواہ حصہ یہاں نقل کر دیں تاکہ باذوق اہل نظر اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

حو دمل لشان حو دمل آج سورۃ القدر کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو قبول ومنظور فرمائے، اور اسے ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۵ مئی ۲۰۲۰ء ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروز منگل، بوقت ۳ بجے وقت السحر

حروف بینی: ۱۵ نومبر ۲۰۲۰ء بروز اتوار پونے بارہ بجے شب

البینہ

یہود، نصاریٰ، مشرکین اور مسلمان

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ {۱} رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً {۲} فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ {۳} وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ {۴} وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ {۵} اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ {۶} اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ {۷} جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ {۸} البینۃ.

جواب ترجمہ: اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے، وہ اس وقت تک باز آنے والے نہیں تھے جب تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آتی۔ یعنی ایک اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔ جن میں سیدھی تحریریں لکھی ہوں۔ اور جو اہل کتاب تھے، انہوں نے جدا راستہ اسی کے بعد اختیار کیا جب ان کے پاس روشن دلیل آچکی تھی۔ اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اسی کے لیے خاص رکھیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی سیدھی سچی امت کا دین ہے۔ یقین جانو کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ ساری مخلوق میں سب سے برے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ بیشک ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ ان کے پروردگار کے پاس ان کا انعام وہ سدا بہار جنتیں

ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہو گا اور وہ اس سے خوش ہوں گے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار کا خوف دل میں رکھتا ہو۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۔الخ: یہود و نصاریٰ، مشرکین اور کفار کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ اپنے کفر کو چھوڑنے والے نہیں تاوقتیکہ ان کے پاس کوئی ایسی نشانی آجائے جس کا ان سے پچھلی کتابوں میں عہد و پیمان کیا گیا تھا۔ پہلی آیت میں اہل کتاب سے پہلے "من" تبعیضیہ کا ذکر ہے اور مشرکین سے پہلے نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے متعدد فرقے تھے، ان میں سے بعض کافر تھے اور بعض کافر نہیں تھے اور مشرکین تمام کے تمام کافر تھے۔

اہل کتاب میں سے بعض وہ تھے، جو ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان رکھتے تھے اور جب آپ مبعوث ہو گئے تو پھر بھی وہ آپ پر ایمان لے آئے اور بعض وہ تھے جو آپ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان نہیں لائے اور بعض وہ تھے جو پہلے بھی کافر تھے اور بعد میں بھی کافر رہے اور جب ان کے متعدد فرقے تھے تو اہل کتاب سے پہلے " من " تبعیضیہ کا ذکر کیا یعنی اہل کتاب میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رہے مشرکین تو ان کی ایک ہی قسم تھی اور وہ سب کافر تھے۔

یہاں بینہ سے کیا مراد ہے؟ اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں جیسا کہ البینہ کی دوسری آیت میں فرمایا وہ اللہ کی طرف سے رسول ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو بینہ اس لیے فرمایا ہے کہ حق اور باطل کو آپ نے ہی بیان فرمایا ہے اور دنیا اور آخرت کی ہر اہم چیز آپ ﷺ نے بیان فرمائی اور اپنی نبوت اور اسلام کی صداقت پر آپ نے ہی معجزات پیش کئے، سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، اس کو بھی آپ نے پڑھ کر سنایا، سو اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپ کی نبوت پر حجت قاطعہ اور واضح دلیل آپ کی ذاتِ گرامی ہے، اس لئے ان دونوں آیتوں کا معنیٰ یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جن بعض لوگوں نے کفر کیا، وہ اور مشرکین اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، حتیٰ کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ آجائیں اور آپ ﷺ ان پر قرآن مجید کی تلاوت کریں، جس میں معتدل احکام ہیں اور اہل کتاب میں اسی وقت تفرقہ ہوا، جب

آپ مبعوث ہو گئے، ان میں سے بعض آپ پر ایمان لے آئے اور ان میں سے بعض نے عناداً آپ کا انکار کیا اور کافر ہو گئے۔

اس آیت کا دوسرا محمل یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض کفار اور مشرکین دنیا سے اس وقت تک نکلنے والے نہیں جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آجائے اور واضح دلیل سے مراد یہ ہے کہ موت کے وقت ان کو عذاب کے فرشتے دکھائے جائیں گے اور وہ عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور اس وقت دنیا سے نکل جائیں گے۔ (تفسیر ماتریدی بحوالہ تبیان القرآن)

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفاً مُّطَهَّرَةً الخ: اور وہ رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے، جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں، ان میں سچی خبریں اور معتدل امور ہیں، جو راہ حق کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں یتلو، تلاوت سے مشتق ہے جس کے معنیٰ پڑھنے کے ہیں، مگر ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا بلکہ وہ پڑھنا جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو اس کو تلاوت کہتے ہیں اسی لئے عرف میں عموماً لفظ تلاوت صرف قرآن پڑھنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

صحف صحیفہ کی جمع ہے جن کاغذات میں کوئی مضمون تحریر ہو ان کو صحیفہ کہتے ہیں، کتب، کتاب کی جمع ہے اس کے ایک معنی تو لکھی ہوئی چیز کے ہیں اس اعتبار سے کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنیٰ لفظ ہیں اور کبھی لفظ کتاب بمعنیٰ حکم بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیت **لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ** میں لفظ کتاب بمعنیٰ حکم ہی مستعمل ہوا ہے، اس جگہ بھی یہی دوسرے معنیٰ مراد ہیں کیونکہ معروف معنی میں لیں تو کتب عین صحف ہیں، فیہا کہنے کے کوئی معنیٰ نہیں رہتے۔

مُّطَهَّرَةٌ یہ **صُحُفٌ** کی صفت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ اور شک اور نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں، قیمہ بمعنیٰ مستقیمہ کتب کی صفت ہے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ احکام مستقیم منصفانہ و معتدل ہیں اور اس کے معنیٰ مضبوط و مستحکم کے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ احکام الٰہیہ جو قرآن میں آئے قیامت تک قائم دائم رہیں گے۔

مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اس زمانے کے مشرکین اور اہل کتاب کی گمراہی اس درجے میں پہنچی ہوئی تھی کہ ان کو اپنے عقائد باطلہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا جب تک کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانی اور حجت واضحہ نہ آجائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے اپنے رسول ﷺ کو حجت واضحہ بنا کر بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ وہ ان کو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے تھے، مراد یہ ہے کہ وحی خداوندی کے وہ احکام سناتے تھے جو بعد میں صحیفوں کے ذریعہ محفوظ کئے گئے کیونکہ ابتداً تلاوت میں رسول اللہ ﷺ کسی صحیفے سے نہیں بلکہ اپنی یاد سے پڑھ کر سناتے تھے اور یہ پاک صحیفے ایسے ہیں جن میں ایسے اَحکام الٰہیہ ہیں جو عدل واعتدال کے ساتھ دیئے گئے ہیں اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ (معارف)

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ، الخ: اہل کتاب میں سے یہود ونصاریٰ نے نبی کریم ﷺ کے رسول برحق ہونے میں اختلاف نہیں کیا، اس لیے کہ وہ آپ ﷺ کی تعریف وستائش اپنی کتابوں میں دیکھتے تھے، مگر جب ان پر یہ چیز واضح ہو گئی اور روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا وعدہ تورات اور انجیل میں کیا گیا تھا، یہ لوگ آپ ﷺ کی صحت نبوت پر متفق تھے، جب آپ ﷺ مبعوث کیے گئے تو ان لوگوں نے آپ ﷺ کا انکار کر دیا اور تفرقہ ڈال دیا۔

قطب شہید اس آیت کے ذیل میں اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں پہلا اختلاف تو یہودیوں کے درمیان ہوا، یہ اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل ہوا، یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور کئی فرقے اور پارٹیاں بن گئے، حالانکہ ان کا رسول علیہ السلام ایک تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب بھی ایک تھی، یعنی تورات، یہ پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، مثلاً صدوتی، فریسی، آسین غالی اور سامری، ان فرقوں میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے عقائد، خصائص اور اپنا اپنا رخ تھا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو یہودی اور عیسائی تنازعہ شروع ہو گیا، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی تھے اور آپ نے تورات کی تصدیق فرمائی۔

یہودی اور مسیحی اختلافات اس قدر بڑھے کہ یہ دشمنی اور عداوت کی شکل اختیار کر گئے اور دونوں فریقوں کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں جو قتل عام ہوتا رہا ہے وہ

تاریخ کا حصہ ہے، یہ ایسا قتل عام تھا کو جب انسان ان واقعات کو آج بھی پڑھتا ہے تو رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت اور منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔

۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا، شہنشاہ موت اس نے اس کی سرکوبی کے لئے مشہور فوجی افسر بنوسوس کو بھیجا، اس نے پوری پوری آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سینکڑوں کو دریا میں غرق کر کے آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص ۴۷)

مقریزی کی کتاب الخطط میں ہے، ایک رومی شہنشاہ کے زمانے میں ایران کے شہنشاہ کسریٰ نے شام اور مصر پر فوج کشی کی، اس فوج نے بیت المقدس، فلسطین اور شاک کے گرجاؤں کو مسمار کیا اور شام کے تمام عیسائیوں کو قتل کر دیا، پھر وہ عیسائیوں کی تلاش میں مصر آیا، جہاں اس کی فوج نے عیسائیوں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا اور بے حد وحساب افراد کو قید کر لیا۔

عیسائیوں کے خلاف اس جنگ میں اور گرجاؤں کو مسمار کرنے میں یہودیوں نے ایرانیوں کی مدد کی اور وہ طربیہ، جبل، الجلیل، قریہ، ناصرہ، صور اور بلاد قدس سے ایرانیوں کے پاس آئے اور انہوں نے عیسائیوں سے خوب انتقام لیا اور انہیں اذیت رسانی اور قتل وغارت گری کا نشانہ بنایا، قدس میں ان کے دو گرجاؤں کو مسمار کر دیا اور تمام مکانات کو جلا کر خاکستر کر دیا، مقدس عود صلیب کا ٹکڑا ساتھ لے گئے اور قدس کے پوپ اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر لیا۔

یہی مصنف قدس مفتوح ہونے کا ذکر یوں کرتا ہے: اس اثنا میں یہودیوں نے صور کے شہر میں بغاوت کر دی، انہوں نے اپنے نمائندوں کو دوسرے شہروں میں بھیجا، چنانچہ یہودیوں نے عیسائیوں پر شدید حملہ کرنے اور انہیں قتل کر ڈالنے کے عہد وپیماں کیے، اس کے بعد دونوں فریقوں میں جنگ

چھڑ گئی، یہودی بیس ہزار کی تعداد میں مجتمع ہو کر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے صور کے باہر کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا، اس پر عیسائیوں نے کثیر تعداد میں جمع ہو کر یہودیوں پر حملہ کیا، یہودیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کی بہت بڑی تعداد مقتول ہوئی، اس زمانے میں ہرقل قسطنطنیہ میں روم فرماں روا ہوا، اس نے ایک تدبیر سے جو اس نے شاہ ایران کے خلاف کی ایرانیوں کو شکست دے دی اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

اس فتح کے بعد ہرقل قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تاکہ شام اور مصر کا نظم حکومت درست کرے اور ایرانیوں نے جن مقامات کو تباہ و برباد کیا ہے، ان کی تعمیر نو کرے، یہودی طربیہ سے آکر ہرقل کے پاس حاضر ہوئے، اس کو گراں قدر تحفے دیئے اور اس سے حلفیہ امان طلب کی، ہرقل نے انہیں حلفیہ امان دے دی، اس کے بعد ہرقل بیت المقدس پہنچا، عیسائیوں نے انجیلوں، صلیبوں، بخور اور جلتی ہوئی مشعلوں سے اس کا استقبال کیا، ہرقل نے شہر اور اس کے گرجاؤں کو برباد پایا، جس سے اسے شدید صدمہ ہوا۔

عیسائیوں نے ہرقل کو بتایا کہ کس طرح یہودی ایرانیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے خلاف حملہ آور ہوئے، انہیں قتل کیا اور ان کے گرجاؤں کو مسمار کیا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قتل وغارت گری میں وہ ایرانیوں سے بھی بدتر تھے اور انہوں نے عیسائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کمی نہ کی، عیسائیوں نے ہرقل کو ابھارا کہ وہ یہودیوں کی بیخ کنی کرے اور اس کے اچھے پہلو اس کے سامنے واضح کرے۔

ہرقل نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ وہ انہیں امان دے چکا ہے اور اس نے ان سے حلفیہ وعدہ کیا ہے، عیسائیوں کے پادریوں، پوپوں اور مشائخ نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں کو قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرقل سے یہ امان دھوکہ دے کر حاصل کی ہے، اس لئے کہ ہرقل کو یہ نہیں بتایا گیا کہ عیسائیوں پر کیا کیا مظالم ہوئے۔

انہوں نے کہا وہ ہرقل کے کفارے کے طور پر یہ سال ایک جمعہ کو روزہ رکھا کریں گے، یہ روزہ

لازمی ہو گا اور تمام عیسائیوں کو اس کا پابند بنائیں گے، تب ہرقل نے ان کی بات مان لی اور یہودیوں پر شدید حملہ کیا اور انہیں نیست ونابود کر دیا، چنانچہ مصر وشام کی رومی سلطنت میں کوئی یہودی زندہ نہ بچا، سوائے ان کے جو بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں یہود ونصاریٰ سنگدل، انسانی خون بہانے کی ہوس اور دشمن کو تباہ کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اس معاملے میں یہ کسی حد پر جا کر نہیں رکتے (ماذا خسر العالم استاذ ندوی ص ۹)

اس کے بعد عیسائیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے، حالانکہ ان کی کتاب بھی ایک تھی، نبی بھی ایک تھا، سب سے پہلے ان کے اختلافات بنیادی عقائد میں پیدا ہوئے، اس کے بعد وہ فرقے فرقے بن گئے، یہ فرقے ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے، ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے، حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اور ماہیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے کہ ان کی ماہیت لاہوتی ہے یا ناسوتی؟ پھر ان کی ماں کی ماہیت کے بارے میں اختلافات رونما ہوئے، پھر ٹرینٹی یعنی تثلیث کے مسئلہ پر اختلافات ہوئے، ان کے خیال میں خدا تینوں کا ایک تھا، قرآن کریم نے ان کے ان عقائد کو نقل کر کے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہو گئے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ {۷۲} یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح ابن مریم ہیں۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ {مائدہ:۷۳} یقیناً وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ {مائدہ:۱۱۶} اور اس بات کو یاد کرو جب اللہ قیامت کے دن عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے کہے گا، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنالو۔

ان اختلافات کے نتیجے میں وہ شدید ترین تنازعہ پیدا ہوا جو شام کے عیسائیوں اور روم اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان پیدا ہوا، اس کا ایک فریق روم اور شام کے ملکانی عیسائی تھے اور دوسرا فریق مصر

کا منوفنشی فرقہ تھا، ملکانی عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت کے جو اجزاء ہیں ایک ملکوتی اور دسرا ناسوتی جبکہ مصر کے منوفینشی عیسائی کہتے تھے کہ ان کی ایک ہی فطرت ہے جو اس طرح فنا ہو گئی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی میں یہ اختلاف ان دو فرقوں کے درمیان بہت شدت اختیار کر گیا اور یوں نظر آنے لگا کہ یہ دو فرقے نہیں بلکہ دو الگ الگ دین و مذہب ہیں، جس طرح یہودی اور عیسائی دو الگ الگ اہل مذہب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ابوالحسن علی ندوی)

۶۲۸ء میں ہرقل نے ایرانیوں پر فتح پائی، اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے باہم برسرپیکار اور متحارب مسلکوں کو جمع کرنے اور ان کے اندر موافقت اور مصالحت پیدا کرنے کی سعی کی، فیصلہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت مسیح کی فطرت کے موضوع پر بحث کرنے سے پرہیز کریں کہ ان کی فطرت ایک تھی یا دو تھیں، وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ کا ارادہ اور فیصلہ ایک ہی ہے۔

۶۳۱ء کے اوائل میں یہ بات طے ہو گئی کہ [illegible] مذہب ہی حکومت اور کلیسا دونوں کا سرکاری مذہب ہو گا، ہرقل نے مختلف فرقوں کو ختم کر کے ایک مسلک پر ہونے کی سعی کی اور اس کے لئے ہر حربہ استعمال کیا، مگر مصر کے قبطیوں نے اس بدعت اور تحریف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور شدید مخالفت کی اور اپنے پرانے عقیدے کو جاری رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔

یہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، ہرقل نے دوبارہ مختلف فرقوں کو ایک کرنے کی کوشش کی، اس نے اس بات پر زور دیا کہ لوگ صرف اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کا ارادہ ایک ہے، رہا یہ کہ اللہ کا ارادہ نافذ کس طرح ہوتا ہے، اس پر بحث نہ کی جائے، اس نے حکم دیا کہ اس موضوع پر کوئی مناظرہ نہ کیا جائے، ایک سرکاری پیغام مرتب کر کے مشرق کے اطراف واکناف میں پھیلایا، اس سے بھی مصر کا مذہبی طوفان نہ رک سکا، اس پر اسے غصہ آیا اور دس سال تک وہ مصر کے لوگوں پر شدید ترین ظلم اور ستم کرتا رہا، اس نے جو مظالم کیے ان کی روئیداد پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لوگوں کو

اذیت ناک سزا دی جاتی، پھر انہیں دریا میں غرق کر دیا جاتا، مشعل جلا کر ان کے جسموں پر بچھائی جاتی، یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر زمین پر گرتی، ریت کے بوروں میں قیدیوں کو بند کر کے دریا برد کر دیا جاتا اور اس طرح کی دوسری لرزہ خیز سزائیں دی جاتیں۔ (ماذا اخسر العالم ابوالحسن ندوی، ص ۳ تا ۵) اہل کتاب کے درمیان یہ اختلافات اور یہ عداوتیں اس کے بعد تھیں کہ ان کے پاس دلائل آچکے تھے۔

إِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَةُ: لیکن یہ علم اور یہ دلائل ان کے لئے مفید نہ تھے، خواہش نفس اور گمراہی ان کو حق سے دور کرتی چلی جارہی تھی، حالانکہ دین اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بالکل واضح تھا اور دینی عقائد بالکل واضح اور صاف تھے۔

وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ: ان لوگوں کو تمام شریعتوں میں اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اکیلے اللہ ہی کی بندگی بجالائیں، اسی کی عبادت کا قصد کرتے ہوئے، شرک سے ایمان کی طرف میلان رکھتے ہوئے، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، بس یہ کام کریں تو یہی توسیدھا دین ہے، یہی اسلام ہے۔

مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو پروگرام پیش کیا، وہ ملت ابراہیمی کا پروگرام ہے اور اس پروگرام کی بنیادی بات یہ ہے کہ خالص اللہ کی عبادت کی جائے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ غلامی صرف اللہ تعالیٰ کی اختیار کرو کسی دوسرے کی غلامی روا نہیں۔ غلامی عبادت ہی کا دوسرا نام ہے جو صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔

امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اخلاص فی العبادت اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب انسان کا عقیدہ شرک سے پاک ہو، اگر عقیدے میں شرک کی ملاوٹ ہوگی تو عبادت خالص نہیں ہوگی، شرک سے پاکیزگی ضروری رہے، مخلصین لہ الدین کا یہی مطلب ہے۔ (معالم العرفان)

حُنَفَآءَ: سے مراد ہے تمام دوسرے دینوں کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل ہونے والے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے، حنفاء سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر، ایک قول یہ کیا گیا ہے حنیف سے مراد ہے جو ختنہ کرائے اور حج کرے، اہل لغت کہتے ہیں، تحنف الی الاسلام کا معنی ہے وہ

اسلام کی طرف مائل ہو گیا۔ (تفسیر قرطبی)

وَذَالِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ: یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے، یعنی انسانی ضمیر و شعور میں عقیدہ خالص ہو۔ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی ہو، جو اس عقیدے پر مبنی ہو، اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے، یعنی زکوٰۃ دی جائے۔ جس شخص نے بھی ان اصولوں کو حقیقت کا روپ دے دیا تو اس کا ایمان قائم ہو گیا، جس طرح اہل کتاب کو اس کا حکم دیا گیا تھا اور جس طرح اللہ کے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا گیا تھا اور تمام رسولوں اور امتوں کا دین دراصل ایک ہے، عقیدہ ایک ہے، جس پر تمام رسولوں کا اجماع رہا ہے اور اس عقیدے اور عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں افتراق واختلاف کی کوئی جگہ نہیں ہے، یہ بے حد صاف ستھرا، سادہ اور آسان ہے، لہٰذا اہل کتاب کے ہاں زیر بحث اور زیر جدال عقائد کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، نہ اللہ کے دین میں وہ چیزیں ہیں۔

ان لوگوں کے پاس اس سے قبل ان کے رسولوں کے ذریعہ بھی دلائل آگئے تھے، اس کے بعد پھر حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ بھی یہ دلائل آگئے تھے جو پاکیزہ صحیفے پڑھتے ہیں اور ان کے سامنے ایسے عقائد پیش کرتے ہیں جو واضح، سادہ اور آسان ہے لہٰذا صحیح راستہ واضح ہو گیا اور جو لوگ کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔ ان کا انجام بھی واضح ہو گیا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ: یہود و نصاریٰ اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان کی سزا اور عقاب دوزخ کی آگ ہے جس میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، یہ اللہ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں۔

فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا: جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکوں میں سے، یہودی ہوں یا نصاریٰ، عرب کے مشرک ہوں یا کسی دوسرے علاقے کے مشرک **فِي نَارِ جَهَنَّمَ** ان کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے اور وہاں کسی خاص عرصہ کے لئے داخل نہیں کئے جائیں گے بلکہ **خَالِدِينَ فِيهَا** ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہیں گے۔ (معالم العرفان)

أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ: وہ خدا کی مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہیں انہی لوگوں کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِ عِندَ اللّٰهِ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین جانور ہیں، بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے بدترین مخلوق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم پر مقدم رکھتے ہیں، ان میں حسد، خود غرضی اور سرکشی پائی جاتی ہے، یہ لوگ لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ کی کوئی پروا نہیں کرتے، ادھر حکم ہو رہا ہے کہ حنیف بن جاؤ، مگر یہ اپنی خواہشات کو اس حکم پر مقدم رکھتے ہیں حالانکہ کوئی جانور یا موذی درندہ بھی خواہش نفسانی کو حکم الٰہی پر مقدم نہیں رکھتا، لہٰذا یہ انسان ہوتے ہوئے بھی دیگر مخلوق سے بدتر ہیں۔ (معالم العرفان)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ: ایمان والے اور ایمان کے بعد نیک اعمال بجالانے والے لوگ بہت ہی خوش نصیب ہیں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کو سچا جانا اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور نیک کام کیے یہ بہترین مخلوق ہے۔

جَزَآؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ: ان کا بدلہ قیامت کے دن ان کے پروردگار کے پاس ہے، جو کہ جنت کی صورت میں انہیں ملے گا ان کی رہائش اور مستقر و منتہیٰ بہت ہی اچھا ہے، ان جنتوں میں ان کے محلات کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی، یہ لوگ ہمیشہ ان جنتوں میں رہیں گے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ: ان لوگوں کی سعادت مندی یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور ان کے نیک اعمال شرف قبولیت پا گئے اور یہ لوگ بھی اللہ کے وعدوں، انواع و اقسام کے اکرام و اعزازات پر اللہ سے راضی اور خوش ہیں، یہ جزا اور بدلہ ان لوگوں کے لیے ہو گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائیں گے کہ اے جنت والو! وہ کہیں گے کہ اے رب! ہم حاضر ہیں اور فرمانبرداری کے لیے

موجود ہیں اور ساری خیر آپ ہی کے قبضے میں ہے پھر ان سے اللہ تعالیٰ کا سوال ہو گا کیا تم راضی ہو گئے ؟وہ عرض کریں گے کہ اے رب! ہم کیوں راضی نہ ہوں گے آپ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی کو بھی نہیں دیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہو گا کیا میں تمہیں اس سے افضل عطا نہ کر دوں، وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار! اس سے افضل اور کیا چیز ہو گی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہو گا کہ خبر دار میں تم پر ہمیشہ کے لیے اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں، اس کے بعد کبھی ناراض نہ ہوں گا۔ (بخاری)

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ: طاعت وعبادت میں خوف اچھی حالت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ (الْمُؤْمِنُونَ: ٦٠) یہ ہو سکتا ہے کہ خشیت خوف سے زیادہ شدید ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کی صفات میں اشفاق کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے جو کہ خوف سے زیادہ شدید ہے، فرمایا هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ (المؤمنون: ٥٧) خشیت اس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن یا درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی انتہائی عظمت وجلال کی وجہ سے پیدا ہو جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کام ہر حال میں اس کی رضا جوئی کی فکر کرتا ہے اور ناراضی کے شبہ سے بھی بچتا ہے یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔ (معارف القرآن)

اس آیت کے ساتھ اگر دوسری آیت کو بھی ملا لیا جائے تو ان دونوں آیات کا مجموعہ علم اور علماء کی فضیلت پر دلالت کرے گا، وہ آیت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے علماء کی شان بیان فرمائی ہے إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فَاطِرٍ: ٢٨) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عالم ہی خشیت والا ہوتا ہے، اللہ سے ڈرتا ہے۔ اور یہاں جو آیت ہے کہ یہ اس شخص کے لیے جو اپنے رب سے ڈرا، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صاحب خشیت کے لیے جنت ہے، ان دونوں آیات کے مجموعہ سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جنت علماء کا حق ہے۔

اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے انسان اس بات پر مطمئن نہ ہو جائے کہ اسے تو جنت مل ہی جائے گی لہذا اب خوف وخشیت کی ضرورت نہیں، بلکہ انبیاء کرام کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اس علم کے

باوجود کہ وہ جنت والے ہیں اللہ کے بندوں میں اللہ سے بہت زیادہ خوف وخشیت رکھتے ہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ أَعْرَفُكُمْ بِاللهِ أَخْوَفُكُمْ مِنَ اللهِ، وَأَنَا أَخْوَفُكُمْ مِنْهُ، میں تم سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتے ہوئے تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ میں اللہ کا خوف رکھتا ہوں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے گناہوں اور معاصی سے اجتناب کریں گے۔

الحمد للہ آج سورۃ القیمہ کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۶ مئی ۲۰۲۰ء ۱۲ بروز بدھ بوقت ساڑھے پانچ بجے بعد الفجر (رمضان ۱۴۴۱ھ)

☆☆☆☆

الزلزلہ

قیامت، زمین، انسان، اعمال

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۱﴾ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿۲﴾ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ الزلزلة.

جواب ترجمہ: جب زمین ہلائی جائے گی جیسے کہ ہلائی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟ اس دن زمین اپنی ساری خبریں بتادے گی۔ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اسے یہی حکم دیا ہو گا۔ اس روز لوگ مختلف ٹولیوں میں واپس ہوں گے، تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھا دیے جائیں۔ چنانچہ جس نے ذرہ برابر کوئی اچھائی کی ہو گی وہ اسے دیکھے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی کی ہو گی، وہ اسے دیکھے گا۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا: جب زمین میں بھونچال آجائے گا، جب وہ جھنجھوڑی جائے گی، جب اللہ تعالیٰ سورۃ البینہ میں اہل ایمان کے بارے میں فرما چکے کہ ان کی جزا اور بدلہ ان کے رب کے پاس ہے تو ایک مکلف شخص کے ذہن میں سوال ابھرنا لازمی تھا کہ کہاں یہ صلہ اور اجر ملے گا؟ تو یہاں وضاحت کی جارہی ہے کہ اللہ کے ہاں سے اہل ایمان اور اہل خیر کو جزائے خیر اس وقت ملے گی جب یہ نظام ہستی ختم ہو جائے گا، زمین ہلادی جائے گی، اس پر بھونچال آجائے گا، یہ موجودہ نقشے مٹ جائیں گے، صورِ اسرافیل پھونکا جائے گا، سارے جہان کے لوگ مبتلائے خوف ہوں گے، مگر اہل ایمان اس وقت اپنے نیک اعمال کی جزا و بدلہ لے رہے ہوں گے اور ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ ہوں گے۔ جیسے قرآن کریم کی سورۃ النمل میں ارشاد ہے **قَالَ: وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ آمِنُونَ (النَّمْلِ ۸۹)**

پھر اللہ نے سورۃ البینہ میں کافروں کے لیے وعید بیان فرمائی اور اہل ایمان کے لیے جزائے خیر کا وعدہ، تو یہاں اللہ نے چاہا کہ کافروں کے لیے وعید میں اضافہ کیا جائے۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر کفار کی طرف سے سوال نقل کیے گئے، جن میں وہ رحمت کائنات ﷺ سے پوچھتے تھے کہ ہمیں بتایئے قیامت کب آئے گی؟ تو نبی کریم ﷺ انہیں بتاتے تھے کہ قیامت کا وقت اللہ ہی جانتا ہے، یہاں ایک باریک اشارے میں ان کافروں کے اس سوال کا جواب دیا گیا کہ قیامت اس وقت برپا ہو جائے گی جب زمین پر بھونچال طاری کیا جائے گا، جب زمین جھنجھوڑی جائے گی، جب زمین ہلائی جائے گی تو وہی قیامت کا دن ہو گا، گویا کہ قیامت کے وقت کی تعیین اللہ نے بھی نہیں بیان فرمائی مگر علامات قیامت کی تعیین فرمادی۔

اللہ تعالیٰ ایک مکلف انسان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین بروز محشر باتیں کرے گی اور گواہی دے گی اگرچہ وہ جماد ہے، تو بتایا جارہا ہے کہ یہ کب ہو گا جب زمین پر زلزلہ برپا کردیا جائے گا، ہلادی جائے گی۔

لفظ زِلزال اور زَلزال مصدر ہے، اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو سخت ترین حرکت دینا، سورۃ الواقعہ میں اس کی تعبیر ان الفاظ کے ساتھ فرمائی گئی ہے إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا (الْوَاقِعَةِ: ۴)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زلّ عام حرکت کو کہتے ہیں جب کہ زَلزَلَ بڑی اور شدید حرکت کو کہا جاتا ہے، جس میں تکرار پایا جائے، جس طرح ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، اسی لیے زمین جس انداز میں ہلائی جائے گی وہ تھرتھرائے گی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا، اسی لیے سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے زلزلہ کو عظیم شے کے الفاظ سے ذکر فرمایا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس زلزلہ کا ذکر ہے وہ پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہو گا، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (النَّازِعَاتِ:٦) یعنی پہلی بار صور پھونکنے سے یہ زلزلہ برپا ہو گا، پھر جب دوسری صور پھونکا جائے گا تو زمین اپنے اندر کے مردوں کو باہر نکال لائے گی، اسی کے لیے فرمایا کہ وہ اثقال یعنی بوجھ باہر نکالے گی، بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ دوسری بار صور پھونکنے کے وقت ہو گا۔

وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا: الاَثقال ثقل کی جمع ہے، ثقل گھر کے سازوسامان کو کہا جاتا ہے، جیسے سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایاوَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ (النَّحْلِ: ۷) توزمین کے اندر جو خزانے اور جو دفینے ہیں انہیں یہاں اثقال کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔

ابو عبیدہ اور اخفش کہتے ہیں کہ جب میت زمین کے اندر ہوتی ہے تو وہ زمین کے لیے بوجھ ہوتی ہے، جب کہ وہی میت زمین کے اوپر ہو تو وہ زمین کے اوپر بوجھ ہوتی ہے، اسی لیے جن اور انس کو ثقلین کہا گیا ہے، کیونکہ زمین ان دونوں مخلوقات کے باعث بوجھل ہوتی ہے جب یہ زمین کے اندر ہوں اور یہ دونوں مخلوقات زمین کے اوپر بوجھ بن جاتی ہیں جب زمین کے اوپر ہوں۔

زمین اپنے بوجھ نکال باہر کرے گی سے مراد یہ ہے کہ زمین اپنے خزانے باہر انڈیلے گی، جس سے زمین کی پشت سونے کے ڈھیروں سے بھر جائے گی، کوئی بھی سونے کے ان ڈھیروں کی طرف توجہ نہیں کرے، گویا سونا چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو گا کیا تو نے میرے لیے اپنے دین اور اپنی دنیا کو خراب کیا تھا؟

جو حضرات فرماتے ہیں کہ یہ زلزلہ دوسری بار صور پھونکنے کے بعد ہو گا، تو وہ فرماتے ہیں کہ زمین اپنے بوجھ باہر نکالے گی کا مطلب یہ ہے کہ زمین مردوں کو زندہ کر کے نکالے گی جس طرح ماں بچے کو زندہ جنتی ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ زمین مردے کو باہر نکال کر پھینکے گی جس طرح اسے دفن کیا گیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کریں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ زمین کے بوجھوں سے یہاں مراد زمین کے راز اور بھید ہیں جو اس دن کھول دیے جائیں گے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا: پھر یہ زمین انسان کے حق میں یا انسان کے خلاف گواہی دے گی۔ تو اس کے اندر جو کچھ ہو گا وہ باذن خداوندی سب کچھ باہر نکال دے گی، مردے اور خزانے سب باہر نکالے گی۔

وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا: انسان مارے خوف کے اس بارے میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے، کہ اس زمین کو کیا ہو گیا؟ اس قدر شدید لرزائی اور تھرائی ہے اور اپنے اندر جو کچھ تھا اسے باہر نکال پھینکا ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہو گا جب زمین اپنے خزائن

ودفائن کو باہر پھینکے گی یا پھر دوسری بار صور پھونکنے کے وقت ہو گا جب زمین اپنے اندر سے میتوں کو نکال باہر پھینکے گی۔

یہاں انسان سے پہلے قال فرمایا جو یقول کے معنیٰ میں ہے، کہ انسان کہے گا، پوچھے گا، تو اس کا قائل کون ہو گا؟ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ کافر کا قول ہے جیسے دوسرے مقام پر قرآن کریم میں کافروں کی یہ بات نقل کی گئی ہے کہ مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا (یس: ۵۲) ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا؟ مومن آدمی تو یوں کہے گا کہ یہ ہمارے پروردگار کا وعدہ ہے اور اللہ کے فرستادہ رسولوں نے سچ ہی کہا تھا، جیسے سورۃ یٰسٓ میں ارشاد ہے هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ (یس: ۵۲)

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس قول کا قائل عام ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر ہو، یعنی ناشکرا ،لڑاکو، ظالم انسان کہے گا کیونکہ غفلت اور جہالت اس کی گھٹی میں گویا پڑی ہوئی تھی، وہ اپنی اسی غفلت اور جہالت میں یہ پوچھے گا، حالانکہ یہ کوئی سوال نہیں ہو گا بلکہ اظہار تعجب اور حیرت ہو گا، کیونکہ وہ ایسے ایسے عجائب وغرائب اپنی آنکھوں سے دیکھے گا جن کے بارے میں اس کے کانوں نے کبھی سنا نہیں ہو گا اور اس کی زبان پر اس منظر کی ہولناکی بارے کبھی الفاظ نہیں آئے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر اور فاجر دونوں ہی لوگ یہ کہیں گے۔ کہنے والا جو بھی یہ الفاظ کہے گا وہ اپنے ہی کو ملامت کر رہا ہو گا گویا وہ یوں اپنے آپ کو مخاطب کرے گا کہ اے نفس! زمین نے یہ کیا کر دیا ہے؟ تو ہی اس کا سبب ہے اگر تیرے معاصی اور گناہ نہ ہوتے تو زمین ایسا نہ کرتی، اسی طرح کفار بھی کہیں گے اور اہل ایمان وہاں بھی یوں عرض کریں گے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ (فَاطِرٍ: ۳۴) ثناء اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے غم وحزن دور کیا۔

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا: بروز محشر زمین پر کیے جانے والے ہر اچھے برے عمل کی خبر زمین دے گی، زمین مخلوق کو اس کی خبریں بتائے گی، اس کے عمل کی جزا اور بدلہ کیا ہے زمین اس سے اسے آگاہ کرے گی، انسان جب کہیں کھنڈرات سے گزرتا ہے تو وہ کھنڈرات زبان حال سے اسے بتاتے ہیں کہ

یہاں کبھی کوئی آباد تھا، بے آباد بستیاں زبان حال سے پکارتی ہیں کہ یہاں کوئی رہائش پذیر تھا، زمین پر زلزلہ بپا ہو گا تو وہ زبان حال سے بولے گی کہ دنیا اب اِختتام پذیر ہو چکی ہے، دنیا اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے، آخرت کی آمد آمد ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس زمین کو حیوانِ عاقل ناطق بنائیں گے، پھر یہ اس زمین والے لوگوں کو بتائے گی کہ وہ اس کی پشت پر کیا کیا عمل کرتے رہے، وہ اطاعت گزاروں کی سجدہ ریزیوں کا ذکر کرے گی، وہ تابعداروں کی فرمانبرداری کے بارے بتائے گی، وہ گناہ گاروں کی نافرمانیوں اور گناہوں کے راز طشت از بام کرے گی، وہ بدکاروں کی بدکاریوں کا بھانڈا پھوڑے گی، وہ زانیوں کی شب ہائے رنگین سے پردے سرکائے گی، وہ کوئی چیز پردہ خفا میں نہیں رکھے گی، کسی کا کسی بناء پر لحاظ اور خیال نہیں کرے گی۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِنَّ الْأَرْضَ لَتُخْبِرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِكُلِّ عَمَلٍ عُمِلَ عَلَيْهَا (کبیر) بے شک بروز محشر زمین ہر اس کام کے بارے میں خبر دے گی جو اس پر کیا گیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کی یہ آیت تلاوت فرمائی، اور اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ زمین کو قوت گویائی عطا فرمائے اور زمین بولے، خبریں عام کرے، نافرمانوں سے شکوہ و شکایت کرے اور اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والوں کا شکریہ ادا کرے، اور کہے کہ فلاں نے میری پشت پر نماز پڑھی تھی، فلاں نے میری پشت پر زکوٰۃ ادا کی تھی، فلاں نے روزہ رکھا تھا، فلاں نے مجھ پر حج کیا تھا، فلاں نے کفر کیا تھا، فلاں نے زنا کیا تھا، فلاں نے چوری کی تھی، فلاں نے ظلم کیا تھا، یہاں تک کہ کافر چاہے گا کہ اسے دوزخ کی طرف دھکیل دیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی اور اس کے بعد فرمایا أَتَدْرُونَ مَا أَخْبَارُهَا قَالُوا اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّ أَخْبَارَهَا أَنْ تَشْهَدَ عَلَى كُلِّ عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلَى ظَهْرِهَا. تَقُولُ عَمِلَ يَوْمَ كَذَا، كَذَا وَ كَذَا، کیا تم لوگ جانتے ہو کہ زمین کی خبریں دینا کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول اللہ ہی بہتر جانتے

ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین کی خبریں دینا یہ ہے کہ وہ ہر بندے اور بندی کے بارے میں وہ کچھ بتائے گی جو انہوں نے اس کی پشت پر کیا ہو گا، وہ کہے گی کہ اس نے فلاں فلاں دن یہ یہ یہ کیا تھا۔ (تفسیر قرطبی)

نبی کریم ﷺ نے زمین کے بارے میں ارشاد فرمایا تَحَفَّظُوا مِنَ الْأَرْضِ، فَإِنَّهَا أُمُّكُمْ، وَإِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَحَدٍ عَامِلٌ عَلَيْهَا خَيْرًا أَوْ شَرًّا، إِلَّا وَهِيَ مُخْبِرَةٌ (المعجم الکبیر، ابن کثیر) زمین سے بچو یہ تمہاری ماں ہے جو شخص جو نیکی بدی اس پر کرتا ہے یہ سب کھول کھول کر بیان کر دے گی۔

حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ بیت المال سے مستحقین کو دے کر فارغ ہو جاتے تو پھر دو رکعت نماز زمین پر ادا فرماتے اور فرماتے لَتَشْهَدَنَّ أَنِّي مَلَأْتُكَ بِحَقٍّ وَفَرَّغْتُكَ بِحَقٍّ (تفسیر کبیر للرازی) تاکہ تو گواہی دے کہ میں نے تجھے حق کے ساتھ آباد کیا اور حق کے ساتھ خالی کیا۔

کسی ذہن میں یہ اشکال نہ پیدا ہو کہ زمین جمادات میں سے ہے یہ کیونکر بولے گی، اس لیے کہ جس اللہ نے انسانی جسم کے گوشت کو بلوایا وہ جماد کو بھی بلوانے اور قوت گویائی دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

علامہ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مخلوق الٰہی میں سے ہر ایک چیز روح رکھتی ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ حیوانات کی روح بدن کی تدبیر و تصرف اور حس و ادراک اختیاری کا شرف رکھتی ہے بر خلاف اور اجسام کی روح کے کہ اس کا ادراک و حس محسوس نہیں مگر کبھی محسوس بھی ہو جایا کرتا ہے بطریق خرقِ عادت و معجزات کے اور اسی لیے بعض دفعہ پتھروں نے حضرت انبیاء علیہم السلام سے کلام کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو شروع نبوت کے وقت پتھر سلام کیا کرتے تھے اور ستون حنانہ حضرت ﷺ کی مفارقت میں رویا ہے اور اسی لیے ہر شے خدا کی تسبیح و تقدیس کیا کرتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ، اور نفوس ملکیہ کے حکماء بھی قائل ہیں اور قیامت کے روز جب ظہور کلی ہو گا ان چیزوں کی گویائی بھی سب کے نزدیک

محسوس ہو جاوے گی اور اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ زمین بھی گواہی دے گی انسان کے اعضاء بھی گواہی دیں گے اور حدیث میں آیا ہے کہ جہاں تک مؤذن کی آواز جاتی ہے وہاں کے حجر و شجر گواہی دیں گے۔ (تفسیر حقانی)

کس قدر قابل مبارک ہیں وہ لوگ جن کے لیے زمین شہادت دے گی کہ یہ شخص یہاں ذکر کرتا تھا، تلاوت کرتا تھا، نماز پڑھتا تھا، اس طرح اور بے شمار نیکی کے کاموں کی خبر دے گی اور ہلاکت، تباہی، بربادی اور ویل ہے ان لوگوں کے لیے جن کے خلاف زمین گواہی دے گی کہ اس نے میری پشت پر بدکاری کی تھی، زنا کیا تھا، شراب پی تھی، چوری کی تھی، سود خوری کی تھی، رشوت ستانی میں مبتلا ہوا تھا، غصب اور ڈکیتی کا مال کھایا تھا، میرے اوپر دوسروں کا حق پائمال کیا تھا اور فلاں فلاں برائی کا ارتکاب کیا تھا۔

انسان کے خلاف اللہ کے ہاں سات گواہ گواہی دیں گے ① مکان: جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ② زمان: زمانہ انسان کے خلاف گواہی دے گا، جیسے حدیث شریف میں ہے يُنَادِي كُلَّ يَوْمٍ: أَنَا يَوْمٌ جَدِيدٌ، وَأَنَا عَلَى مَا تَعْمَلُ فِيَّ شَهِيدٌ، دن روزانہ پکارتا ہے کہ میں نیا دن ہوں، جو کچھ تو میرے اندر کرتا ہے اس کا گواہ ہوں۔

③ زبان: انسانی زبان انسان کے خلاف گواہی دے گی، جیسے قرآن کریم میں ہے يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ اس دن ان کے خلاف ان کی زبانیں گواہی دیں گی۔

④ انسانی اعضاء کی گواہی: قیامت میں انسان کی زبان پر مہر لگادی جائے گی اور اس کے خلاف اس کے دوسرے اعضاء سے گواہی لی جائے گی اور دوسرے اعضاء اس کے خلاف بولیں گے، جیسے ارشاد ہے وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ بات کریں گے اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں۔

⑤ دو فرشتوں کی گواہی: انسان کی وہ دو فرشتے گواہی دیں گے جو اس کے کاندھوں پر مقرر کیے گئے ہیں اور وہ اس کی نیکی اور بدی تحریر کرتے ہیں، ارشاد ہے وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ

⑥ رجسٹروں کی گواہی: جن دیوانوں اور رجسٹروں میں انسانی اعمال درج کیے جاتے ہیں وہ اس انسان کے خلاف گواہی دیں گے، جیسے ارشاد ہے هَٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ، یہ ہے ہماری کتاب جو تمہارے خلاف سچ بولتی ہے۔

⑦ رحمان کی گواہی: رحمان کی اپنی گواہی اس انسان کے بارے میں کس قدر معتبر ہو گی، اللہ فرماتے ہیں إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا مگر ہم تمہارے اوپر گواہ تھے۔

انسان غور و فکر کرے، گناہ گار انسان سوچے کہ جب اس قدر گواہیاں وہاں گزریں گی تو پھر اس کو منہ اور سر چھپانے کی کون سی جگہ ملے گی، یہ ان گواہوں کی موجودگی میں کس طرح اپنی کو تاہ اعمالیوں اور بدکاریوں کو چھپا سکے گا۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والی تمام خبریں آشکار کر دے، اللہ کی طرف سے زمین کو حکم ملے گا کہ وہ اپنی حرکت تیز کر دے اور اپنے سکان کو خوب جھٹکے دے اور اپنے اندر کی چیزیں باہر پھینک دے اور یہ کام وہ رب کے حکم کی اطاعت میں کر رہی ہے۔

زمین کو سر تابی کی مجال نہیں ہے، دوسرے مقام پر زمین کی اطاعت گزاری کا یوں بیان ہے، فرمایا وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ اور وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گی اور اس کا حق یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے اس لیے زمین اپنے حالات بتائے گی، غرض یہ صورت حال اور یہ منظر اس بات کا خوب اظہار کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ کے احکام وارشادات کیا ہوں گے۔

اب یہاں حالات ایسے ہیں کہ انسان ششدر رہ گیا ہے، سورت کی گھن گرج اور زور دار بیان سے خوف و ہراس کی فضا ہے، ہر سو دہشت اور حیرانی کا دور دورہ ہے، اضطراب اور بھگدڑ ہے، ایسے حالات میں انسان کا سانس پھولا ہوا ہے اور وہ پوچھ رہا ہے کہ اسے کیا ہو گیا ہے اسے کیا ہو گیا ہے، ایسے حالات میں جواب ایک نئے منظر کی صورت میں آتا ہے، یہ ہے منظر حشر و نشر، حساب و کتاب اور میزان و جزاء کا ہے۔

تفسیر خازن میں اس آیت کے ذیل میں ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے قِيلَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَخْلُقُ فِي الْأَرْضِ الْحَيَاةَ، وَالْعَقْلَ، وَالنُّطْقَ حَتَّى تُخْبِرُ بِمَا أَمَرَ اللهُ بِهِ وَهٰذَا مَذْهَبُ أَهْلِ السُّنَّةِ (خازن) یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں حیات، عقل اور گویائی کی قوت پیدا کر دیں گے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم سے خبریں دے گی، یہ اہل سنت کا مذہب ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اَوْحٰی کا لفظ ہے، وحی سے مراد یا تو وحی اِلہام ہے یا وحی اِرسال ہے کہ اللہ تعالیٰ جبریل امین کے ذریعے زمین کو حکم دیں گے۔ عزبن عبد السلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زمین کی طرف اِلہام کریں گے اور وہ اللہ کے حکم کی اِطاعت کرے گی، یا اللہ اسے فرمائیں گے یا حکم دیں گے۔ شیخ عبد الکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمین جو اندر کی خبریں نکال باہر کرے گی، یہ اللہ کے حکم سے کرے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ: یہ ہولناک دن ہو گا، جب لوگ حساب کتاب سے فارغ ہو کر مختلف ٹولیوں کی شکل میں واپسی کی راہ لے رہے ہوں گے، یہ سب کچھ اس لیے ہو گا تاکہ رب تعالیٰ انسانوں کو ان کے اچھے اور برے عمل دکھائیں کہ انہوں نے دنیا میں کیا کیا کیا تھا؟ پھر اللہ انہیں بدلہ اور صلہ دے گا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَشْتَاتًا کا معنیٰ جماعتیں ہیں، یہ شت کی جمع ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے حساب کے میدان سے لوگ اٹھیں گے ایک فریق دائیں جانب کو اپنائے گا جو جنت کی طرف راستہ جائے گا، ایک جماعت بائیں جانب کو اپنائے گی جو جہنم کی طرف راستہ جاتا ہو گا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُونَ (الروم) يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُونَ (الروم) ایک قول یہ کیا گیا ہے: حساب سے فارغ ہونے کے بعد حساب سے لوٹیں گے۔

اَشْتَاتًا کا معنی ہے جماعتیں، اَعْمَالَهُمْ سے پہلے ثواب کا لفظ محذوف ہے یہ اس طرح ہے جس طرح نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، مَا مِنْ أَحَدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا وَيَلُومُ نَفْسَهُ، فَإِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَيَقُولُ: لِمَ لَا ازْدَدْتُ إِحْسَانًا؟ وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ

يَقُولُ: لِمَ لَا نَزَعْتُ عَنِ الْمَعَاصِي، قیامت کے روز ہر کوئی اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہو گا اگر وہ اچھائی کرنے والا ہو گا تو کہے گا، میں نے اچھائی زیادہ کیوں نہ کی؟ اگر معاملہ کوئی اور ہوا تو وہ کہے گا تو میں معاصی سے کیوں نہ بچا۔ یہ صورتحال ثواب اور عقاب کے معائنہ کے وقت ہو گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے أَشْتَاتًا مُّتَفَرِّقِينَ عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ أَهْلُ الْإِيمَانِ عَلَى حِدَةٍ، وَأَهْلُ كُلِّ دِينٍ عَلَى حِدَةٍ، لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف ہوں گے اہل ایمان علیحدہ ہوں گے اور ہر دین کے پیروکار علیحدہ ہوں گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ لوٹنا دوبارہ اٹھنے کے وقت ہو گا وہ قبروں سے گروہ در گروہ لوٹیں گے اور انہیں حساب کے میدان کی طرف لے جایا جائے گا تاکہ وہ اپنے اعمال اپنی کتابوں میں دیکھ سکیں یا اپنے اعمال کی جزا دیکھ سکیں، گویا وہ قبروں پر وارد ہوئے ان میں انہیں دفن کیا گیا پھر وہ ان سے لوٹے، وارد کا معنی آنے والا اور صادر کا معنی لوٹنے والا ہے، وہ زمین کے مختلف اطراف سے اٹھائے جائیں گے، پہلے قول کے مطابق اس میں تقدیم و تاخیر ہے، اس کی صورت یہ ہو گی، وہ اپنی خبریں بیان کرے گی کہ اس کے رب نے اس کی طرف اِلہام کیا تاکہ وہ اپنے اعمال دیکھیں درمیان میں یہ جملہ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا معترضہ ہے۔ یعنی وہ حساب کے میدان سے جدا جدا لوٹیں گے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اشتاتاً میں کئی وجوہ ہیں ایک یہ ہے کہ ان میں سے بعض موقف کی طرف سوار ہو کر جائیں گے، ان کے جسموں پر خوبصورت کپڑے ہوں گے، ان کے چہرے سفید ہوں گے، منادی ان کے آگے آواز لگائے گا هَٰذَا وَلِيُّ اللَّهِ یہ اللہ کا دوست ہے۔

اور دوسرے کالے چہروں، ننگے بدنوں، بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اور طوق پہنائے ہوئے لائے جائیں گے اور منادی ان کے آگے آواز دے گا کہ هَٰذَا عَدُوُّ اللَّهِ یہ اللہ کا دشمن ہے۔

دوسرا یہ کہ أَشْتَاتًا کا معنیٰ ہے ہر فریق اپنے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ ہو گا، یہودی یہودی کے ساتھ ہو گا، نصرانی نصرانی کے ساتھ ہو گا۔ تیسر أَشْتَاتًا سے مراد زمین کے ہر کنارے سے ٹولیوں اور جماعتوں کی شکل میں لوگ آئیں گے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان ٹولیوں کی آمد کا

مقصد بیان فرمایا تا کہ وہ اپنے اعمال دیکھ سکیں، بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کے صحیفے دیکھ سکیں اس لیے کہ تحریر انسان کے سامنے رکھ دی جائے گی، بعض کہتے کہ وہ اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے، وہ جنت ہے یا دوزخ ہے، یہاں عمل کا نام جزا کو دیا گیا کیونکہ جزا پوری پوری ملنی ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ: جس نے ایک چیونٹی جتنا بھی نیک عمل کیا ہو گا وہ اسے وہاں دیکھ لے گا، پھر نیک عمل کا اجر و ثواب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، مثقال ذرہ کا معنیٰ ہے ذرہ کے وزن برابر۔

کلبی کہتے ہیں کہ ذرہ سب سے چھوٹی چیونٹی کو کہا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب تو اپنی ہتھیلی کو زمین پر رکھ کر اوپر اٹھائے تو جو کچھ اس ہتھیلی کے ساتھ مٹی کے ذرات لگے ہیں انہیں مثقال ذرہ کہتے ہیں، تو جو شخص اچھائی یا برائی کا کوئی عمل تھوڑا ہو یا زیادہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے وہ عمل دکھا دیں گے۔

یہاں ایک اشکال ہے کہ کافر کی نیکیاں تو اس کے کفر کی وجہ سے ملیا میٹ اور تباہ ہو جاتی ہیں اور بندہ مومن کی برائیاں بخش دی جاتی ہیں، یا تو شروع میں ہی یا پھر بڑے گناہوں سے بچنے کی وجہ سے، تو پھر یہاں خیر و شر کی ذرہ بھر جزا کا کیا مطلب ہے؟

حضرات مفسرین کرام جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزا نے اس اشکال کے جوابات دیے ہیں، احمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ایک ذرہ برابر کوئی نیکی کا کام کیا درانحالیکہ وہ کافر تھا تو وہ اس نیکی کا ثواب دنیا میں دیکھ لے گا، جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو وہاں اس کو اس نیکی کا ثواب نہیں ملے گا، یہ بات حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ (الکبیر للرازی)

اس تاویل کی صحت پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان گرامی بھی دلالت کرتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ **يَا أَبَا بَكْرٍ مَا رَأَيْتَ فِي الدُّنْيَا مِمَّا تَكْرَهُ فَبِمَثَاقِيلِ ذَرِّ الشَّرِّ وَيَدَّخِرُ اللهُ لَكَ مَثَاقِيلَ الْخَيْرِ حَتَّى تُوَفَّاهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ** (جامع البیان) اے ابو بکر! دنیا میں آپ جس چیز کو ناپسندیدہ خیال کرتے ہیں چاہے وہ شر کا ایک مثقال ذرہ

ہی کیوں نہ ہو اللہ اسے آپ کے لیے مثقال خیر کی شکل میں ذخیرہ کردیں گے جو قیامت میں پورا پورا دیا جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کوئی مومن اور کوئی کافر جب کوئی نیک یا برا عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں وہ عمل دکھادے گا، مؤمن پر اللہ کا یہ فضل و کرم ہو گا کہ اس کی برائیاں معاف کر دی جائیں گی اور اس کی نیکیوں پر اسے ثواب دیا جائے گا، جب کہ کافر کی نیکیاں مسترد کر دی جائیں گی اور اس کی برائیوں کے بدلے میں اسے عذاب دیا جائے گا۔

محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا، اس کا ثواب اس کو دنیا میں اس کے نفس، اس کے مال، اس کے اہل اور اس کی اولاد میں دے دیا جائے گا، حتیٰ کہ جب وہ دنیا سے جائے گا تو اللہ سبحانہ کے پاس اس کی کوئی نیکی نہیں ہو گی اور مومن نے دنیا میں ذرہ برابر جو برائی کی ہو گی، اس کی سزا اس کو دنیا میں ملے گی، اس کے نفس، اس کے مال، اس کے اہل اور اس کی اولاد میں اس کو سزا دے دی جائے گی حتیٰ کہ جب وہ دنیا سے جائے گا تو اللہ سبحانہ کے پاس اس کی کوئی برائی نہیں ہو گی۔ (قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مون اور کافر کوئی اچھا یا برا عمل کریں گے تو اللہ انہیں ان کا عمل دکھادے گا، مومن کی برائیاں معاف کر دی جائیں گی اور اس کی نیکیوں کا اسے ثواب دیا جائے گا اور کافر کی نیکیاں مسترد کر دی جائیں گی اور اس کی برائیوں کا اسے عذاب دیا جائے گا۔ (تفسیر کبیر)

اس آیت کا ایک مطلب یہ ہے کہ نیک بخت لوگ اگر ایک ذرہ برابر نیکی کا کام کریں گے تو وہ اسے دیکھ لیں گے اور بد بخت لوگ اگر ایک ذرہ برابر برائی کا کام کریں گے تو وہ اسے دیکھ لیں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بات ایک ایک ذرہ تک جا پہنچی ہے تو پھر یہ تو کرم نوازی نہ ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کریم کا کرم ہی ہے کیونکہ نافرمانی، گناہ، برائی اگرچہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو اس میں ہلکا پن ہے جسے کریم اٹھاتا نہیں ہے اور اطاعت، فرمانبرداری، تابعدار میں عظمت ہے اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو کریم اسے ضائع نہیں کرتا، اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ تو ایک مثقال ذرہ

برابر نیکی کو حقیر و چھوٹا نہ خیال کر، کیونکہ تو باوجود اپنی کمینگی اور کمزوری کے مجھ سے ایک ذرہ بھی ضائع نہیں جانے دیتا، بلکہ تیری ایک ذرہ پر بھی نگاہ ہوتی ہے، تو اس ذرہ کی وجہ سے میری ذات و میری صفات پر استدلال کرتا ہے اور اسے سواری بنا کر مجھ تک پہنچتا ہے، جب تو ایک ذرہ کو ضائع نہیں جانے دیتا تو کیا میں تیرے ذرے کو ضائع کر دوں؟

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل مقصود تو نیت اور ارادہ ہے، جب عمل تھوڑا ہو اور نیت خالص ہو تو مطلوب و مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور اگر عمل زیادہ ہو اور نیت درست نہ ہو تو مقصود و مطلوب فوت ہو جاتا ہے، حضرت کعب رحمہ اللہ کی ایک روایت میں یہاں تک فرمایا گیا کہ نیکی کو حقیر نہ سمجھو، کیونکہ ایک آدمی کا جنت میں داخلہ صرف اس وجہ سے ہو گا کہ اس نے راہ خدا میں ایک سوئی عاریت پر دی ہو گی، اور ایک عورت بیت المقدس کی تعمیر میں ایک دانہ کے ذریعے مدد کرنے کی وجہ سے جنت میں جائے گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے انگور رکھا ہوا تھا، انہوں نے وہ اٹھا کر اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کے آگے کر دیا، اتنے میں ایک سائل آ گیا تو آپ نے ایک دانہ اسے دینے کا حکم دیا تو پاس بیٹھی ہوئی ہنسنے لگیں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تم نے قرآن کریم کی یہ آیت نہیں دیکھی جس میں مثقال ذرہ کا ذکر ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان لوگوں کو تعلیم دے رہی تھیں کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے تھوڑی سی مقدار میں بھی دینا اچھا کام ہے، ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو بہت سخی تھیں۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی، ان میں سے ایک کے پاس ایک سائل آیا تو اس نے اس بات کو حقیر سمجھا کہ اسے کھجور، کسی چیز کا ریزہ یا اخروٹ دے اور وہ کہتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں اور ہمیں تو اس چیز پر اجر دیا جائے گا جو ہم دیتے ہیں اور دوسرا شخص معمولی گناہ کو ہلکا سمجھتا تھا اور کہتا تھا مجھے تو اس قدر گناہ سے کچھ نہیں ہو گا، دوزخ کی وعید تو ان لوگوں کے لیے ہے جو بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، اس پر پھر یہ آیت نازل ہوئی جس میں تھوڑی سی چیز بھی خیرات کرنے کی ترغیب دی گئی، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہی تھوڑی زیادہ ہو جائے

اور معمولی سے گناہ کو بھی حقیر سمجھنے سے ڈرایا گیا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ معمولی گناہ بڑے گناہ کی شکل اختیار کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ، جہنم کی آگ سے بچو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی بچ سکو، اگر کوئی کھجور کا ٹکڑا نہ پائے تو اچھی بات ہی کر لے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ: اور جس نے ایک چیونٹی جتنا برا عمل کیا ہو گا وہ اسے دیکھ لے گا اور اس کی سزا اسے آخرت میں دی جائے گی۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وَالْإِثْمُ الصَّغِيرُ فِي عَيْنِ صَاحِبِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْظَمُ مِنَ الْجِبَالِ، وَجَمِيعُ مَحَاسِنِهِ أَقَلُّ فِي عَيْنِهِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (تفسیر قرطبی) گناہ گار کی نگاہ میں چھوٹا سا گناہ قیامت کے دن پہاڑ سے بڑا بن جائے گا اور اس کی نگاہ میں تمام خوبیاں، نیکیاں اور بھلائیاں جو بہت کم تھیں وہ ہر چیز سے زیادہ ہو جائیں گی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن حکیم میں یہ محکم ترین آیت ہے اور انہوں نے سچ فرمایا، علماء اس آیت کے عموم پر متفق ہیں خواہ انہوں نے اس کے عموم کا قول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

کعب الاحبار نے فرمایا کہ لَقَدْ أَنْزَلَ اللهُ عَلَى مُحَمَّدٍ آيَتَيْنِ أَحْصَتَا مَا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالزَّبُورِ وَالصُّحُفِ: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ. وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (تفسیر قرطبی) اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر دو آیتیں نازل فرمائیں جنہوں نے تورات، انجیل، زبور اور صحائف میں جو کچھ تعلیمات ہیں سب کو جمع کر لیا ہے وہ یہ ہیں، فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر ایرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شر ایرہ۔

نبی کریم ﷺ اس آیت کو جامعہ فاذہ کہا کرتے تھے جس طرح صحیح میں ہے جب آپ سے گدھوں کے بارے میں پوچھا گیا اور آپ نے خچروں کے بارے میں خاموشی اختیار کی دونوں میں جواب ایک ہی ہے کیونکہ خچر اور گدھوں پر سوار ہو کر نہ حملہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بھاگا جا سکتا ہے،

جب نبی کریم ﷺ نے گھوڑوں میں دائمی اجر اور جاری ثواب کا ذکر کیا تو سائل نے گدھوں کے بارے میں پوچھا کیونکہ ان دنوں ان کے پاس خچر نہیں ہوتے تھے حجاز کے علاقہ میں نبی کریم ﷺ کے خچر دُلدل کے سوا کوئی خچر داخل نہیں ہوا تھا جو خچر مقوقس نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے عموم آیت سے فتوی دیا تھا، بیشک حمار میں کثیر ذرات کا وزن ہے۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے دو کھجوریں صدقہ کیں تو سائل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سائل سے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہم سے ذرہ برابر قبول فرمالیتا ہے جبکہ دو کھجوروں میں بہت سے ذرات کے وزن ہوتے ہیں۔

مطلب بن حنطب سے روایت ہے کہ ایک بدو نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ذرہ کے وزن برابر، فرمایا: ہاں۔ بدو نے کہا: وَاسَوأَتَاہ! اس نے یہ کلمہ بار بار کہا پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: لَقَدْ دَخَلَ قَلْبَ الْأَعْرَابِيِّ الْإِيمَانُ، بدو کے دل میں ایمان داخل ہو گیا۔

حودللللح ودلل، بفضل اللہ وبنصرۃ اللہ وبعون اللہ آج سورۃ الزلزال کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول ومنظور فرما کر ہمارے لیے دارین کی سعادت اور نجات کا ذریعہ بنائے، آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والسلام الف الف مرۃ بعدد کل ذرۃ

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ منساواں لاہور کینٹ

۷ مئی ۲۰۲۰ء ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ قبیل وقت الافطار

حروف بینی: ۷ انومبر ۲۰۲۰ء بروز منگل گیارہ بجے شب

☆☆☆☆

العادیات

گھوڑوں کی پانچ حالتیں اور انسانی ناشکری

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ العادیات

جواب ترجمہ: قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپ ہانپ کر دوڑتے ہیں۔ پھر جو (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں اُڑاتے ہیں۔ پھر صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں۔ پھر اس موقع پر غبار اُڑاتے ہیں۔ پھر اسی وقت کسی جمگھٹے کے بیچوں بیچ جا گھستے ہیں۔ کہ انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور وہ خود اس بات کا گواہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔ بھلا کیا وہ وقت اسے معلوم نہیں ہے جب قبروں میں جو کچھ ہے اسے باہر بکھیر دیا جائے گا اور سینوں میں جو کچھ ہے اسے ظاہر کر دیا جائے گا۔ یقیناً ان کا پروردگار اس دن ان (کی جو حالت ہو گی اس) سے پوری طرح باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں دشمن کی طرف بڑھنے اور پیش قدمی کرنے والے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے، ان کی برق رفتار اور سرعت رفتار کی وجہ سے جب سانس نکلنے کی آواز آتی ہے اس کی قسم کھائی ، اور اللہ کے علاوہ کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی قسم کھائے، اس لیے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے۔

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا: عادیات کا لفظی معنی ہے دوڑنے والا، مراد تیز رفتار گھوڑے یا اونٹنیاں ہیں، عادیات، عادیۃٌ کی جمع ہے اور عدْوٌ سے مشتق ہے، جس کا معنی دوڑنا ہے، مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ مجاہدین کے گھوڑوں کی صفت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن

مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں حطیم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے اَلْعَادِيَاتِ ضَبْحًا کے بارے میں سوال کیا، میں نے کہا، اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں بہت تیز دوڑتے ہیں اور سر شام اس وقت واپس آتے ہیں جب لوگ کھانے کے لئے آگ جلاتے ہیں، وہ شخص میرے پاس سے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی سوال کیا اور آپ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب بھی بتایا، آپ نے اس سے کہا کہ جاؤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو میرے پاس لے آؤ، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا،

تُفْتِي النَّاسَ بِمَا لَا عِلْمَ لَكَ بِهِ، وَاللّٰهِ إِنْ كَانَتْ لَأَوَّلَ غَزْوَةٍ فِي الْإِسْلَامِ بَدْرٌ وَمَا كَانَ مَعَنَا إِلَّا فَرَسَانِ، فَرَسٌ لِلزُّبَيْرِ وَفَرَسٌ لِلْمِقْدَادِ وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا الْإِبِلُ مِنْ عَرَفَةَ إِلَى مُزْدَلِفَةَ، وَمِنَ الْمُزْدَلِفَةِ إِلَى مِنًى (تفسیر کبیر للرازی)

تم لوگوں کو ایسی بات کیوں بتاتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے اللہ کی قسم! اسلام کا سب سے پہلا غزوہ، غزوہ بدر تھا، اس وقت ہمارے پاس صرف دو گھوڑے تھے، ایک حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور دوسرا حضرت مقدار بن الاسود رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ مطلب یہ کہ اس سے مراد حجاج کرام کے اونٹ ہیں اور وہ اونٹنیاں ہیں جو عرفات سے مزدلفہ تک دوڑتی ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ سے العادیات کا یہ معنٰی سنا تو آپ نے اپنے والے معنٰی سے رجوع کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ معنٰی کو ترجیح دی۔ گھوڑوں کے دوڑتے وقت ان کے اندر سے سانس کی جو آواز نکلتی ہے اسے ضبح کہتے ہیں، گھوڑوں کی ہنہنانے کی آواز۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضبح کا لفظ گھوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے، البتہ علی سبیل الاستعارہ اونٹ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ ضبح کا لفظ دراصل لومڑی کے لیے استعمال ہوتا ہے عاریۃً گھوڑے کے لیے بولا جاتا ہے۔

فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا: موریات ایرا مصدر سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے، اس کا معنٰی ہے آگ روشن

کرنے والے، اس سے مراد مجاہدین اسلام کے وہ گھوڑے ہیں جو پتھریلی زمین پر چلتے ہیں تو ان کے سموں کی رگڑ سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سواروں کا وہ دستہ ہے جو دن بھر جہاد کرنے کے بعد شام کو واپس آکر کھانا پکانے کے لئے آگ جلاتا ہے۔

قَدْحًا: کا معنیٰ ہے چقماق کو مار کر آگ نکالنا، پتھر پر پتھر یا لوہے کو مار کر آگ نکالنا اور اس سے مراد ہے گھوڑوں کا نعل دار سموں کو پتھریلی زمین پر مارنا قدح فیہ کا معنی ہے کسی چیز میں نکتہ چینی کرنا۔

فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا: مغیرات اغار مصدر سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے، اس کا معنیٰ ہے مال غنیمت سمیٹنے والے، چھاپہ مارنے والے، حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گھوڑوں کی پشت پر سواروں کے وہ دستے ہیں جو رات کو اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور پو پھٹتے ہی صبح کے وقت دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ غفلت کا وقت ہوتا ہے، لوگوں کی تیاری نہیں ہوتی، ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ اُجالے میں دشمنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، اس لیے بھی کہ رات کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اور دن کو حملہ اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کی لڑائی اور دفاع کے لیے تیاری ہوتی ہے۔

بعض اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اونٹوں کی وہ ٹولیاں ہیں جو اپنے سواروں کو لے کر قربانی کے دن صبح کے وقت منیٰ کی طرف تیز تیز جاتی ہیں اور سنت یہی ہے کہ صبح سے پہلے روانہ نہ ہوا جائے، اور اغارۃ کا معنی ہے، بہت تیزی سے روانہ ہونا۔

فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا: فاثرن اثارہ مصدر سے جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے، اس کا معنیٰ ہے برانگیختہ کرنا، گرد و غبار اڑانا، نقعاً کا معنیٰ ہے تنگ، کنویں میں جمع شدہ پانی اور گرد و غبار، معرکہ آرائی کے دوران گھوڑے اپنے ٹاپوں سے جو گرد و غبار اڑاتے ہیں اس کا ذکر ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا: جمعاً یہ وسطن کا مفعول بہ ہے وہ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں کے وسط میں جا پہنچتے ہیں یعنی اس جمعیت میں جا پہنچتے ہیں جس پر وہ حملہ کرتے ہیں، یعنی مجاہدین اپنے گھوڑوں کے ساتھ دشمن کی فوجوں میں گھس گئے۔

اہلِ عرب کے نزدیک گھوڑوں کی بڑی اہمیت تھی ان کا تو کام ہی یہی تھا کہ باہم لڑتے رہتے تھے

اور بڑے قبیلے چھوٹے قبیلوں پر صبح صبح کو غارت گری ڈالتے تھے یعنی رات کو رکے رہتے تھے اور جب صبح ہوتی تھی تو جہاں حملہ کرنا ہوتا وہاں حملہ کر دیتے تھے اموال لوٹ لیتے تھے اور جو کوئی سامنے آتا اسے قتل کر دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھائی اور انہیں یاد دلایا کہ دیکھو ہم نے تم کو جو نعمتیں دی ہیں ان میں ایسے جاندار، جاندار جگہوں میں کام آنے والے گھوڑے بھی دیئے ہیں دوسری نعمتوں کی طرح ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا بھی لازم ہے اس شکر میں یہ بھی لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی ﷺ کو بھیجا ہے اس پر ایمان لاؤ (آپ پر ایمان لانے سے پہلے گھوڑوں کو غلط استعمال کرتے رہے ہو، اب اس کا رخ بھی بدل جائے گا اور یہ گھوڑے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں استعمال ہونے لگیں گے) انوار البیان)

بِهٖ: میں 'ب' یہاں ملابست کے مفہوم میں اور ضمیر کا مرجع نقعاً ہے، یعنی وہ اسی آندھی اور طوفان کے ساتھ دشمن کے ایک پورے غول کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کے نیزوں اور تلواروں کی ذرا پروا نہیں کرتے، انہیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے مالکوں کا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ اس کی خاطر وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو کر اقدام کرتے ہیں اور یہی ان کے شایان شان ہے۔ (تفسیر تدبر القرآن)

ان آیات میں اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں فقط صفات بیان کی گئی ہیں، عادیات، موریات وغیرہ، لیکن ان کا موصوف بیان نہیں کیا گیا، اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر زمانہ کے غازیوں کے سامانِ حرب کی اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتا ہے جن میں یہ صفات پائی جائیں، اس زمانے میں مجاہد گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کیا کرتے تھے اور ان گھوڑوں میں یہ صفات پائی جاتی تھیں۔

آج گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں نے لے لی ہے اور یہ تمام صفات بدرجۂ اتم ان میں بھی پائی جاتی ہیں، وہ جب تیزی سے دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان سے ایک خاص قسم کی گڑگڑاہٹ نکلتی ہے، وہ آگ بھی اگلتے ہیں، جہاں سے گزرتے ہیں گرد و غبار بھی اڑاتے ہیں، دشمنوں کے مورچوں میں بھی گھس جاتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ ان ٹینکوں کی قسم ہے تو بھی بعید نہ ہوگا اور مستقبل قریب میں کوئی اور اسلحہ تیار ہو جائے جو ٹینکوں کی جگہ لے لے اور اس میں یہ خوبیاں پائی جائیں تو ان کا اطلاق اس جدید

اسلحہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

مسند البزار میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے جسے ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہت ہی غریب بتایا ہے، اس میں ہے کہ

بَعَثَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم خيلاً فَأَشْهَرَتْ شَهْرًا لَا يَأْتِيهِ مِنْهَا خَبَرٌ، فَنَزَلَتْ: {وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا} ضَبَحَتْ بِأَرْجُلِهَا، {فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا} قَدَحَتْ بِحَوَافِرِهَا الْحِجَارَةَ فَأَوْرَتْ نَارًا، {فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا} صبَّحت الْقَوْمَ بِغَارَةٍ، {فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا} أَثَارَتْ بِحَوَافِرِهَا التُّرَابَ، {فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا} قَالَ: صَبَّحَتِ الْقَوْمَ جَمِيعًا

(مسند البزار، کشف الاستار، ابن کثیر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا تھا ایک مہینہ گذر گیا لیکن اس کی کوئی خبر نہ آئی اس پر یہ آیتیں اتریں اور اس لشکر کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان کے گھوڑے ہانپتے ہوئے تیز چال سے گئے ان کے سموں کی ٹکر سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں انہوں نے صبح ہی صبح دشمنوں پر پوری یلغار کے ساتھ حملہ کر دیا ان کی ٹاپوں سے گرد اڑ رہی تھی پھر غالب آکر سب جمع ہو کر بیٹھ گئے۔

إِنَّ الإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ: پچھلی آیات میں اللہ نے قسمیں کھائیں، یہاں جواب قسم ہے، اس آیت میں انسان کو اپنے رب کا ناشکرا قرار دیا گیا ہے، کہ وہ لکنود ہے، طبعی طور پر ناشکرا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْكَنُودُ هُوَ الْكَفُورُ کنود کا معنیٰ الکفور ہے یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا، حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: انسان مصائب کا ذکر کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

حضرت ابو اُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الکنود کا معنیٰ بیان کیا الْكَنُودُ، هُوَ الَّذِي يَأْكُلُ وَحْدَهُ، وَيَمْنَعُ رِفْدَهُ وَيَضْرِبُ عَبْدَهُ کنود وہ شخص ہے جو خود اکیلا ہی کھاتا ہے اور اپنے رشتہ داروں کو عطیہ نہیں کرتا اور اپنے غلام کی پٹائی کرتا ہے۔ (المعجم الکبیر، قرطبی، حکیم ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِشِرَارِكُمْ؟ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ: مَنْ نَزَلَ وَحْدَهُ، وَمَنَعَ رِفْدَهُ، وَجَلَدَ عَبْدَهُ (نوادر الاصول

حکیم ترمذی، قرطبی) سنو! کیا میں تمہیں سب سے برے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: کیوں نہیں، یارسول اللہ! فرمایا: جو عطیہ کو صرف اپنے پاس رکھے اور اپنے خادم کو مارے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کندہ اور حضرموت کی زبان میں الکنود کا معنی ہے نافرمان اور ربیعہ اور مضر کی لغت میں اس کا معنی ہے: "الکفور" یعنی بہت ناشکرا اور کنانہ کی لغت میں اس کا معنی ہے، بہت بخیل۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت میں اس سے مراد کافر ہے، حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ قرطبی) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرط بن عبداللہ بن عمرو بن نوفل قرشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

ابو بکر الواسطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الَّذِی یُنْفِقُ نِعَمَ اللّٰہِ فِی مَعَاصِی اللّٰہِ الکنود وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں خرچ کرے۔

ابو بکر الوراق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلْکَنُوْدُ: اَلَّذِی یَرَی النِّعْمَۃَ مِنْ نَفْسِہٖ وَأَعْوَانِہٖ، الکنود وہ شخص ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کو نعمت اس کی اور اس کے دوستوں کی وجہ سے ملی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلَّذِی یَرَی النِّعْمَۃَ وَلَا یَرَی الْمُنْعِمَ کنود وہ شخص ہے جو نعمت کو دیکھے اور نعمت دینے والے کو نہ دیکھے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلْھَلُوْعُ وَالْکَنُوْدُ: ھُوَ الَّذِی إِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعٌ وَإِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعٌ ھَلُوع اور کنود وہ شخص ہے جس پر مصیبت آئے تو گھبرا جائے اور راحت آئے تو ناشکری کرے۔

ایک قول یہ ہے ھُوَ الَّذِی یَکْفُرُ بِالْیَسِیرِ، وَلَا یَشْکُرُ الْکَثِیرَ کنود وہ ہے جو تھوڑی سی چیز پر ناشکری کرتا ہے اور زیادہ چیز پر شکر ادا نہیں کرتا۔ (قرطبی) بعض کہتے ہیں کہ حق کا انکار کرنے والے کو کنود کہتے ہیں، کندہ کو کندی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آباء کا انکار کیا تھا، بعض کہتے ہیں کہ کنود کا معنیٰ ہے رشتہ تعلق کاٹنے والا، عربی میں ارض الکنود ایسی زمین کو کہا جاتا ہے جس سے

کوئی چیز اگتی نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ کینہ رکھنے والا اور حسد کرنے والا ہے، ایک قول ہے کہ وہ تقدیر سے جاہل ہے اور حکمت میں ہے، مَن جَهلَ قَدرَه: هَتَكَ سِترَه جو تقدیر سے جاہل ہے، اس نے اپنی عزت کا پردہ چاک کر دیا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلْكَنُوْدُ اللَّوَّامُ لِرَبِّهٖ يَعُدُّ الْمِحَنَ وَالْمَصَائِبَ، وَيَنْسَى النِّعَمَ وَالرَّاحَاتِ، کنود وہ ہے جو اپنے رب کی بہت زیادہ ملامت کرتا ہے جو مصائب ومشکلات کے تذکرے کرتا ہے اور نعمتوں اور راحتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ کنود ناشکرا اور منکر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر صفات مذمومہ (وہ صفات جن کی مذمت کی جائے) غیر محمودہ (وہ صفات جن کی تعریف نہ کی جائے کے ساتھ کی ہے۔ (قرطبی)

ناشکری انسان کو کفر اور فسق تک پہنچا دیتی ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ ہر انسان ان صفات سے متصف ہو، اللہ کے بندوں میں ایسوں کی کمی نہیں جو ہر حال میں اللہ کی شکر گزاری کرتے ہیں، تنگی اور تکلیف میں بھی کلمات تحمید ان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں، بیماری اور پریشانی میں وہ اللہ کی تعریف وثناء میں رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں، اگر اس ناشکرے سے ہر کوئی مراد لیا جائے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہو گا کہ انسان کی طبعیت کے اندر یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، مگر جسے اللہ اپنی توفیق ورحمت سے بچالے۔

وَإِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ: امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ انسان اس پر گواہ ہے، وہ اپنے ناشکرے ہونے پر اپنے خلاف گواہی دے گا، یہ امر ظاہر باہر ہے اس کے لیے اس سے انکار ممکن نہیں ہو گا، یا وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے بروز محشر اپنے خلاف گواہی دے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گواہی دے گا، ارباب تفسیر کہتے ہیں کہ یہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ ضمیر قریبی مرجع کی طرف لوٹتی ہے اور سب سے زیادہ قریب یہاں لفظ رب ہے، اس آیت میں انسان کو اس کے گناہوں پر زجر وتوبیخ کی گئی ہے، کیونکہ آخرت میں اس

کے اعمال کا شمار کیا جائے گا۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ: یہاں انہ کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہے کہ انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہے، الخیر مال کے لیے استعمال ہوا ہے، قرآن کریم میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں الخیر مال کے معنیٰ میں آیا ہے، جیسے **إِنْ تَرَكَ خَيْرًا (الْبَقَرَةِ: ۱۸۰)** (جب تم میں سے کسی پر موت کا وقت آئے، سو اگر اس نے مال چھوڑا ہو تو اس پر وصیت کو فرض کر دیا گیا ہے)۔ یہاں خیراً مال کے معنیٰ میں آیا ہے، اسی طرح سورۃ المعارج میں بھی الخیر مال کے معنیٰ میں ہے جیسے ارشاد ہے **وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا (الْمَعَارِجِ: ۲۱)** (اور جب اس کو مال ملتا ہے تو وہ بخل کرنے والا ہے۔) مال کے لیے خیر کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ لوگ آپس میں جب مال کو گنتے اور شمار کرتے ہیں تو وہ اسے بہتر اور خیر ہی خیال کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان مال کی محبت میں شدید ہے، اور شدید سے مراد بخیل ہے۔

انسان میں مال و دولت کی حرص و محبت کس قدر ہے اس کا بیان احادیث میں موجود ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نبی کریم ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے **لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوبُ اللهُ عَلَى مَنْ تَابَ (بخاری، باب مایتقی من فتنة المال)** اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کو طلب کرے گا اور ابن آدم کے پیٹ کو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے اور جو شخص توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس بحرین کا مال آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو مسجد میں پھیلا دو اور نبی ﷺ کے پاس جو اموال آتے تھے ان میں یہ مال سب سے زیادہ تھا، نبی ﷺ نماز پڑھنے گئے اور اس مال کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، نماز پڑھانے کے بعد آپ اس مال کے پاس بیٹھ گئے، پھر آپ ﷺ جس شخص کو بھی دیکھتے، اس کو اس مال سے عطا کرتے، اس وقت آپ ﷺ کے پاس حضرت عباس رضی اللہ عنہما آئے، پھر انہوں نے کہا: یارسول اللہ! مجھے مال عطا کیجیے کیونکہ

میں نے اپنا فدیہ بھی دیا تھا اور عقیل کا فدیہ بھی دیا تھا، آپ نے ان سے فرمایا: آپ اس میں سے مال لے لیں، انہوں نے اپنے کپڑے میں مال ڈالنا شروع کیا اور اس مال کی چوٹی بنادی اور اس کو اٹھانہ سکے، انہوں نے کہا: یارسول اللہ! کسی کو حکم دیں کہ وہ اس مال کو اٹھا کر میرے اوپر رکھ دے، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! آپ خود اٹھائیں، انہوں نے کہا: اچھا تو پھر آپ ﷺ اٹھا کر رکھ دیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، انہوں نے اس گھڑی سے مال کم کیا، پھر اس کو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا، پھر چلے گئے پھر رسول اللہ ﷺ کی نظر ان کا تعاقب کرتی رہی، حتیٰ کہ وہ نظر سے اوجھل ہوگئے، رسول اللہ ﷺ کو ان کی حرص پر تعجب ہو رہا تھا، رسول اللہ ﷺ وہاں سے اس وقت اٹھے، جب وہاں پر ایک درہم بھی باقی نہیں رہا تھا۔ (بخاری)

حضرت عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے چچا تھے، مکہ کے بہت مالدار آدمی تھے، بدر کے میدان میں گرفتار کر لیے گئے تھے، اس موقع پر جو فدیہ لیا گیا تھا اس میں انہوں نے اپنا اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کا فدیہ دیا تھا، آپ رضی اللہ عنہ ہی نے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے اُس اعلان کے بعد اصل مال بھی مکہ والوں کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا تھا جس میں نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہما کا سود معاف کرنے کا اعلان کیا تھا، انہوں نے ہی اپنی بیوی کے ساتھ مل کر مکہ میں بدر کی طرف جانے سے پہلے ایک گڑھا کھود کر مال دبایا تھا، جس کی خبر اللہ نے نبی کریم ﷺ کو مدینہ میں دے دی تھی، جب نبی کریم ﷺ نے یہ مال دبانے کی آپ کو خبر دی تھی تو اس وقت انہوں نے بے ساختہ کلمہ پڑھا تھا کہ اس واقعہ کو میرے اور میری بیوی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، آپ کو سچے رب نے اطلاع کر دی۔

مفسر قرآن امام رازی رحمہ اللہ اس موقع پر مال کی محبت کے انسانی شخصیت پر اثرات کے حوالے سے اہل تفسیر کی آراء پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان حب مال کی وجہ سے بخل کرتا ہے اور مال کو روک روک کر رکھتا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ انسان مال کی محبت میں اور دنیا کو طلب کرنے اور دنیا کو دین پر ترجیح دینے میں بہت سخت اور قوی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں بہت خفیف

اور کمزور واقع ہوا ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے سے انسان کا دل تنگ ہوتا ہے اور اس کا دل گھٹتا ہے، چوتھی تفسیر یہ ہے کہ فرا کہتے ہیں کہ انسان اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ مال سے سخت محبت رکھے اور اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ وہ مال سے محبت رکھتا ہے۔

مال کی محبت اس کے معنیٰ و مفہوم میں بھی پائی جاتی ہے، کیونکہ مال یمیل کا معنیٰ ہے نفس کا کسی طرف مائل ہونا، جھکنا، تو مال کی طرف انسانی دل اور نفس مائل ہوتا ہے اسی بناء پر اسے مال کہا جاتا ہے، ان فطری جذبات کے باوجود صاحب مال کی بخیلی پر بخل کی مذمت کا جگہ جگہ تذکرہ ملتا ہے، قرآنی اور نبوی تعلیمات میں بخل کی سخت اور شدید مذمت کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے،

مَثَلُ الْبَخِيلِ وَالْمُنْفِقِ كَمَثَلِ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُبَّتَانِ مِنْ حَدِيدٍ مِنْ ثُدِيِّهِمَا إِلَى تَرَاقِيهِمَا، فَأَمَّا الْمُنْفِقُ فَلاَ يُنْفِقُ إِلَّا سَبَغَتْ أَوْ وَفَرَتْ عَلَى جِلْدِهِ، حَتَّى تُخْفِيَ بَنَانَهُ وَتَعْفُوَ أَثَرَهُ، وَأَمَّا الْبَخِيلُ فَلاَ يُرِيدُ أَنْ يُنْفِقَ شَيْئًا إِلَّا لَزِقَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ مَكَانَهَا، فَهُوَ يُوَسِّعُهَا وَلاَ تَتَّسِعُ

بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ان دو آدمیوں کی طرح ہے، جنہوں نے لوہے کے دو کوٹ پہنے ہوئے ہوں، جو ان کے پستانوں سے ان کے گلوں تک ہوں، رہا خرچ کرنے والا تو وہ جوں جوں خرچ کرتا ہے، اس کے لوہے کے کڑے ڈھیلے ہوتے جاتے ہیں اور اس کے جسم سے ان کڑوں کے نشان مٹتے جاتے ہیں اور بخیل جب بھی خرچ کرنے کا ارادہ کرے تو لوہے کا ہر کڑا اس کے جسم کے ساتھ اور چمٹتا جاتا ہے، وہ اس کوٹ کو کشادہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ کشادہ نہیں ہوتا۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ، إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلاَنِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَيَقُولُ الآخَرُ: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (بخاری) ہر روز جب بندے صبح کو اٹھتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ایک

فرشتہ دعا کرتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (خرچ کئے ہوئے) مال کا بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے: اے اللہ! بخیل کے مال کو ضائع کر دے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں اس مقام پر فرماتے ہیں اس آیت میں یہ دو مذموم خصلتیں مطلق انسان کی بیان کی گئی ہیں حالانکہ انسان میں انبیاء و اولیاء اور بہت سے صلحاء، عباد ایسے ہیں، جو ان مذموم خصلتوں سے پاک اور شکر گزار بندے ہوتے ہیں مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنے کے لئے تیار رہتے ہیں حرام مال سے بچتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مطلق انسان کی طرف ان مذموم خصلتوں کی نسبت اس لئے کر دی گئی کہ اکثر انسان ایسے ہی ہیں اس سے سب کا ایسا ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے بعض حضرات نے اس آیت میں انسان سے مراد انسان کا فر لیا ہے۔

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ: کیا انسان نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے اسے الٹ دیا جائے گا اور ان میں جو کچھ ہے اسے نکال لیا جائے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: **بَعْثَرْتُ الْمَتَاعَ** یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو سامان کے نیچے والے حصے کو اوپر کر دے۔ محمد بن کعب سے مروی ہے، کہا: یہ اس وقت ہو گا جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ فراء نے کہا: میں نے بنی اسد کے بعض بدوؤں کو پڑھتے ہوئے سنا، **بُحْثِرَ** یعنی عین کی جگہ حاء کو پڑھا۔ (تفسیر قرطبی)

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ: یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار، اور ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرکات چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور برائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے اعمال کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصل اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔

دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔

لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرکات کار فرما رہے ہیں ان کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔

پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اس علم کی بنا پر نہیں ہو گا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز ان رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دکھا دیا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اسی لیے وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

تحصیل کے معنی کسی چیز کو نکال باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اتار کر مغز نکالنا اور مختلف قسم کی چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں میں چھپے ہوئے اسرار کی تحصیل میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ ان کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی اور ان کو چھانٹ کر برائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی۔ یہی مضمون سورۃ طارق میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہو گی۔ (تفہیم القرآن)

إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ: سب لوگ رب کی طرف لوٹنے والے ہیں اور اس دن ان کے امور، ان کے رازوں اور ان کے حالات سے اللہ نہایت ہی اچھی طرح خبر دار ہو گا۔ اس دن کی قید نہیں ہے، اللہ تو ہر وقت اور ہر دن ان حالات سے خبر دار ہے۔ لیکن یہاں يَوْمَئِذٍ کا لفظ نہایت مؤثر ہے۔ اور اس کے آثار انسان کو اس دن کے بارے میں چوکنا کر دیتے ہیں، یہ کہ اللہ اس دن خبر دار ہو گا یعنی کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، حساب و کتاب نہایت علم و خبر داری پر مبنی ہو گا فی ظلال القرآن)

حو دمل لثلث حو دمل آج سورۃ العادیات کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ ان مبارک لمحات میں لکھی جانے والی ان شکستہ سی سطور کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول و منظور فرما کر دارین کی سعادت کا ذریعہ بنا دے، آمین

۲۰ مئی ۲۰۲۰ء ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بوقت سحری

حروف بینی: ۱۸ نومبر ۲۰۲۰ء بروز بدھ بوقت سوا آٹھ بجے علی الصبح

القارعہ

احوالِ قیامت، وزنِ اعمال، جنت، دوزخ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلْقَارِعَةُ {۱} مَا الْقَارِعَةُ {۲} وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ {۳} يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ {۴} وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ {۵} فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ {۶} فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ {۷} وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ {۸} فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ {۹} وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ {۱۰} نَارٌ حَامِيَةٌ {۱۱} القارعة.

جواب ترجمہ: (یاد کرو) وہ واقعہ جو دل دہلا کر رکھ دے گا۔ کیا ہے وہ دل دہلانے والا واقعہ؟ اور آپ کو کچھ معلوم ہے وہ دل دہلانے والا واقعہ کیا ہے؟ جس دن سارے لوگ پھیلے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے۔ اب جس شخص کے پلڑے وزنی ہوں گے۔ تو وہ من پسند زندگی میں ہو گا۔ اور وہ جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ تو اس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہو گا۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گہرا گڑھا کیا چیز ہے؟ ایک دہکتی ہوئی آگ۔

اس سورت میں قیامت کی ہولناکی کا بیان ہے، اس کا اندازِ بیان ہی ایسا ہے جو اس کے سارے پس منظر کو سامنے لے آتا ہے کہ قیامت کی ہولناکی انسانی دلوں کو کھٹکھٹائے گی، یہ دلوں کو دہلا دے گی، انسانی فرد اول سے لے کر فرد آخریں تک سبھی لوگ ایک کھلے میدان میں یکجا ہوں گے، پتنگوں پروانوں کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے، پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

اس دن کی ہولناکی میں کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی اسی کی ہو گی جس کی نیکیوں کا پلڑا جھکا ہوا ہو گا، وہ حیات مرضیہ کے ساتھ جنت میں ہو گا اور جس کم نصیب اور حرماں نصیب کا نامہ اعمال برائیوں، بدیوں اور شر انگیزیوں کی وجہ سے جھکا ہوا ہو گا وہ خسارے اور نقصان میں چلا جائے گا، اس کا انجام کار دوزخ ہو گا، ہاویہ اس کا آخری ٹھکانہ ہو گا۔

الْقَارِعَةُ،مَا الْقَارِعَةُ،وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ: علامہ عبد الحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سورۃ کا نام قارعہ ہے اور قرعہ لغت میں ٹھونکنے کھڑا کھڑانے کو کہتے ہیں اور اسی لیے ایسے حوادث دہر کو جو عاقل کو دہلاتے اور دل کو ہلاتے ہیں قوارع الدہر کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس قسم کی آیات کو جو طبع بشری کو جنبش دینے والی ہیں قوارع القران کہتے ہیں۔

اور اس سورۃ میں بھی وہ مضامین ہیں جو انسان کو خواب غفلت سے جگاتے اور اس کے دل کو ہلاتے ہیں یا اس میں اس حادثہ کا ذکر ہے جو دنیا کو زیر و زبر کر دے گا یعنی قیامت اس لیے اس کا نام القارعہ ہوا۔ واضح ہو کہ اجسام میں خدا تعالیٰ نے ایک قسم کا ثقل یعنی بوجھ یا بھاری پن رکھا ہے جیسا کہ روحانیات میں تجرد اور سبکائی اور یہ ایک قدرتی بات ہے اور یہی ثقل اس کو سکون و قرار پر مجبور کرتا ہے اور یہی اس کو اس کے حیز طبعی کی طرف جھکاتا ہے پھر ایک تو یہی ثقل جسمانی ہے جس سے اعلیٰ قدر مراتب کوئی جسم بھی خالی نہیں اور ایک معنوی ثقل بھی ہے جس کو وقار کہتے ہیں یہ ادراک و حواس والے اجسام کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ان کے لیے خوبی ہے بالخصوص انسان میں جو اس کے مردانہ پن اور تحمل و برداشت کا باعث ہے پھر جس میں یہ وصف نہیں اور تر پھر کرتا ہے، بیٹھنے میں بھی کہیں ہاتھ ہلتے ہیں کہیں پاؤں، کبھی آنکھیں پھڑکتی ہیں تو کبھی جلد جلد بات چیت کرتا ہے اس کو معیوب سمجھتے ہیں اور بندر اور اس قسم کے جانوروں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

جو انمردوں کو اپنے استقلال اور قائم مزاجی پر بڑا ناز ہوا کرتا ہے اور وہ کہتے ہیں ہم پہاڑ ہیں حوادثِ دہر ہم کو جنبش بھی نہیں دے سکتے، کفار قریش اپنے اِس وصف پر بڑے نازاں تھے اور یہاں تک دعویٰ تھا کہ اگر کوئی ہمارے جسم میں زخم بھی لگائے تو ہم جس وضع پر بیٹھے ہوں اس میں کچھ بھی فرق نہ آوے اور اس کی وہ مشاقی بھی کیا کرتے تھے اور اسی کو میدان جنگ اور دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی کا سبب جانتے تھے۔

سو اول قسم کا ثقل زیادہ تر پہاڑوں میں ہے کہ جب سے ان کو قدرت نے جہاں بٹھایا ہے وہیں بیٹھے ہیں ہلتے ہی نہیں اور اسی لیے اس امر میں ثابت قدموں کو پہاڑ سے تشبیہ دی جایا کرتی ہے اور

دوسری قسم کا ثقل انسان میں ہے، مگر انسان کی اس ثقل سے عالم بالا کا مقصود اخلاق حمیدہ اور ملکات کاملہ میں ثابت قدم رہنا ہے جو حسنات حاصل کرنے کا سبب اور معاصی اور لذات و شہوات کے جھونکوں میں اڑنے سے بچنے کا باعث ہے اور دنیا میں اس کے آنے سے یہی مقصد ہے کہ وہ اس ثقل کو حاصل کرلے جاوے اور جس میں یہ ثقل جس قدر ہے اسی قدر وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک گرامی اور بھاری ہے اور جس میں یہ ثقل نہیں وہ بے وقار اور ہلکا ہے اور اس کا ان نیک باتوں سے ہلکا ہونا بہیمیت اور جسمانیت کا بھاری پن ہے جس کا حیز طبعی ہاویہ یعنی مقام اسفل ہے ان باتوں کی طرف خدا پاک اس سورۃ میں ایماء کرکے انسان کو ابواب خیرات کی رغبت دلاتا اور اس کے ثمرات و نتائج عیشہ راضیۃ ظاہر فرماتا ہے اور بدوں کو ہاویہ میں لے جانے والے بوجھ سے سبکی حاصل کرنے اور ثقل مقصود حاصل کرنے کی طرف ابھارتا ہے اور نبوت کبریٰ کا یہی مقصد اصلی ہے

اس لیے فرماتا ہے اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ کہ قارعہ کھڑکھڑانے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی؟ اور اے مخاطب! تو کیا جانے کیا ہے کھڑکھڑانے والی چیز اس لیے کہ وہ اس عالم کی فنا اور فنا کے اثرات ہیں جو بغیر دلیل سمعی کے سمجھ میں نہیں آتے، کس لیے کہ انسان ہمیشہ سے آسمان و زمین پہاڑوں اور دریاؤں اور چاند وستاروں کو دیکھتے سیکھتے یہ سمجھ گیا ہے یہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے ان کو فنا نہیں صرف عناصر سے مرکب چیزوں کو فنا ہے وہ یہی کہ ایک وقت کے بعد اس ترکیب کی گرہ کھل جاتی ہے پھر اپنے خیال کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے سینکڑوں دلیلیں بنالی ہیں، اس لیے اس کوتاہ فہم کے حق میں یہ فرمایا کہ تو کیا جانے کیا وہ کھڑکھڑانے والی چیز ،بہت درست ہے۔ (تفسیر حقانی)

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ: پھر آپ ہی اس کی کسی قدر کیفیت بیان فرماتا ہے کہ جس دن آدمی بکھرے ہوئے پتنگے اور پروانوں جیسے ہو جاویں گے یعنی ان کا وہ ثقل کہ جس پر ناز تھا اس روز کے ناقابل برداشت مصائب دیکھ کر بالکل جاتا رہے گا اور ایسی بے قراری اور بے تابی ہو گی کہ اُدھر کے اِدھر، اِدھر کے اُدھر مارے مارے پھریں گے۔ (حقانی)

فراش فراشتہ کی جمع جس کے معنی پتنگا، پروانہ، بُھنگا، جو رات میں روشنی یا آگ میں گرا کرتا ہے، جبکہ صور پھنکے گا اور لوگ قبروں سے اٹھیں گے اور ایک خدا کی طرف کا پکارنے والا عدالت کی طرف بلائے گا اور جلال کبریائی کی تجلی ہو گی تو دہشت کے مارے لوگ پتنگوں کی طرح یا ٹڈیوں کی طرح بے قرار و مضطرب ہو کر دوڑے آویں گے اور ممکن ہے کہ یہ نفخ صور اول کا واقعہ ہو کہ جب آواز تیز ہو گی اور کڑک اور زلزلہ زیادہ ہو گا تو گھبراہٹ میں پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے مارے پھریں گے اور بے قراری ہو گی سب ثقل و ثبات جاتا رہے گا۔ (حقانی)

تشبیہ میں چار باتیں ہیں: ① طیش و بے قراری اور ایک دوسرے پر بدحواسی میں گرنا۔ ② کثرت وضعف کہ ان کی بھنگوں جیسی کثرت ہو گی اور آج کے بڑے قوی ہیکل اور دلیر اس روز ملائکہ کے آگے بھنگے معلوم ہوں گے۔ ③ ہر جانب اور ہر سمت سے بلانے والے کی طرف ایسا آنا کہ جیسا پتنگے چراغ کی طرف آیا کرتے ہیں۔

④ آگ میں گرنا جیسا کہ پتنگے گرتے ہیں اس طرح وہ آتش جہنم میں گریں گے اور یہ اس لیے کہ وہ روز ظہور کلی ہے یعنی دنیا کا پردہ الٹ کر ہر ایک چیز کی حقیقت اصلیہ دکھادی جائے گی پھر جس طرح آج پتنگوں کی طرح شہوات و لذات کی آگ کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں جہاں طبلہ پر تھاپ پڑی اور سارنگی کی آواز آئی لوگ دوڑ پڑے، سو اس روز یہ خواہش آتش جہنم کی صورت میں ظہور کرے گی اور یہ اسی طرح اس کی طرف مجبورانہ جائیں گے وہ رغبت اور اختیار، جبر و اضطرار کی صورت میں جلوہ گر ہو گا دنیا کے خواب کی یہ تعبیر ہو گی۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ: اب دوسرے ثقل کی کیفیت بیان فرماتا ہے کہ جو پہاڑوں میں رکھا ہوا ہے وہ اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون جیسے ہو کر اڑتے پھریں گے عِهْنِ رنگین پشم کو کہتے ہیں اور رنگین پشم سے تشبیہ اس لیے دی کہ اب جو دنیا میں مختلف رنگوں کے پہاڑ ہیں سنگ مرمر سنگ سرخ، سنگ سیاہ وغیرہ، زلزلہ پے در پے آنے سے چورا چورا ہو جاویں گے اور باہم اڑا کرتے ہیں اسی طرح جب عالم بالا کے دھننے والے اس پہاڑوں کی اون کو دھنیں گے تو یہ اڑتے پھریں گے، اب اس سے

زیادہ کیا کھڑ کھڑانے والا وقت ہو گا، یہ ہے القارعہ جس کی حقیقت سے یہ مست بادہ غفلت بے خبر ہیں۔ (تفسیر حقانی)

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ: جس کی نیکی کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ پسندیدہ زندگی میں ہو گا، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، موازین کی جمع کے بارے میں دو قول ہیں، پہلا قول امام فراء کا ہے وہ کہتے ہیں کہ موازین موزون کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ عمل ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اہمیت اور وزن ہو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ موازین میزان کی جمع ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میزان کی ایک ڈنڈی ہے اور اس میں دو پلڑے ہیں، اس میں صرف اعمال کا وزن کیا جائے گا، مؤمن مطیع کی نیکیوں کو حسین صورت میں لایا جائے گا اور جب اس کی نیکیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے پر بھاری ہو گا تو اس کے لئے جنت ہے، اور کافر کی برائیوں کو بہت بری شکل وصورت میں لایا جائے گا، پھر اس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا رہ جائے گا، پھر وہ دوزخ میں داخل ہو گا۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا، میزان کے دو پلڑے ہیں، ان کی صفت نہیں بیان کی جاسکتی، متکلمین نے کہا صرف نیکیوں اور برائیوں کا وزن نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جن صحیفوں میں ان کے اعمال لکھے ہوئے ہیں، ان کا وزن کیا جائے گا یا نور کو نیکیوں کی علامت اور ظلمت کو برائیوں کی علامت قرار دیا جائے گا یا نیکیوں کے صحیفوں کو حسین صورتوں سے بدل دیا جائے گا اور برائیوں کے صحیفوں کو قبیح صورتوں سے بدل دیا جائے گا، پھر جب ان کا وزن کیا جائے گا تو ان کا ہلکا اور بھاری ہونا ظاہر ہو جائے اور اس وزن کا فائدہ یہ ہے کہ نیکیوں والا مومن سر محشر مسرور اور سرخ رو ہو گا اور برائیوں والا کافر سر محشر پژمردہ اور رسوا ہو گا۔ (تفسیر کبیر)

سورۃ الاعراف میں وزن اعمال پر حضرات مفسرین کرام نے اپنے اپنے علم و تحقیق کے مطابق دلائل و براہین کے انبار لگا دیے ہیں کہ اعمال کا وزن کس طرح اور کیونکر کیا جائے گا، قرآن کریم کے الفاظ میں واضح بتایا گیا کہ بروز محشر وزن اعمال برحق ہے، جس کے اعمال کا وزن بھاری ہو گا وہ کامیاب

وکامران اور فائز المرام ہو گا جب کہ اعمال میں کمزوری دکھانے والا نقصان میں چلا جائے گا، ہم بھی اس مقام پر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۸) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ (۹) الاعراف اور اس دن (اعمال کا) وزن ہونا اٹل حقیقت ہے۔ چنانچہ جن کی ترازو کے پلے بھاری ہوں گے، وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اور جن کی ترازو کے پلے ہلکے ہوں گے، وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ زیادتیاں کر کر کے خود اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں وزن سے مراد میزان (ترازو) کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کرنا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا، تُوزَنُ صَحَائِفُ أَعْمَالِ الْعِبَادِ بندوں کے صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رحمہ اللہ کا یہ فرمان اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہی بات صحیح ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے الْمِيزَانُ الْكِتَابُ الَّذِي فِيهِ أَعْمَالُ الْخَلْقِ میزان سے مراد وہ کتاب ہے جس میں مخلوق کے اعمال درج ہیں۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا الْمِيزَانُ الْحَسَنَاتُ وَالسَّيِّئَاتُ بِأَعْيَانِهَا میزان سے مراد بعینہ نیکیاں اور برائیاں ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور اعمش رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ الْوَزْنُ وَالْمِيزَانُ بِمَعْنَى الْعَدْلِ وَالْقَضَاءِ، وَذِكْرُ الْوَزْنِ ضَرْبُ مَثَلٍ، كَمَا تَقُولُ: هَذَا الْكَلَامُ فِي وَزْنِ هٰذَا وَفِي وِزَانِهِ، أَيْ يُعَادِلُهُ وَيُسَاوِيهِ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ هُنَاكَ وَزْنٌ وزن اور میزان عدل اور قضاء (عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا) کے معنیٰ میں ہیں اور وزن کا ذکر بطور ضرب المثل ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا الکلام فی وزن ھذا وفی وزانہ یعنی یہ کلام اس کے مساوی اور ہم پلہ ہے اگرچہ وہاں کوئی وزن نہیں۔

زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے، هَذَا سَائِغٌ مِنْ جِهَةِ اللِّسَانِ، وَالْأَوْلَى أَنْ يُتَّبَعَ مَا جَاءَ فِي

الْأَسَانِيْدِ الصِّحَاحِ مِنْ ذِكْرِ الْمِيْزَانِ لغت اور زبان کے اعتبار سے یہ جائز ہے اور اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اس کی اتباع اور پیروی کی جائے جو ان صحیح احادیث میں ہے جو میزان کے ذکر میں وارد ہیں۔

علامہ قشیری رحمہ اللہ میزان کے بارے میں بہت ہی خوبصورت بات ارشاد فرمائی کہ

إِذْلَوْ حُمِلَ الْمِيْزَانُ عَلَى هٰذَا فَلْيَحْمِلِ الصِّرَاطَ عَلَى الدِّيْنِ الْحَقِّ، وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ عَلَى مَا يَرِدُ عَلَى الْأَرْوَاحِ دُوْنَ الْأَجْسَادِ، وَالشَّيَاطِيْنُ وَالْجِنُّ عَلَى الْأَخْلَاقِ الْمَذْمُوْمَةِ، وَالْمَلَائِكَةُ عَلَى الْقُوَى الْمَحْمُوْدَةِ، وَقَدْ أَجْمَعَتِ الْأُمَّةُ فِي الصَّدْرِ الْأَوَّلِ عَلَى الْأَخْذِ بِهٰذِهِ الظَّوَاهِرِ مِنْ غَيْرِ تَأْوِيْلٍ، وَإِذَا أَجْمَعُوا عَلَى مَنْعِ التَّأْوِيْلِ وَجَبَ الْأَخْذُ بِالظَّاهِرِ، وَصَارَتْ هٰذِهِ الظَّوَاهِرُ نُصُوْصًا

اگر میزان کو اس (مذکورہ معنیٰ) پر محمول کیا جائے تو پھر چاہیے کہ پل صراط کو دین حق (کے معنی) پر محمول کیا جائے، جنت اور دوزخ اس معنی پر جو ارواح پر صادق آتا ہے نہ کہ اجسام پر اور شاطین اور جنات کو اخلاق مذمومہ پر اور ملائکہ کو قوائے محمودہ کے معنی پر محمول کیا جائے، حالانکہ امت کا دور اول میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہ تمام الفاظ بغیر کسی تاویل کے اپنے ظاہری معنی پر محمول ہیں اور تاویل نہ ہونے پر اجماع ہے تو پھر ظاہری معنی مراد لینا واجب ہے اور یہ ظواہر ہی نصوص ہو گئے۔

ابن فورک نے کہا ہے، الْمِيْزَانَ بِنَاءً مِنْهُمْ عَلَى أَنَّ الْأَعْرَاضَ يَسْتَحِيْلُ وَزْنُهَا، إِذْلَا تَقُوْمُ بِأَنْفُسِهَا معتزلہ نے اس بنا پر میزان کا انکار کیا ہے کہ اعراض کا وزن کرنا محال ہے، کیونکہ وہ بالذات قائم ہی نہیں ہوتے۔

حضرات متکلمین میں سے بعض کہتے ہیں، إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَقْلِبُ الْأَعْرَاضَ أَجْسَامًا فَيَزِنُهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ بیشک اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام میں بدل دے گا اور وہ قیامت کے دن ان کا وزن کرے گا۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بعض متکلمین کا یہ فرمان نقل کرنے کے بعد اسے غلط قرار دیا ہے، اس کے بعد صحیح اور درست بات یوں نقل فرمائی ہے کہ أَنَّ الْمَوَازِيْنَ تَثْقُلُ بِالْكُتُبِ الَّتِي فِيْهَا الْأَعْمَالُ مَكْتُوْبَةٌ، وَبِهَا تَخِفُّ موازین ان کتابوں کے سبب بوجھل اور بھاری ہوں گے جن

میں اعمال لکھے ہوئے ہیں اور انہیں کے سبب خفیف اور ہلکے ہوں گے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس بات کے صحیح ہونے پر رحمت کائنات ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں، جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے، ارشاد ہے کہ أَنَّ مِيزَانَ بَعْضِ بَنِي آدَمَ كَادَ يَخِفُّ بِالْحَسَنَاتِ فَيُوضَعُ فِيهِ رَقٌّ مَكْتُوبٌ فِيهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ فَيَثْقُلُ بعض لوگوں کا میزان (ترازو) قریب ہے کہ نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے پھر اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے گا جس پر لا الہ الا اللہ لکھا ہو گا تو وہ بھاری ہو جائے گا۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کتابوں کے وزن کی طرف راجع ہے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں نہ کہ نفس اعمال کی طرف اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میزان کو ہلکا کر دے گا جب چاہے گا اور بھاری کر دے گا جب ارادہ فرمائے گا اس شے کے ساتھ جو ان صحف میں سے اس کے پلڑوں میں رکھی جائے گی جن میں اعمال درج ہیں۔

اور صحیح مسلم میں صفوان بن محرز سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو کہا: آپ نے کیا سنا ہے رسول اللہ ﷺ نجویٰ (سرگوشی) کے بارے کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

يُدْنَى الْمُؤْمِنُ مِنْ رَبِّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَضَعَ عَلَيْهِ كَنَفَهُ فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوبِهِ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُ فَيَقُولُ أَيْ رَبِّ أَعْرِفُ قَالَ فَإِنِّي قَدْ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَإِنِّي أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطَى صَحِيفَةَ حَسَنَاتِهِ وَأَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُونَ فَيُنَادَى بِهِمْ عَلَى رُءُوسِ الْخَلَائِقِ هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا على الله

ایک مومن کو قیامت کے دن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا اور اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا: کیا تو (اسے) پہچانتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں، تو رب کریم فرمائے گا: چونکہ میں نے اسے دنیا میں تجھ پر مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے اور میں اسے آج بھی تیرے لیے معاف فرماتا ہوں،

پس اسے اس کی نیکیوں کو صحیفہ عطا کر دیا جائے گا۔ اور رہے کفار اور منافقین تو انہیں بھی مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا تھا۔

اس کی نیکیوں کا صحیفہ اسے دیا جائے گا جو فرمان ہے یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اعمال انسانی صحیفہ میں تحریر کیے جاتے ہیں اور ان کا وزن بھی کیا جائے گا۔ (قرطبی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

يُصَاحُ بِرَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُءُوسِ الْخَلَائِقِ فَيُنْشَرُ عَلَيْهِ تِسْعَةً وَتِسْعُونَ سِجِلًّا كُلُّ سِجِلٍّ مَدِّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى هَلْ تُنْكِرُ مِنْ هَذَا شَيْئًا فَيَقُولُ لَا يَا رَبِّ فَيَقُولُ أَظَلَمَتْكَ كَتَبَتِي الْحَافِظُونَ فَيَقُولُ لَا ثُمَّ يَقُولُ أَلَكَ عُذْرٌ أَلَكَ حَسَنَةٌ فَيَهَابُ الرَّجُلُ فَيَقُولُ لَا فَيَقُولُ بَلَى إِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَسَنَاتٍ وَإِنَّهُ لَا ظُلْمَ عَلَيْكَ الْيَوْمَ فَتُخْرَجُ لَهُ بِطَاقَةٌ فِيهَا أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ فَيَقُولُ يَا رَبِّ مَا هَذِهِ الْبِطَاقَةُ مَعَ هَذِهِ السِّجِلَّاتِ فَيَقُولُ إِنَّكَ لَا تُظْلَمُ فَتُوضَعُ السِّجِلَّاتُ فِي كِفَّةٍ وَالْبِطَاقَةُ فِي كِفَّةٍ فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ

قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا اور اس پر ننانوے رجسٹر (دفتر) کھل جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نگاہ تک ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تو اس میں سے کسی کا انکار کرتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا، اے میرے رب! نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا، کیا میرے کراماً کاتبین فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا، نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا، کیا تیرا کوئی عذر ہے، کیا تیری کوئی نیکی ہے؟ تو وہ آدمی ڈر جائے گا اور عرض کرے گا، نہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا: (کیوں نہیں) بلکہ ہمارے پاس تیری نیکیاں ہیں اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہو گا، پھر اس کے لیے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں یہ لکھا ہو گا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ (میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں) تو وہ پوچھے گا، اے میرے رب! ان رجسٹروں کے ہوتے ہوئے

اس کاغذ کے ٹکڑے کی کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: بلاشبہ تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا پس وہ کاپیاں (رجسٹر) ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو کاپیوں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہو جائے گا۔ (ابن ماجہ)

ایک حدیث شریف میں آتا ہے إِذَا خَفَّتْ حَسَنَاتُ الْمُؤمِن أخرج رسول الله صل اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِطَاقَةً كَالْأُنْمُلَةِ فَيُلْقِيهَا فِي كِفَّةِ الْمِيزَانِ الْيُمْنَى الَّتِي فِيهَا حَسَنَاتُهُ فَتَرْجَحُ الْحَسَنَاتُ فَيَقُولُ ذَلِكَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي! مَا أَحْسَنَ وَجْهَكَ وَمَا أَحْسَنَ خَلْقَكَ فَمَنْ أَنْتَ؟ فَيَقُولُ أَنَا مُحَمَّدٌ نَبِيُّكَ وَهَذِهِ صَلَوَاتُكَ الَّتِي كُنْتَ تُصَلِّي عَلَيَّ قَدْ وَفَّيْتُكَ أَحْوَجَ مَا تَكُونُ إِلَيْهَا (قشیری، تفسیر قرطبی فی سورۃ الاعراف)

جب مومن کی نیکیاں کم ہوں گی تو رسول اللہ ﷺ انگلی کے پورے کی مثل کاغذ کا ٹکڑا نکالیں گے اور اسے میزان کے اس دائیں پلڑے میں ڈال دیں گے جس میں اس کی نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں بڑھ جائیں گی (یعنی یہ پلڑا بھاری ہو جائے گا) پس وہ بندہ مومن حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرے گا، آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ کا چہرہ مبارک کتنا حسین ہے اور آپ کے اخلاق کتنے خوبصورت ہیں (یہ تو بتایئے) آپ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ فرمائیں گے أَنَا مُحَمَّدٌ نَبِيُّكَ وَهَذِهِ صَلَوَاتُكَ الَّتِي كُنْتَ تُصَلِّي عَلَيَّ قَدْ وَفَّيْتُكَ أَحْوَجَ مَا تَكُونُ إِلَيْهَا میں تیرا نبی محمد ﷺ ہوں اور یہ تیرا وہ درود پاک ہے جو مجھ پر تو پڑھتا تھا اور میں نے تیری وہ حاجت پوری کر دی جس کا تو زیادہ حاجت مند تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صَاحِبُ الْمَوَازِينِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، يَقُولُ اللهُ تَعَالَى: يَا جِبْرِيلُ زِنْ بَيْنَهُمْ فَرُدَّ مِنْ بَعْضٍ عَلَى بَعْضٍ. قَالَ: وَلَيْسَ ثَمَّ ذَهَبٌ وَلَا فِضَّةٌ، فَإِنْ كَانَ لِلظَّالِمِ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ حَسَنَاتِهِ فَرُدَّ عَلَى الْمَظْلُومِ، وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ الْمَظْلُومِ فَتُحْمَلُ عَلَى الظَّالِمِ،

فَيَرْجِعُ الرَّجُلُ وَعَلَيْهِ مِثْلُ الْجِبَالِ قیامت کے دن وزن کرنے والے حضرت جبریل امین علیہ السلام ہوں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، اے جبریل! ان کے درمیان وزن کر اور ایک سے دوسرے کی طرف لوٹا دے، فرمایا، وہاں کوئی سونا اور چاندی نہ ہو گا، پس اگر ظالم کی نیکیاں ہوں گی تو اس کی نیکیاں لے کر مظلوم کی طرف لوٹا دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ لے کر ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے، پس وہ آدمی لوٹے گا اور اس پر پہاڑ کی مثل (بوجھ) ہو گا (طبری، قرطبی)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے أَنَّ اللهَ تَعَالَى يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا آدَمُ ابْرُزْ إِلَى جَانِبِ الْكُرْسِيِّ عِنْدَ الْمِيزَانِ وَانْظُرْ مَا يُرْفَعُ إِلَيْكَ مِنْ أَعْمَالِ بَنِيكَ فَمَنْ رَجَحَ خَيْرُهُ عَلَى شَرِّهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَمَنْ رَجَحَ شَرُّهُ عَلَى خَيْرِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ فَلَهُ النَّارُ حَتَّى تَعلَمَ أَنِّي لَا أُعَذِّبُ إِلَّا ظَالِماً

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، اے ابن آدم! میزان کے پاس کرسی کی جانب ہو جاؤ اور اپنی اولاد کے ان اعمال کی طرف دیکھو جو تمہاری طرف اٹھائے جائیں گے پس جس کی نیکی برائی پر رائی کے دانہ کے برابر بھی بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جنت ہے اور جس کا شر اس کی نیکی پر رائی کے دانہ کی مقدار بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جہنم ہے یہاں تک کہ تو جان لے گا کہ میں ظالم کے سوا کسی کو عذاب نہیں دوں گا۔

سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کی حرماں نصیبی اور بد بختی کا یوں ذکر کیا

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا {۱۰۲} قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا {۱۰۳} اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا {۱۰۴} اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا {۱۰۵} ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا {۱۰۶} (الکہف)

جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، کیا وہ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے ہی بندوں کو اپنا رکھوالا

بنالیں گے ؟یقین رکھو کہ ہم نے ایسے کافروں کی مہمانی کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے، کہہ دو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کون لوگ ہیں جو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیوی زندگی میں ان کی ساری دوڑ دھوپ سیدھے راستے سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مالک کی آیتوں کا اور اس کے سامنے پیش ہونے کا انکار کیا، اس لیے ان کا سارا کیا دھرا غارت ہو گیا، چنانچہ قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن شمار نہیں کریں گے، یہ ہے جہنم کی شکل میں ان کی سزا، کیونکہ انہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی، اور میری آیتوں اور میرے پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔

سورۃ الکہف کی آیت ۱۰۵ میں بتلا دیا گیا کہ ان کافروں کے وہاں اعمال اس طرح کے نہ ہوں گے جن کا وزن کیا جائے گا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فَلَا حَسَنَةَ لَهُمْ تُوزَنُ فِي مَوَازِينِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَا حَسَنَةَ لَهُ فَهُوَ فِي النَّارِ ان کی کوئی نیکی نہیں ہو گی جس کا قیامت کے روز ترازو میں وزن کیا جائے، اور جس کی کوئی نیکی نہیں ہو گی وہ دوزخ میں جائے گا۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ تہامہ کے پہاڑوں جیسے اعمال لائیں گے مگر ان کا کچھ بھی وزن نہیں ہو گا۔

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ: جس کے اعمال وزن دار ہوں گے وہ پسندیدہ زندگی میں ہو گا، ایسی زندگی جس پر زندگی گزارنے والا خوش ہو، بعض یہ فرماتے ہیں کہ عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ سے مراد یہ ہے ایسی زندگی جو راضی کرنے والی ہو۔ عِيشَة ایسا کلمہ ہے جو جنت میں موجود تمام نعمتوں کو جامع ہے۔

جنت کی نعمتیں بے شمار ہوں گی، جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر ان کا کھٹکا تک نہیں گزرا، ان میں وہ بچھونے بھی ہیں جن کو قرآن کریم میں فرش مرفوعہ سے تعبیر کیا گیا ہے، جن کی اونچائی ایک سو سال کی مسافت جتنی ہے

فَإِذَا دَنَا مِنْهَا وَلِيُّ اللهِ اتَّضَعَتْ حَتَّى يَسْتَوِيَ عَلَيْهَا، ثُمَّ تَرْتَفِعُ كَهَيْئَتِهَا، وَمِثْلُ الشَّجَرَةِ فَرْعُهَا، كَذَلِكَ أَيْضًا مِنَ الِارْتِفَاعِ، فَإِذَا اشْتَهَى وَلِيُّ اللهِ ثَمَرَتَهَا تَدَلَّتْ إِلَيْهِ، حَتَّى يَتَنَاوَلَهَا وَلِيُّ اللهِ قَاعِدًا وَقَائِمًا

جب اللہ کا ولی اس کے قریب ہوتا ہے تو وہ پلنگ پست ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جنتی اس پر بیٹھ جاتا ہے پھر وہ اپنی اصلی حالت میں بلند ہو جاتا ہے جس طرح درخت کی شاخیں ہیں، اسی طرح ان کی بلندی ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کا ولی اس کا پھل چاہتا ہے تو وہ شاخیں جھک جاتی ہیں یہاں تک کہ اللہ کا ولی بیٹھے یا کھڑے اس پھل کو لے لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: قطوفھا دانیۃ۔ (الحاقۃ) کا یہی معنی ہے۔ جہاں کہیں وہ چلے گا یا وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گا تو نہر اس کے ساتھ چلے گی جہاں وہ چاہے گا بلندی کی جانب یا پستی کی جانب، اس بارے میں اللہ کا فرمان ہے: یفجرونھا تفجیرا۔

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ: یعنی جس کے اعمال حسنہ یا نیک اعمال کا پلڑا ہلکا ہو گا۔ اس آیت کے عموم میں کافر بھی داخل ہے جس کے پاس ایمان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نیکی نہ ہو گی اور وہ فاسق مؤمن بھی داخل ہے جس کا گناہوں کا پلڑا نیکیوں کے پلڑا سے بھاری ہو گا لیکن من ثقلت موازینہ میں صرف وہ مؤمن داخل ہیں جو معصوم ہوں یا ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے ہوں، یا ان کی نیکیاں گناہوں سے بھاری ہوں۔ (تفسیر مظہری)

قرطبی نے کہا، ہمارے علماء کا قول ہے کہ آخرت میں لوگوں کے تین فرقے ہوں گے ایک فرقہ متقیوں کا ہو گا جن کے کبیرہ گناہ نہ ہوں گے، ان کی نیکیاں روشن پلڑا میں رکھی جائیں گی اور وہ پلڑا نہیں اٹھائے گا البتہ دوسرا تاریک پلڑا (یعنی گناہوں کا پلڑا) بالکل خالی پلڑا کی طرح اوپر اٹھ جائے گا۔

دوسرا فرقہ کافروں کا ہو گا، ان کے کفر اور گناہوں کا بار تاریک پلڑے میں رکھا جائے گا اور کوئی اچھا عمل ہو گا جیسے کنبہ پروری وغیرہ تو اس کو دوسرے پلڑا میں رکھا جائے گا مگر یہ پلڑا پہلے پلڑا کے برابر نہ ہو سکے گا اور خالی پلڑے کی طرح اوپر کو اٹھ جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن بعض موٹے لمبے چوڑے آدمی آئیں گے مگر اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر نہ ہو گا پھر حضور ﷺ نے آیت: **فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا** پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

تیسرا فرقہ مؤمن بدکاروں کا ہو گا، ان کی نیکیاں روشن پلڑے میں اور برائیاں تاریک پلڑے

میں رکھی جائیں گی، اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا اور بدیوں کا پلڑا بھاری ہو گا تو اس کا معاملہ مشیت الٰہی پر موقوف ہو گا یعنی اگر اللہ چاہے گا تو دوزخ میں داخل کر دے گا اور چاہے گا تو گناہ بخش دے گا اور جنت میں بھیج دے گا اور اگر دونوں پلڑے برابر ہوئے تو اعراف والوں میں سے ہو جائے گا، یہ حالت اس وقت ہو گی جب کبیرہ گناہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے ہوں لیکن اگر بندوں کے حقوق ہوں گے تو انہی حقوق کے موافق اس شخص کی نیکیاں صاحب حق کو دیدی جائیں گی، اس طرح اگر حقوق پورے ہو گئے تو خیر ورنہ حقوق والوں کے گناہ اس شخص پر بڑھا دیئے جائیں گے اور سب گناہوں کا عذاب اس پر ہو گا۔ (مظہری

احمد بن حارث رحمہ اللہ نے کہا: قیامت کے دن لوگوں کے تین فرقے اٹھائے جائیں گے، ایک فرقہ اعمال صالحہ کی وجہ سے غنی ہو گا، دوسرا فرقہ (اعمال صالحہ کم ہونے کی وجہ سے) محتاج، تیسرا فرقہ وہ جو اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے (شروع میں) غنی ہو گا پھر (آخر میں) دوسروں کے حقوق (میں اعمال صالحہ چلے جانے) کی وجہ سے محتاج ہو جائے گا۔ (مظہری)

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: اگر خدا کے ستّر گناہ لے کر تم خدا کے سامنے جاؤ تو وہ (ستّر گناہ کے ساتھ) پیشی اس سے آسان ہو گی کہ بندوں کا ایک گناہ لے کر خدا کے سامنے جاؤ۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ تم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہو گا جس کی ایک نیکی بھی گناہوں سے زائد ہو گی وہ جنت میں جائے گا اور جس کے گناہ نیکیوں سے زائد ہوں گے وہ دوزخ میں داخل ہو گا، ترازو ایک دانہ کے وزن سے ہلکی، بھاری ہو جائے گی اور جس کی نیکیاں، بدیاں برابر ہوں گی وہ اعراف والوں میں سے ہو گا، ایسے لوگ پل صراط پر رکے رہیں گے، یہاں تک کہ جب بعض گناہوں کی سزا ان کو دیدی جائے گی اور نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو ان کو جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (مظہری)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے کہا: جس متقی کا کوئی گناہ نہ ہو گا، اس کے اعمال بھی تولے جائیں گے تاکہ اس کا شرف (لوگوں پر) ظاہر کر دیا جائے اور کافر کے اعمال بھی اس کی ذلت کے (اظہار کے)

لیے تولے جائیں گے، میں کہتا ہوں کہ قرآن میں صالح مؤمنوں کے ثواب کے مقابلہ میں کافروں کی سزا کا ذکر اکثر جگہ آیا ہے لیکن جس مؤمن کے ایک نیک کام کے ساتھ ایک برا کام مخلوط ہو (کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ہوں) ان کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی ہے، ظاہر یہ ہے کہ من خفت موازینہ سے مراد کافر ہی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے متقیوں کے مقابلہ میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے ان سے مراد بھی کفار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا آدمی کو پورا عوض ملے گا، میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان ایک فرشتہ کھڑا ہو گا اگر اعمال بھاری نکلیں گے تو وہ فرشتہ ایسی آواز سے جس کو مخلوق سن لے کہے گا کہ فلاں آدمی خوش نصیب ہو گیا اس خوش نصیبی کے بعد کبھی بدنصیب نہیں ہو گا اور اگر تول ہلکی ہو جائے گی تو وہی فرشتہ ایسی آواز سے کہ جس کو مخلوق سن لے پکار دے گا کہ فلاں شخص بدنصیب ہو گیا اور اس بدنصیبی کے بعد اس کو کبھی خوش نصیبی نہیں ملے گی اس حدیث میں بھی مخلوط الاعمال شخص کی حالت کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی ہے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ فرشتہ اس کے لئے کسی طرح کی ندا نہیں دے گا۔ (گلدستہ تفاسیر)

علامہ اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے پاس صرف باطل ہی باطل ہو گا۔ حق ان کے پاس ہو گا نہیں یا ہو گا تو ان کے عقیدے اور ان کی نیت نے اس کو بھی بالکل بے وزن کر دیا ہو گا۔ (تدبر قرآن)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا إِنَّمَا ثَقُلَ مِيزَانُ مَنْ ثَقُلَ مِيزَانُهُ، لِأَنَّهُ وُضِعَ فِيهِ الْحَقُّ، وَحُقَّ لِمِيزَانٍ يَكُونُ فِيهِ الْحَقُّ أَنْ يَكُونَ ثَقِيلًا. وَإِنَّمَا خَفَّ مِيزَانُ مَنْ خَفَّ مِيزَانُهُ، لِأَنَّهُ وُضِعَ فِيهِ الْبَاطِلُ، وَحَقَّ لِمِيزَانٍ يَكُونُ فِيهِ الْبَاطِلُ أَنْ يَّكُونَ خَفِيفًا (قرطبی)

بیشک پلڑا بھاری ہو گا جس کا پلڑا بھاری ہو گا کیونکہ اس میں حق رکھا گیا ہے جس پلڑے میں حق ہو اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ بھاری ہو۔ بیشک پلڑا ہلکا ہو گا جس کا پلڑا ہلکا ہو گا کیونکہ اس میں باطل رکھا گیا

ہے اور جس پلڑے میں باطل ہو اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ ہلکا ہو۔

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ: اہل دوزخ کے لیے فرمایا کہ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا، اُمّ عربی زبان میں ماں کو کہتے ہیں اس میں یہ بتا دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذوق رکھنے والے دنیا میں گناہوں سے ہی چپکے رہتے ہیں جیسے ماں اپنے بچوں سے چمٹی رہتی ہے اسی طرح دوزخ ان سے چمٹ جائے گی لفظ ھاویہ ھویٰ یھوی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے گہرائی میں گرنے والی چیز دوزخ کی گہرائی میں تو انسان گریں گے لیکن دوزخ کو ہاویہ سے تعبیر فرمایا یہ استعمال مجازی ہے جو ظرف کے معنی میں ہے۔ (انوار البیان)

ایک روایت میں ہے کہ ھاویہ جہنم کے دروازوں میں سے سب سے نچلے دروازے کو کہا جاتا ہے، حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا، عکرمہ کہتے ہیں کہ دوزخی کو سر کے بل اس میں پھینکا جائے گا اس لیے اسے ھاویہ کہا گیا۔

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ پتھر کو دوزخ کے منہ سے اندر پھینکا جائے گا تو وہ ستر سال تک گرتا رہے گا پھر بھی اس کی آخری گہرائی کو نہ پہنچے گا۔ (مشکوٰۃ)

نَارٌ حَامِيَةٌ: سخت گرم، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نَارُكُمْ هٰذِهِ الَّتِي يُوقِدُ ابْنُ آدَمَ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِنْ حَرِّ جَهَنَّمَ قَالُوا: وَاللهِ إِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ فَإِنَّهَا فُضِّلَتْ عَلَيْهَا بِتِسْعَةٍ وَسِتِّينَ جُزْءًا، كُلُّهَا مِثْلُ حَرِّهَا تمہاری یہ آگ جسے انسان جلاتا ہے یہ جہنم کی آگ کا ستر ھواں حصہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! تب تو یہ کافی ہے، فرمایا؛ جہنم کی آگ کو اس دنیا کی آگ پر بہتر گنا فضیلت دی گئی ہے ہر ایک اس کی مثل گرم ہو گی۔ (مسلم، قرطبی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَنَّ الْمَوْتَى يَسْأَلُونَ الرَّجُلَ يَأْتِيهِمْ عَنْ رَجُلٍ مَاتَ قَبْلَهُ، فَيَقُولُ ذَلِكَ مَاتَ قَبْلِي، أَمَا مَرَّ بِكُمْ؟ فَيَقُولُونَ لَا

وَاللّٰهِ، فَيَقُولُ إِنَّالِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ! ذُهِبَ بِهِ إِلَى أُمِّهِ الهَاوِيَة، فَبِئسَتِ الأُمُّ، وَبِئسَتِ الْمُرَبِّيَةُ

مردے اپنے پاس آنے والے ایک آدمی سے اس آدمی کے بارے میں سوال کریں گے جو اس سے قبل فوت ہو چکا ہو گا وہ بتائے گا وہ تو مجھ سے پہلے مر گیا تھا کیا وہ تمہارے پاس نہیں آیا؟ وہ مردے کہیں گے: اللہ کی قسم! نہیں، تو وہ کہے گا: انا للہ وانا الیہ راجعون اسے اس کی ماں ہاویہ کی طرف لے جایا گیا وہ کتنی ہی بری ماں ہے وہ کتنی ہی بری مربیہ ہے۔ (قرطبی)

☆☆☆☆

التکاثر

باہمی فخر و مباہات، موت، جہنم اور نعمتیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ التکاثر

جواب ترجمہ: ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر (دنیا کا عیش) حاصل کرنے کی ہوس نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز ایسا نہیں چاہیے۔ تمہیں عنقریب سب پتہ چل جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز ایسا نہیں چاہیے۔ تمہیں عنقریب سب پتہ چل جائے گا۔ ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات جانتے ہوتے (تو ایسا نہ کرتے) یقین جانو تم دوزخ کو ضرور دیکھو گے۔ پھر یقین جانو کہ تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھ لو گے۔ پھر تم سے اس دن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا (کہ ان کا کیا حق ادا کیا)

اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے غافل اور مال و دولت کی کثرت پر ایک دوسرے کے سامنے گھمنڈ کرنے والوں، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے والوں کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو مال و دولت کی ریل پیل اور کثرت اولاد نے اللہ کی طاعت و فرمانبرداری سے غافل کر دیا ہے، ان کا باہمی تفاخر و مباہات کوئی عارضی نہیں تھا بلکہ ان کی اس مفاخرت میں مشغولیت اس قدر زیادہ تھی کہ یہ اسی عالم میں ہمیشہ سرگرداں رہے یہاں تک کہ منوں مٹی کے نیچے پاتال میں جا پہنچے، قبروں میں دفن ہو گئے، حالانکہ ایسا کرنا ان کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں تھا، ان کے اموال و اولاد کی کثرت کے باعث غفلت اختیار نہیں کرنا چاہیے تھی، انہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کی زندگی اور آخرت کا گھر ان کے لیے بہتر تھا، انہیں چاہیے کہ یہ مال و دولت کے فخر و غرور میں مبتلا ہونے سے بچیں کیونکہ انجام کار یہ چیز ان کے لیے درست نہیں ہے، مال و دولت میں مشغول رہ کر انہیں اپنے قادر و قدیر، اپنے خالق و مالک، اپنے رب اور پالنہار سے غافل نہیں ہونا چاہیے، اگر یہ لوگ ان چیزوں کو جانتے اور حقیقت حال سے آگاہ ہوتے تو انہیں اس قدر ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کا سامنا نہ کرنا پڑتا، اس لیے انہیں چاہیے کہ اپنے کو تباہی، بربادی اور ہلاکت سے بچائیں، یہ اپنی کھلی نگاہوں سے دوزخ کی دھکتی، لپکتی اور شعلہ زن آگ کو دیکھ لیں گے، بلاشک وشبہ اسے دیکھ لیں گے پھر انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مال و دولت کی کثرت، اولاد کی کثرت، چہل پہل یہ سب کچھ اللہ کی نعمتوں میں سے ہے، ان نعمتوں کے بارے میں بروز محشر ان سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کا کیسے اور کس طرح استعمال کیا۔

آخرت کی فکر رکھتے ہوئے صبر و قناعت اختیار کرنا، اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق جائز اور حلال ذرائع سے مال و دولت حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا، جس کا بنیادی مقصد اللہ کی رضا و خوشنودی، اپنے بال بچوں کی مناسب دیکھ بھال، غریب، ضرورت مند اور محتاجوں سے ہمدردی اور بھلائی کا جذبہ رکھنا جس میں فخر و غرور، حرص اور لالچ نہ ہو۔ ہر قدم پر اس بات کا خیال رکھنا کہ اللہ نے جو بھی نعمتیں دی ہیں آخرت میں ان کا حساب دینا ہے۔ ان بنیادی باتوں کا خیال

رکھتے ہوئے مال و دولت حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت، جدوجہد اور بھاگ دوڑ کرنا کسی طرح عبادت سے کم نہیں ہے۔ اس جدوجہد کی قطعاً ممانعت نہیں ہے۔

لیکن جن لوگوں کا مقصد زندگی صرف مال و دولت سمیٹنا، اپنی شان و شوکت کا اظہار کرنا، لوگوں پر رعب اور دھونس جمانے کے لیے اونچی اونچی بلڈنگیں بنانا، لمبی چوڑی سواریاں حاصل کرنا، حلال و حرام کی پرواہ نہ کرنا اور آخرت سے غفلت اختیار کرنا ہو اس کی سخت ممانعت ہے۔ ایسے لوگ کبھی اس بات پر غور و فکر نہیں کرتے کہ یہ تمام چیزیں اس وقت تک ان کے ساتھ ہیں جب تک موت کا فرشتہ ان کے سامنے آکر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ جیسے ہی موت آئے گی یہ تمام چیزیں ان سے چھین لی جائیں گی۔ اسی بات کو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

يَقُولُ الْعَبْدُ: مَالِي مَالِي؟ وَإِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلَاثٌ: مَا أَكَلَ فَأَفْنَى، أَوْ لَبِسَ فَأَبْلَى، أَوْ تَصَدَّقَ فَاقْتَنَى وَمَا سِوَى ذٰلِكَ فَذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ (مسلم، ترمذی، مسند احمد)

آدمی کہتا ہے میرا مال میرا مال، حالانکہ تیرا مال تو صرف اتنا ہے جو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر پرانا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر کے اس کو (آخرت کے لیے) آگے بھیج دیا، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے اور تو اس کو لوگوں کے لیے چھوڑ کر جانے والا ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس مال کو اپنا مال کہتا ہے در حقیقت وہ اس کا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وارثوں کے مال کا نگران ہے، آنکھ بند ہوتے ہی اس کے وارثوں میں سے ہر ایک اپنا حصہ کھینچنے کی فکر میں لگ جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو فرشتہ آگے آگے یہ کہتا جاتا ہے کہ تو کیا لے کر آیا ہے؟ اور جو مرنے والے کے وارث ہیں وہ کہتے ہیں کہ تو کیا چھوڑ کر گیا ہے؟

جو آدمی مال و دولت کے لالچ میں پڑ جاتا ہے اور اسی کو مقصد زندگی بنالیتا ہے وہ جتنی بھی دولت جمع کر لیتا ہے اس پر صبر و قناعت نہیں کرتا بلکہ دن رات اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ میرے پاس جو

کچھ ہے اس کو دگنے سے دگنا کیسے کر سکتا ہوں، اس کی ہوس کا منہ کھلتا ہی چلا جاتا ہے، صرف قبر کی مٹی ہی اس کے ہوس کے منہ کو بھر سکتی ہے۔ اس بات کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ

لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ، وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوبُ اللهُ عَلَى مَنْ تَابَ (بخاری، باب ما یتقی من فتنۃ المال)

اگر آدم زاد کے لیے سونے سے بھری ہوئی ایک وادی موجود ہو تو وہ چاہے گا کہ ایسی دو وادیاں اور ہو جائیں (اس کی ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے)۔ مٹی کے سوا کوئی چیز اس کے منہ کو بھر نہیں سکتی، لیکن اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ (بخاری، بصیرت قرآن)

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ: مال اور اولاد کی کثرت پر فخر نے تم کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے غافل کر دیا، اَلْهٰى کا مصدر اِلْهَاءٌ ہے، اس کا معنی ہے، زیادہ ضروری چیز سے غافل ہونا۔

ائمہ تفسیر نے اس آیت کے مختلف مفاہیم بیان فرمائے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم مال اور اولاد کی کثرت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل ہو گئے، قتادہ نے کہا: تم قبیلوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ سے غافل ہو گئے، ضحاک رحمہ اللہ نے کہا، تم کو معاش اور تجارت نے غافل کر دیا، اَلْهٰى کا معنیٰ ہے مشغول کر دیا۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ نے اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ آیت یہود کے متعلق نازل ہوئی ہے، وہ کہتے تھے: ہم فلاں کی اولاد سے کثرت میں ہیں، بعض اہل تفسیر نے کہا کہ یہ قول مخدوش ہے کیونکہ یہود مدینہ میں تھے اور یہ سورت مکی ہے، ابن زید نے کہا، یہ آیت انصار کے ایک گروہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، بعض اہل تفسیر کہتے ہیں کہ یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور انصار مدینہ میں تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت قریش کے دو قبیلوں کے متعلق نازل ہوئی ہے، بنو عبد مناف اور بنو سہم، وہ ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے، وہ اپنی سرداری اور اپنے شرف سے ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے: ہماری اکثریت ہے اور ہمارے سردار زیادہ ہیں، قتادہ

نے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم بنو فلاں سے اکثر ہیں اور ہر دن ان میں سے ایک نہ ایک مر کر کم ہو رہا تھا حتیٰ کہ وہ سب فوت ہو گئے۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کسی خاص گروہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے، جو مال و دولت کو زیادہ سے زیادہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اس فکر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اطاعت، عبادت اور حسن اخلاق میں کثرت کو طلب کرنا قابل ستائش اور مستحسن ہے اور اس آیت میں کثرت طلب کرنے کی مذمت فرمائی ہے، لیکن مطلقاً کثرت کو طلب کرنا مذموم نہیں ہے، بلکہ اطاعات عبادات اور محاسن اخلاق میں کثرت کو طلب کرنا مطلوب ہے، اور مال میں کثرت اگر فسق و فجور کے لئے ہو تو مذموم ہے اور اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لئے مطلوب ہو تو یہ مستحسن ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا مستحسن ہے، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اس حق کے راستے میں خرچ کرے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرے اور لوگوں کو تعلیم دے۔ (بخاری)

اسی طرح اولاد میں کثرت اگر صرف اپنی نسل بڑھانے کے لئے ہو تو یہ مستحسن نہیں ہے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اضافہ کے لئے مطلوب ہو تو یہ مستحسن ہے

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا، مجھے ایک ایسی عورت ملی ہے، جس کا خاندان بھی اچھا ہے اور وہ بہت خوبصورت بھی ہے اور اس کی اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے نکاح کر لوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں!، وہ پھر دوسری بار آیا، آپ نے پھر منع فرمایا، وہ پھر تیسری بار آیا تو آپ نے فرمایا: اس عورت سے شادی کرو، جو محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔ (ترمذی، نسائی)

معلوم ہوا کہ مطلقاً تکاثر مذموم نہیں ہے بلکہ جو تکاثر مذموم ہے، وہ یہ ہے کہ فسق و فجور کے لئے مال و دولت میں کثرت کو طلب کیا جائے اور علم میں زیادتی اور اطاعت اور عبادت میں کثرت اور اخلاق حمیدہ میں اضافہ محمود اور مستحسن ہے، لہٰذا "التکاثر" میں الف لام استغراق کے لئے نہیں ہے، بلکہ دنیا اور اس کی لذتوں میں ایسی زیادتی کو طلب کرنا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے مانع ہو اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے، ایسا تکاثر ممنوع اور مذموم ہے اور التکاثر میں الف لام عہد کا ہے اور مقصود اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والا تکاثر ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنی آیت کی طرف نگاہ کرتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ تکاثر و تفاخر مذموم ہے، جب کہ عقل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکاثر اور تفاخر حقیقی سعادتوں میں مذموم نہیں ہے، روایات میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں بیت اللہ کے سقایہ کی ذمہ داری پر فخر کرنے کا ذکر ہے، شیبہ کے ہاتھ میں بیت اللہ کی کلید برداری پر تفاخر کا ذکر ہے، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول وَأَنَا قَطَعْتُ خُرْطُومَ الْكُفْرِ بِسَيْفِي فَصَارَ الْكُفْرُ مُثْلَةً فَأَسْلَمْتُمْ میں نے اپنی تلوار سے کفر کی سونڈ کاٹ دی ہے، کفر کا مثلہ ہو گیا ہے پھر تم مسلمان ہوئے ہو) پر ان لوگوں سخت گراں گزرا تھا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے سورۃ الضحیٰ کی آیت ۱۱ کے آخر میں فرمایا کہ انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ طاعات اور اپنے عمدہ اخلاق پر فخر کرے جب کہ اس کا خیال ہو کہ دوسرے اس کی پیروی کریں گے، تو پتا چلا کہ مطلق تکاثر پر تفاخر مذموم نہیں بلکہ تکاثر فی العلم، تکاثر فی الطاعۃ، تکاثر فی الاخلاق الحمیدہ قابل تعریف چیز ہے، یہ نیکیوں میں اصل چیز ہے۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ: یہاں تک کہ تم نے قبروں کی زیارت کر لی، اس سے مراد ہے کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔ شارح بخاری علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ زیارت قبور میں علماء کا اختلاف ہے، علامہ حازمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مردوں کے لئے قبروں کی زیارت کرنے کی اجازت ہے، علامہ ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اَلْإِبَاحَةُ فِي زِيَارَةِ الْقُبُور

إِبَاحَةُ عُمُومٍ، كَمَا كَانَ النَّهْيُ عَنْ زِيَارَتِهَا نَهْيُ عُمُومٍ، ثُمَّ وَرَدَ النَّسْخُ فِي الْإِبَاحَةِ عَلَى الْعُمُومِ، فَجَائِزٌ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ زِيَارَةُ الْقُبُور (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری)

قبروں کی زیارت کے مباح ہونے کا حکم عام ہے، جیسے پہلے قبروں کی زیارت سے ممانعت عام تھی، پھر جب عمومی اباحت کی منسوخی کا حکم آگیا تو مردوں اور عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت کرنا جائز ہو گیا۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ زیارت قبور کی اباحت اور جواز پر بہ کثرت احادیث مروی ہیں ان میں حضرت بریدہ کی روایت ہے جسے امام مسلم نے اپنی کتاب میں نقل فرمایا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُور، فَزُورُوهَا میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو۔ (مسلم، عمدۃ القاری)

ترمذی میں بھی یہ روایت موجود ہے، ترمذی کے الفاظ یہ ہیں قَدْ كُنتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُور فَقَدْ أُذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ بِالْآخِرَةِ (ترمذی، عمدۃ القاری) میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب محمد (ﷺ) کو اس کی ماں کی قبر کی اجازت دے دی گئی ہے، سو اب تم قبروں کی زیارت کیا کر، کیوں کہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

اسی موضوع پر حضرت عبد اللہ بن مسعود کی وہ روایت ہے جو امام ابن ماجہ نے نقل فرمائی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا كُنتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُور، فَزُورُوا الْقُبُورَ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ. میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ دنیا میں آخرت کی یاد دلاتی ہے۔ (ابن ماجہ، عمدۃ القاری)

اسی عنوان پر حضرت انس کی روایت ہے جو امام ابن ابی شیبہ نے نقل فرمائی ہے نَهَى رَسُولُ اللهِ، صلى الله عَلَيْهِ وَسلم، عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُور، ثُمَّ قَالَ: زُورُوهَا وَلَا تَقُولُوا هُجْرًا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے سے منع فرمایا تھا، پھر فرمایا: قبروں کی زیارت کیا کرو اور کوئی بری بات نہ کہنا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابن ماجہ میں روایت ہے کہ أَن رَسُول الله، صلى الله عَلَيْهِ وَسلم، رخص فِي زِيَارَة الْقُبُور رسول کریم ﷺ نے زیارت قبور کی اجازت دی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، کہتے ہیں کہ مجھے حضرت رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا زر الْقُبُور تذكر بهَا الْآخِرَة. قبر کی زیارت کرو، اس سے تم کو آخرت یاد آئے گی۔ (حاکم)

مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

إِنِّي كنت نَهَيْتُكُمْ عَن زِيَارَة الْقُبُور فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ. میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ تم کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

مسند احمد میں ہی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ مَرَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بقُبُور فَأقبَلَ عَلَيْهِم بِوَجْهِهِ فَقَالَ: السَّلَام عَلَيْكُم رسول اللہ ﷺ قبروں کے پاس سے گزرے تو ان کی طرف منہ کر کے فرمایا: السلام علیکم

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے حضرت مجمع بن جاریہ کی روایت نقل فرمائی ہے کہ أَن رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم إِنْتهى إِلَى الْمَقْبرَة. فَقَالَ: السَّلَام على أهل الْقُبُور، نبی کریم ﷺ ایک قبرستان میں تشریف لے گئے، تو فرمایا اے قبروں والو! تم پر سلام ہو۔

حضرت اسماعیل بن عیاش رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ أَنه أَتَى الْمقْبرَة فَسلم عَلَيْهِم، وَقَالَ رَأَيْت النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم يسلم عَلَيْهِم، وہ قبرستان گئے اور اہل قبور کو سلام کیا اور کہا: میں نے نبی ﷺ کو انہیں سلام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (عمدۃ القاری)

علامہ عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری میں علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ کے حوالے سے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل فرمائی ہے، جس میں ارشاد ہے کہ مَا مِن أَحَدٍ يَمُرُّ بِقَبْر أَخِيهِ الْمُؤمن كَانَ يعرفُهُ فِي الدُّنْيَا فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِلاَّ عَرَفَهُ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَام، جو شخص اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کو پہچان کر اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے جب اپنی کتاب میں حضرت بریدہ کی روایت نقل فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ اہل علم کے نزدیک اس روایت پر عمل کرتے ہوئے زیارت قبور میں وہ کوئی حرج نہیں دیکھتے۔(عمدۃ القاری)علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام اسحاق رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

مردوں کے بارے میں تو یہ بات واضح ہوگئی کہ انہیں پہلے قبروں کی زیارت سے روکا گیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آخرت کی یاد دلانے کی غرض سے قبروں کی زیارت کا حکم دیا گیا، جس سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ عورتیں بھی قبروں کی زیارت کر لیا کریں، مگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم قَالَ: لَعَنَ اللهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ بہت زیادہ قبروں پر جانے والیوں پر لعنت کرے۔ یہ حدیث اگرچہ حسن اور صحیح کے درجے کی ہے، لیکن اس کے باوجود اہل علم حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ فرمان اس وقت کا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے سے منع کیا تھا، پھر بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے کی اجازت دے دی تھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے کی رخصت دے دی تو اس رخصت میں مرد اور عورتیں سب داخل ہوگئے،، بعض اہل علم یہ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو قبروں پر جانے کی کراہیت صرف اس لیے ہے کہ وہ بے صبری ہوتی ہیں اور جزع فزع کرتی ہیں۔(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج۸ ص۶۹)

یہاں زوارات کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت زیادہ قبروں پر جانے والیاں، جب کہ دوسری روایت جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں صرف زائرات (قبروں پر جانے والیاں) ہے۔ فرمایا لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ وَالْمُتَّخِذِينَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی، قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والی اور چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔(ابو داؤد)

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قوم نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ زیارت قبور کی رخصت مردوں کے ساتھ، خاص ہے اور عورتوں کو شامل نہیں ہے۔

علامہ ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے، یہ حدیث بھی زیارت قبور کی رخصت سے پہلے کی ہو، جو عورتیں بناؤ سنگھار کرتی ہیں، میرے نزدیک ان کا نہ جانا مستحب ہے اور جوان عورتوں کا قبروں پر جانا فتنہ سے خالی نہیں ہے اور عورتوں کے لئے اپنے گھر کی چار دیواری میں لازم رہنے سے اور کوئی چیز بہتر نہیں ہے، بہت سے علماء نے نماز پڑھنے کے لئے عورتوں کے جانے کو بھی مکروہ کہا ہے تو قبرستان میں جانا تو بہ طریق اولیٰ مکروہ ہو گا، عورتوں پر جمعہ کا پڑھنا جو فرض نہیں ہے تو میرے خیال میں اس کی یہی وجہ ہے کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے۔ (عمدۃ القاری)

جو لوگ عورتوں کے لئے زیارت قبور کے جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی ملیکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک دن قبرستان سے آرہی تھیں، میں نے پوچھا، اے ام المومنین! آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اپنے بھائی عبد الرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کر کے آرہی ہوں، میں نے عرض کیا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبور کی زیارت سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے فرمایا: نَعَم، كَانَ يَنْهَى عَنْ زِيَارَتِهَا ثُمَّ أَمَرَ بِزِيَارَتِهَا، ہاں! پہلے حضور نے منع فرمایا تھا، بعد میں آپ نے زیارت قبور کا حکم فرمایا۔

بعض علماء نے بوڑھی اور جوان عورتوں میں فرق کیا ہے اور اکیلے قبروں پر جانے والیوں اور مردوں کے ساتھ گھل مل کر جانے والیوں میں فرق کیا ہے (عمدۃ القاری شرح البخاری)

علامہ قرطبی مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں أَمَّا الشَّوَابُّ فَحَرَامٌ عَلَيْهِنَّ الْخُرُوجُ، وَأَمَّا الْقَوَاعِدُ فَمُبَاحٌ لَّهُنَّ ذَلِكَ، قَالَ: وَجَائِزٌ ذَلِكَ لِجَمِيعِهِنَّ إِذَا انفَرَدْنَ بِالْخُرُوجِ عَنِ الرِّجَالِ. قَالَ: وَلَا يَخْتَلِفُ فِي هَذَا إِن شَاءَ اللهُ تَعَالَى (عمدۃ القاری)

جوان عورتوں کا زیارت قبور کے لئے جانا حرام ہے اور رہیں بوڑھی عورتیں تو ان کا زیارت قبور

کے لئے جانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مردوں سے اختلاف نہ کریں، اور انشاء اللہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہو گا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جامع ترمذی کی روایت میں زوّارات (بہت زیادہ زیارت کرنے والیوں) پر لعنت ہے اور زوّارات مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا معنی ہے جو بہ کثرت زیارت قبور کے لئے جاتی ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی زیارت قبور کرنے والی عورتوں پر لعنت نہیں ہے اور نہ ان کو ممانعت ہے۔

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کو بہ کثرت زیارت کرنے سے اس لئے منع کیا ہے کہ ان پر لعنت نہیں ہے اور نہ ان کو ممانعت ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کو بہ کثرت زیارت کرنے سے اس لئے منع کیا ہے کہ ان کے قبرستان میں زیادہ جانے سے خاوند کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور اس کی پوشیدہ زینتوں کا اظہار ہوتا ہے اور عورتوں کا باہر نکلنا مشہور ہو جاتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے ساتھ تشبہ ہوتا ہے جو قبروں کی تعظیم کی وجہ سے قبروں کے مجاور بن جاتے ہیں، اور عورتوں کے قبروں پر جانے سے ان کے رونے، چلانے اور واویلا کرنے کا بھی خدشہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی خرابیاں ہیں (مثلاً عورتوں کے زیادہ آنے جانے سے لوگ بھی فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور عورتوں کی عزت اور ناموس کو بھی خطرہ ہوتا ہے) اس اعتبار سے زائرات اور زوارات (کبھی کبھی زیارت کرنے والیوں اور بہت زیادہ زیارت کرنے والیوں) میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ (عمدۃ القاری)

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توضیح میں ہے کہ حضرت بریدہ والی روایت زیارت قبور سے نہی والی حدیث کے باب میں صریح ہے، اور ظاہر یہ بات ہے کہ امام شعبی رحمہ اللہ اور امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کو قبروں کی زیارت کے مباح ہونے والی روایات نہ پہنچی ہوں، علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں کو ناسخ روایت نہیں پہنچی تھی، (فتح الباری)

حضرت نبی کریم ﷺ سال کے آخر میں احد کے شہیدوں کی قبروں پر تشریف لے جاتے اور جاکر سلام کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ تم پر اس چیز کے بدلے میں سلامتی ہو جو تم نے صبر کیا، آخرت کا گھر بہترین ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔(عمدۃ القاری)

عمدۃ القاری میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر ہر جمعہ کے دن جایا کرتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد کی قبر پر جایا کرتے تھے اور اس پر کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا کیا کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبد الرحمان بن ابی بکر کی قبر پر مکہ میں جایا کرتی تھیں۔ ابن حبیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبروں پر جانے اور ان کے پاس بیٹھنے اور گزرتے ہوئے قبر والوں کو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، رسول کریم ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے۔(عمدۃ القاری)

امام مالک رحمہ اللہ سے قبروں پر جانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ قبروں پر جانے سے روکا گیا تھا پھر جانے کی اجازت دی گئی تھی، اگر کوئی انسان قبروں کی زیارت کے لیے جائے اور وہاں خیر کے کلمات کہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔(عمدۃ القاری)

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے روضہ اور ابو بکر و عمر کی قبروں کی زیارت پر امت محمدیہ کا اجماع ہے، حضرت ابن عمر جب سفر سے واپس آتے تو آپ ﷺ کے روضہ پاک پر تشریف لے جاتے تھے وریوں درود شریف پیش کرتے السَّلَام عَلَيْك يَا رَسُول الله، السَّلَام عَلَيْك يَا أَبَا بكر، السَّلَام عَلَيْك يَا أَبَتَاهُ، یارسول اللہ آپ پر سلام، یا ابا بکر آپ پر سلام، اے میرے ابا جان! آپ پر سلام، علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبروں کی زیارت سے ابتدائے اسلام میں منع کیا گیا تھا جب بت پرستی اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کا زمانہ قریب کا تھا، جب اسلام مستحکم ہو گیا اور لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا اور قبروں کی پوجا پاٹ اور ان کی طرف نماز پڑھنے سے امن ہو گیا تو نہی اور ممانعت بھی منسوخ ہو گئی کیونکہ قبروں پر جانا آخرت کو یاد دلاتا ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتا ہے۔(عمدۃ القاری)

حضرت طاؤوس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ سات دن تک مردوں سے جدا نہ ہونے کو مستحب خیال کرتے تھے اس لیے کہ مردے سات دن تک اپنی قبروں میں آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں اوران کا حساب لیا جاتا ہے۔(عمدۃ القاری)

علامہ عینی رحمہ اللہ زیارت قبور کی نہی اوراجازت سے متعلق روایات نقل کرنے اور زیارت قبور سے متعلق احکام بیان کرنے کے بعد خلاصہ کلام کے طور پر لکھتے ہیں عورتوں کے لیے قبروں پر جانا مکروہ ہے بلکہ اس زمانے میں حرام ہے، خصوصاً مصر کی عورتوں کو نکلنا حرام ہے کیونکہ ان کے نکلنے سے فساد اور فتنہ کا اندیشہ ہے، اور قبروں پر جانے کی رخصت دی گئی کیونکہ قبروں پر جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔(عمدۃ القاری ج۸ ص۷۰)

علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ ۸۵۵ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے، آج سے کئی سو سال پہلے انہوں نے مصر کی عورتوں کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ ان کے گھروں سے باہر نکل کر قبروں پر جانے سے فتنہ وفساد کا خطرہ ہے، آج بھی مصری خواتین کے بارے میں یہ خطرہ موجود ہے، مصری عورتوں کو خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حسن وجمال مصری عورتوں اور مردوں میں بہت زیادہ رکھا ہے، اس لیے اس خدشے کا اظہار کیا گیا، اگر وجہ اور علت صرف حسن وجمال ہے تو پھر یہ چیز آج کے دور میں دنیا کے بے شمار ممالک کی عورتوں میں پائی جاتی ہے، اس لیے صرف مصری عورتوں کے لیے یہ حکم خاص نہیں ہے بلکہ حدیث شریف میں جس طرح فرمایا گیا اسے مدنظر رکھا جائے اوراس پر عمل کیا جائے۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَقِيلَ تَحْرُمُ عَلَى النِّسَاءِ وَالْأَصَحُّ أَنَّ الرُّخْصَةَ ثَابِتَةٌ لَهُمَا وَكَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُ السَّلَامَ عَلَى الْمَوْتَى السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ایک قول یہ ہے عورتوں کا زیارت قبور کے لیے جانا حرام ہے اورزیادہ صحیح یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رخصت ثابت ہے، نبی کریم ﷺ مردوں کو السلام علیکم کہنے کی تعلیم دیتے تھے۔(بحر)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا حرام ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ عورتوں کے لئے بھی قبروں کی زیارت جائز ہے۔ (البحر الرائق) اور شرح المنیۃ میں لکھا ہے کہ یہ مکروہ ہے۔

علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ إِنْ كَانَ ذَلِكَ لِتَجْدِيدِ الْحُزْنِ وَالْبُكَاءِ وَالنَّدْبِ عَلَى مَا جَرَتْ بِهِ عَادَتُهُنَّ فَلَا تَجُوزُ، وَعَلَيْهِ حُمِلَ حَدِيثُ لَعَنَ اللَّهُ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ وَإِنْ كَانَ لِلِاعْتِبَارِ وَالتَّرَحُّمِ مِنْ غَيْرِ بُكَاءٍ وَالتَّبَرُّكِ بِزِيَارَةِ قُبُورِ الصَّالِحِينَ فَلَا بَأْسَ إذَا كُنَّ عَجَائِزَ. وَيُكْرَهُ إذَا كُنَّ شَوَابَّ كَحُضُورِ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسَاجِدِ

اگر عورتیں غم کی تجدید مردے کی خوبیاں بیان کرنے اور رونے اور واویلا کرنے کے لئے جائیں تو یہ جائز نہیں ہے اور حدیث میں زوارات قبور پر جو لعنت کی گئی ہے، وہ اسی پر محمول ہے اور اگر رونے اور واویلا کرنے کے بجائے اعتبار آخرت اور میت پر دعا کرنے کے لئے حرج نہیں ہے اور جوان عورتوں کے لئے جانا مکروہ ہے، جس طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے عورتوں کے مسجدوں میں جانے کا معاملہ ہے اور یہ بہت اچھی موافقت ہے۔ (ردالمختار ج ۲ ص ۲۴۲)

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ: یقیناً تم عنقریب جان لوگے، پھر یقیناً تم عنقریب جان لوگے۔ فراء کہتے ہیں کہ ان آیتوں کا معنی ہے جن چیزوں پر تم تفاخر اور تکاثر کر رہے ہو وہ کوئی قابل فخر چیزیں نہیں ہیں اور عنقریب تم ان پر فخر کرنے کا انجام جان لوگے، یہ کلام دوبار بیان فرمایا ہے مقصود تاکید ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ عنقریب تم جان لوگے اس تفاخر و تکاثر کا جو عذاب قبر میں ہوگا، پھر اگلی آیت میں فرمایا کہ عنقریب تم جان لوگے اس تفاخر و تکاثر کا عذاب جو آخرت میں ہوگا۔

ایک قول یہ ہے کہ تکاثر کا معنیٰ ہے عنقریب جب تم موت کے وقت عذاب کو دیکھو گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ میری دعوت ٹھیک تھی اور اگلی آیت میں ہے کہ عنقریب جب تمہیں موت کے بعد زندہ کیا جائے گا تو تم جان لوگے کہ میرا پیغام برحق تھا، ایک اور قول یہ ہے کہ جب فرشتے تمہاری روح قبض کریں گے تو تم میرے پیغام کی سچائی جان لوگے اور دوسری آیت کا معنی ہے جب تم کو قبر میں دفنایا جائے گا اور منکر نکیر تم سے سوال کریں گے تو تم کو میرے قول کی سچائی پر یقین آجائے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ قیامت کے دن تم کو اپنے دوبارہ زندہ کئے جانے پر یقین آجائے گا اور دوسری آیت کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے دن تم کو اس پر یقین آجائے گا کہ تم کو عذاب دیا جائے گا۔ ان آیتوں میں کفار سے خطاب فرمایا ہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ: ہرگز نہیں! کاش تم علم یقین کے ساتھ اپنا انجام جان لیتے۔ علم کے تین مرتبے ہیں اول علم الیقین کہ جیسا کسی نے دریا کو آنکھ سے دیکھ لیا دوسرا عین الیقین کہ اس کے کنارہ پر پہنچ کر پانی چلو میں لے لیا ہو۔ تیسرا حق الیقین کہ دریا میں گھس کر غوطہ لگا لیا ہو۔ (حقانی)

حکماء کے ہاں ہمیں یقین کے تین درجوں کا ذکر ملتا ہے: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین، علم الیقین وہ یقین ہے جو انسان کو علم، معلومات یا استدلال کی بنیاد پر حاصل ہو مثلاً آپ نے دور سے دھواں اٹھتا دیکھا تو آپ نے کہا کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے، حالانکہ آگ آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ پھر جب آپ نے وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے آگ کو دیکھ لیا تو آپ کو عین الیقین حاصل ہو گیا۔ لیکن حق الیقین کا درجہ اس سے بھی آگے ہے، یقین کا یہ درجہ باقاعدہ تجربے سے حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ آنکھ سے دیکھنے میں بھی دھوکے کا امکان ہے، ضروری نہیں کہ کوئی چیز جیسی نظر آرہی ہے حقیقت میں بھی ویسی ہو، جیسے آج کل بعض الیکٹرک ہیٹرز میں انگارے دہکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب آپ غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو محض دکھاوے کا منظر ہے اور حرارت کا اصل منبع کہیں اور ہے۔ چنانچہ آگ کے بارے میں آپ کو علم الیقین تو محض دھواں دیکھنے سے ہی حاصل ہو گیا۔

پھر جب آپ نے آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو آپ کا یقین عین الیقین میں بدل گیا۔ اس کے بعد جب آپ نے آگ کو چھو کر یا اس کے قریب ہو کر اس کی حرارت کو عملی طور پر محسوس کیا تو آگ کی موجودگی کے بارے میں آپ کا یقین حق الیقین کے درجے میں آ گیا۔ (بیان القرآن، د۔ اسرار)

ہم کو جو سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر یقین ہے، وہ علم الیقین ہے، اور صحابہ کرام کو جو آپ ﷺ کی نبوت پر یقین تھا، وہ عین الیقین تھا اور آپ کو جو اپنی نبوت پر یقین تھا، وہ حق الیقین تھا۔

بعض علماء کرام کا قول ہے کہ علم الیقین سے مراد بعث بعد الموت کا عقیدہ ہے اور بعض کا قول ہے یقین سے مراد وہ علم مستند ہے جس میں شک نہ ہو اور اصطلاح میں کسی شے پر عقیدہ ہے۔

راغب رحمہ اللہ کا قول ہے: اَلْيَقِيْنُ مِنْ صِفَةِ الْعِلْمِ فَوْقَ الْمَعْرِفَةِ وَالدِّرَايَةِ وَأَخَوَاتِهَا، يُقَالُ: عِلْمٌ يَقِيْنٍ، یقین علم کی صفتوں میں سے ہے جو معرفت اور درایت سے بڑھ کر (افضل و برتر) ہے اور ان دونوں کے مجموعہ کو علم الیقین کہتے ہیں۔ ایک قول ہے، وَعِلْمُ الْيَقِيْنِ بِمَا اَعْطَاهُ الدَّلِيْلُ مِنْ اِدْرَاكِ الشَّيْءِ عَلَى مَا هُوَ عَلَيْهِ، اور علم الیقین وہ ہے جو کسی شے کے ادراک پر بطور دلیل حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ہر عاقل کو موت کا علم ہے۔ (تفسیر الحسنات)

صاحب تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کا قول ہے: علم الیقین ایمان بالغیب ہے جو استدلال سے حاصل ہوتا ہے، واضح مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں آخرت کا یقینی علم ہوتا تو تم حرص مال وغیرہ میں مبتلا ہو کر آخرت سے غافل نہ ہوتے۔

اس آیت کا معنی ہے تم مال کی کثرت پر فخر نہ کرو کیونکہ تم کو اس فخر کرنے پر آخرت میں عذاب دیا جائے گا اور یہ جو فرمایا ہے کاش! تم علم الیقین کے ساتھ اپنا انجام جان لیتے، اس کا جواب محذوف ہے یعنی اگر آج تم آخرت میں اپنے عذاب کو جان لیتے تو مال و دولت پر فخر کرنا چھوڑ دیتے۔ (تبیان)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یقین یہاں موت، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور قیامت کے معنیٰ میں ہے، سورۃ الحجر میں موت کا نام یقین لیا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر:۹۹) اپنے پروردگار کی عبادت کیجیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

اس لیے کہ جب موت واقع ہو جاتی ہے تو یقین آ ہی جاتا ہے اور شک وشبہ ختم ہو جاتا ہے، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر تم لوگ موت کا علم جانتے اور جو کچھ اس کے بعد انسان کو ملتا ہے اور اس کے بعد قبر اور آخرت میں جو کچھ انسان کے ساتھ ہو گا تو تمہیں باہمی تفاخر و تکاثر اللہ کی یاد سے غفلت میں نہ ڈالتا اور کبھی کبھار انسان بھی کہتا ہے کہ میں فلاں فلاں علم جانتا ہوں، یعنی مجھے اس کی تحقیق ہے اور فلاں علم الطب جانتا ہے، علم الحساب جانتا ہے اس لیے کہ علوم کی بہت سی انواع اور اقسام ہیں اس لیے وہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ یوں کہے کہ میں میں فلاں علم جانتا ہوں۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں فِي الْآيَةِ تَهْدِيدٌ عَظِيمٌ لِلْعُلَمَاءِ فَإِنَّهَا دَلَّتْ عَلَى أَنَّهُ لَوْ حَصَلَ الْيَقِينُ بِمَا فِي التَّكَاثُرِ وَالتَّفَاخُرِ مِنَ الْآفَةِ لَتَرَكُوا التَّكَاثُرَ وَالتَّفَاخُرَ، وَهَذَا يَقْتَضِي أَنَّ مَنْ لَمْ يَتْرُكِ التَّكَاثُرَ وَالتَّفَاخُرَ لَا يَكُونُ الْيَقِينُ حَاصِلًا لَهُ فَالْوَيْلُ لِلْعَالِمِ الَّذِي لَا يَكُونُ عَامِلًا ثُمَّ الْوَيْلُ لَهُ (الکبیر للرازی)

اس آیت میں علماء کرام کے لیے تہدید اور ڈراوا ہے، کیونکہ یہ دلالت کرتی ہے کہ اگر اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ تکاثر اور باہمی تفاخر مصیبت اور آفت میں سے ہے تو وہ تکاثر اور تفاخر کو ترک کر دیتے، اور یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جس نے تکاثر اور باہمی تفاخر نہیں چھوڑا تو اسے یقین حاصل نہیں ہوا، اس لیے جو عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اس کے لیے ویل ہے، تباہی اور بربادی ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ: بے شک تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے، پھر تم ضرور عین الیقین کے ساتھ دوزخ کو دیکھو گے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیتیں کفار کے ساتھ خاص ہیں، وہ آخرت میں ضرور دوزخ کو دیکھیں گے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیتیں کفار اور مؤمنین دونوں کے لئے عام ہیں، کیونکہ مؤمنین بھی قیامت کے دن دوزخ کو دیکھیں گے، قرآن مجید میں ہے: وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا (مریم: ۷۱) تم میں سے ہر شخص کا دوزخ سے گزر ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خطاب ان کافروں کے لیے ہے جن پر دوزخ کی آگ واجب ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ خطاب عام ہے، جیسے سورۃ مریم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں فَهُيِّئَ لِلْكُفَّارِ دَارٌ، وَلِلْمُؤْمِنِينَ مَمَرٌّ، دوزخ کافروں کے لیے گھر کے طور پر تیار کی گئی ہے جب کہ اہل ایمان کی گزر گاہ ہو گی۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، اس میں یہ ہے کہ دوزخ کے اوپر ایک پل بچھا دیا جائے گا، تم میں سے بعض اس کے اوپر سے پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے، بعض بجلی کی طرح اور بعض آندھی کی طرح، بعض تیز رفتار گھوڑوں کی طرح اور بعض اونٹوں کی طرح گزر جائیں گے، ان میں سے بعض تو صحیح سلامت نجات پانے والے ہوں گے اور بعض جہنم کی آگ سے جھلس کر بچ نکلنے والے ہوں گے، یہاں تک کہ آخری شخص اس پر سے گھسٹتے ہوئے گزرے گا، تم آج مجھ سے حق کے معاملہ میں اس قدر سخت نہیں جتنے اس دن اللہ کے سامنے ہو گے، جب مؤمنین دیکھیں گے کہ اپنے بھائیوں میں سے صرف ان کو نجات ملی ہے تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے بھائی بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور ہمارے ساتھ دوسرے نیک اعمال کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جاؤ جس کے دل میں ایک دینار کا مثقال بھر بھی ایمان ہو، اس کو دوزخ سے نکال لو اور اللہ ان کی صورتوں کو دوزخ پر حرام کر دے گا، پس وہ ان لوگوں کے پاس غائب ہو چکے ہوں گے، سو جن کو وہ پہچان لیں گے، ان کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

صاحب روح المعانی نے بعض اکابر سے نقل کیا ہے کہ ہر عاقل کو اس بات کا یقین ہونا کہ مجھے مرنا ہے یہ علم الیقین ہے اور جب وہ موت کے فرشتوں کو دیکھ لیتا ہے تو یہ عین الیقین ہے اور جب واقعی موت کا مزہ چکھ لیتا ہے تو یہ حق الیقین ہے۔ (روح المعانی ص ۲۶۰: ج ۳)

قرآن مجید میں تمام ایسے لوگوں کو تنبیہ فرمادی جو دنیا میں ڈوبے رہتے ہیں کمانا بھی دنیا کے لیے اور مقابلہ بھی دنیا کی کثرت میں دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا آگے بھی دنیا پیچھے بھی دنیا۔ دنیا ہی کے لیے مرتے ہیں اور دنیا ہی کے لیے جیتے ہیں۔ اس غفلت کی زندگی کا جو انجام ہو گا اس سے باخبر فرمادیا کہ

اس سب کا نتیجہ دوزخ کا دیکھنا ہے اور دوزخ میں داخل ہونا ہے۔ یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے اس کے بعد موت اور آخرت بھی ہے اور نافرمانوں کے لیے دوزخ ہے۔ (انوار البیان)

عین الیقین سے مراد وہ یقین ہے کہ جو کسی چیز کے مشاہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ یقین کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف رکھتے تھے اور ان کے پیچھے ان کی قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہیں کوہ طور پر خبر کر دی تھی کہ تمہاری قوم اس وبال میں مبتلا ہو گئی ہے مگر موسیٰ علیہ السلام پر اس خبر سے اتنا اثر نہیں ہوا جتنا اس وقت ہوا جب واپس پہنچ کر انہوں نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی آنکھوں سے دیکھی اس کا اثر یہ ہوا کہ بے اختیار ہو کر الواح تورات ہاتھ سے چھوڑ دیں (مسند احمد، مظہری)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر جس چیز سے پہلے دھمکایا تھا اسی کا بیان کر رہا ہے کہ تم جہنم کو انہی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ اس کی ایک ہی جنبش کے ساتھ اور تو اور انبیاء علیہم السلام بھی ہیبت وخوف کے مارے گھٹنوں کے بل گر جائیں گے اس کی عظمت اور دہشت ہر دل پر چھائی ہوئی ہو گی۔

بحر العلوم ابو اللیث نصر سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوزخ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھو گے، پھر تم اسے عین الیقین سے دیکھو گے کا مطلب یہ ہے کہ تم اس میں داخل ہو گے۔ (بحر العلوم)

علامہ محمد بن منصور ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ وہ دوزخ کو موت کے وقت دیکھیں گے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ دوزخ کو غور وفکر سے دیکھیں گے اور اللہ کی آیات ونشانیوں میں نظر کرتے ہوئے اور دنیا میں اس کے پھیلے ہوئے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں گے۔ (تاویلات اھل السنہ)

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ: پھر تم سے ضرور اس دن نعمتوں سے متعلق پوچھا جائے گا۔

بعض مفسرین رحمہم اللہ نے کہا کہ یہ آیت مؤمنین اور کفار دونوں کے لئے عام ہے، اگر کافروں سے

سوال ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں لیکن تم اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لائے اور تم نے اس کے رسول کا انکار کیا اور اس کے پیغام کو قبول نہیں کیا۔

اور اگر یہ سوال مؤمنین سے ہو تو اس کا محمل یہ ہے کہ اے مؤمنو! تم نے جو نیک اعمال کئے تھے وہ تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی کافی نہ تھے، جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا کی تھیں، تاکہ مؤمنین یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان کی خطاؤں سے درگزر فرمایا ہے اور ان کو ثواب میں جنت عطا فرمائی ہے، یہ محض اللہ کا ان پر فضل ہے ورنہ ان کے نیک اعمال تو ان نعمتوں کے شکر کے لئے بھی کافی نہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

روایات کو سامنے رکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ جس طرح کافروں سے بیش بہا نعمتوں سے متعلق سوال کیا جائے گا اسی طرح اہل ایمان سے بھی بیش بہا نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کسی دن یا کسی رات کو رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر آئے تو آپ ﷺ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس وقت باہر کیوں نکلے ہو؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ! بھوک کی وجہ سے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، میں بھی اسی سبب سے باہر آیا ہوں جس سبب سے تم آئے ہو۔

پھر فرمایا: تم میرے ساتھ چلو، پھر آپ ﷺ ایک انصاری کے گھر گئے، اس وقت وہ انصاری گھر میں نہیں تھا، جب اس کی اہلیہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو کہا: مرحبا! آپ اپنے لوگوں میں آئے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: وہ شخص کہاں ہے؟ اس نے کہا، وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گیا ہے، اتنے میں وہ انصاری آگیا، اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صاحبین کی طرف دیکھا، پھر کہا: الحمدللہ! آج سے پہلے میرے گھر اتنے مکرم اور معظم مہمان نہیں آئے، پھر وہ اٹھ کر گیا اور ادھ پکی اور تازہ پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے اور چھوارے لے کر آیا اور کہا: آپ حضرات ان کو تناول فرمائیں، پھر اس نے چھری پکڑی، رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: دودھ دینے والی بکری کو ذبح نہ

کرنا، اس نے بکری ذبح کی اور انہوں نے اس بکری کا گوشت کھایا اور ان خوشوں سے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا اور خوب سیر ہو گئے آپ نے فرمایا

وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَتُسْأَلُنَّ عَنْ نَعِیمِ هٰذَا الْیَوْمِ، یَوْمَ الْقِیَامَةِ، أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُیُوتِكُمُ الْجُوعُ، ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوا حَتّٰی أَصَابَكُمْ هٰذَا النَّعِیمُ،

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے قیامت کے دن تم سے آج کی ان نعمتوں کے متعلق ضرور بہ ضرور سوال کیا جائے گا، تمہیں تمہارے گھروں سے بھوک نے نکالا ہے پھر تم اس وقت تک واپس نہ لوٹے جب تک تمہیں یہ نعمتیں مل نہیں گئیں۔ (ترمذی، مسلم بحوالہ تفسیر قرطبی)

جس انصاری کا اس روایت میں ذکر ہے اس کا نام ابوالہیثم بن تیہان تھا، علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس انصاری کا نام مالک بن تیہان تھا، کنیت ابوالہیثم تھی، جن نعمتوں کا اس روایت میں قسم کھا کر ذکر فرمایا گیا ان میں تین بڑی اہم نعمتیں ہیں ظِلٌّ بَارِدٌ، وَرُطَبٌ طَیِّبٌ، وَمَاءٌ بَارِدٌ، ٹھنڈا سایہ، بہترین کھجوریں اور ٹھنڈا پانی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روٹی کا وہ ٹکڑا جو تمہاری بھوک دور کرے اور اتنا کپڑا جس سے تمہاری شرم گاہ چھپ سکے اور وہ غار جو تمہیں گرمی اور سردی سے بچائے، ان تین نعمتوں کے علاوہ باقی نعمتوں کا تم سے سوال کیا جائے گا (حلیۃ الاولیاء)

جن نعمتوں کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا ان کے بارے میں ارباب تاویل کے درمیان اختلاف ہے اور دس اقوال ذکر کیے گئے، علامہ قرطبی اور علامہ ابن القیم جوزی نے اپنی اپنی تفاسیر میں یہ اقوال نقل فرمائے ہیں۔

① حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ نعمتیں امن اور صحت ہیں۔

② حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ نعمتیں صحت اور فراغت ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ انہی دو نعمتوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ صحت اور فراغت کے حوالے سے لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ (بخاری، ترمذی، قرطبی)

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ نعمتیں سماعت اور بصارت ہیں، قرآن کریم کی سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے کہ بے شک کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ يُؤْتَى بِالْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيَقُولُ لَهُ: أَلَمْ أَجْعَلْ لَّكَ سَمْعًا وَّبَصَرًا، وَمَالًا وَّوَلَدًا (ترمذی، مسلم، قرطبی) ایک بندے کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، کیا میں نے تجھے کان اور آنکھ اور مال، اولاد نہیں دیئے تھے۔

④ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ کھانے پینے کی جگہ ہے۔

⑤ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ہے۔

⑥ حضرت مکحول رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ سیر ہو کر کھانا، پینا، سایہ دار مکان اور میٹھی نیند

⑦ حضرت مجاہد فرماتے ہیں دنیا کی ہر لذت سے متعلق قیامت کے دن بندے سے پوچھا جائے گا۔

⑧ علامہ قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مخلوق کی طرف بھیج کر انعام کیا، اس انعام و نعمت کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ (زاد)

⑨ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی بارے پوچھا جائے گا۔ (زاد المسیر)

⑩ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں گندم کی روٹی اور میٹھے پانی کے بارے پوچھا جائے گا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت مفضل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شرعی احکام میں جو تخفیف کی گئی ہے یہ بھی اللہ کی نعمت ہے، قرآن کریم کو آسان کیا جانا بھی اللہ کی نعمت ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: ۷۸)، اور قرآن کریم کو آسان کیے جانے کے بارے میں ارشاد ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر: ۱۷)

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ اپنی تفسیر زاد المسیر میں دس اقوال نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ تمام نعمتوں کے بارے میں عام سوال ہو گا اور تمام مخلوق کے بارے میں

عام ہے، کافر جب، منعم کا شکر ادا نہیں کرے گا تو اسے ڈانٹ پلائی جائے گی، اہل ایمان سے منعم کے شکر سے متعلق سوال کیا جائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ فرماتے ہیں ثَلَاثٌ لَا أَسْأَلُ عَبْدِي عَنْ شُكْرِهِنَّ وَأَسْأَلُهُ عَمَّا سِوَى ذٰلِكَ، بَيْتٌ يُكِنُّهُ، وَمَا يُقِيمُ بِهِ صُلْبَهُ مِنَ الطَّعَامِ، وَمَا يُوَارِي بِهِ عَوْرَتَهُ مِنَ اللِّبَاسِ، تین چیزیں ایسی ہیں کہ میں اپنے بندے سے اس کے شکر کے بارے میں سوال نہیں کروں گا، ان کے علاوہ سوال کروں گا، ایک وہ گھر جس میں وہ اپنا سر چھپاتا ہے، دوسرا وہ کھانا جس سے وہ اپنی پیٹھ سیدھی رکھتا ہے، تیسرا وہ لباس جس سے وہ اپنی شرم گاہ کو چھپاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، جس میں عبد (بندے) کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کافر یا صرف مسلمان سے قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، بلکہ سب ہی سوال کیے جائیں گے، حدیث میں ہے أَوَّلُ مَا يُسْأَلُ عَنْهُ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنِ النَّعِيمِ فَيُقَالُ لَهُ: أَلَمْ نُصَحِّحْ لَكَ جِسْمَكَ وَنَرْوِكَ من الماء البَارِدِ، سب سے پہلے قیامت کے دن بندے سے جن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا میں نے تیرے جسم کو صحت نہیں دی تھی؟ اور کیا تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا؟ (الکبیر)

محمود بن لبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سے کونسی نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا؟ کیا وہ پانی، کھجوریں اور دشمن کی موجودگی میں ہمارے کاندھوں پر تلواروں کے بارے میں سوال کیا جائے گا؟ یا کون سی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ (الکبیر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کون سی نعمتوں کے بارے ہم سے پوچھا جائے گا جب کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے مالوں سے محروم کیے گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظِلَالُ الْمَسَاكِنِ وَالْأَشْجَارُ وَالْأَخْبِيَةُ الَّتِي تَقِيكُمْ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ فِي الْيَوْمِ

الحَار، سایہ دار سکونت گاہوں، سایہ دار درختوں، وہ خیمے جو تمہیں گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتے ہیں، گرم دن میں ٹھنڈے ٹھار پانی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر)

یہ تمام وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ بندہ نے ان کا شکر ادا کیا ہے یا نہیں اور شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس لئے دی ہے، اس نعمت کو اس مقصد میں خرچ کیا جائے اور اس نعمت پر دل سے، زبان سے اور دیگر اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کی تعظیم کی جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَزُولُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ، عَنْ عُمُرِهِ فِيمَ أَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَ أَبْلَاهُ، وَمَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ، قیامت کے دن ابن آدم اپنے رب کے پاس سے ایک قدم بھی نہ ہٹنے پائے گا حتیٰ کہ اس سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا ① اس نے اپنی عمر کن کاموں میں خرچ کی؟ ② اس نے اپنی جوانی کو کن کاموں میں گنوایا؟ ③ اس نے اپنا مال کہاں سے حاصل کیا؟ ④ اس نے اپنا مال کن کاموں میں خرچ کیا؟ ⑤ اس نے اپنے علم کے موافق کتنا عمل کیا؟ (ترمذی، مسند ابی یعلیٰ، معجم کبیر)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جَاءَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ فَأَطْعَمْنَاهُمْ رُطَبًا وَسَقَيْنَاهُمْ مَاءً، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَذَا مِنَ النَّعِيمِ الَّذِي تُسْأَلُونَ عَنْهُ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے، ہم نے انہیں کھجوریں کھلائیں اور پانی پلایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔ (تفسیر فتح القدیر للشوکانی)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (الْبَقَرَةِ:۴۰) اے بنی اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں دی ہیں انہیں یاد کرو۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان نعمتوں سے مراد تمام نعمتیں تھیں، دریا کو پھاڑنا، فرعون سے نجات کا ملنا، من اور سلویٰ کا نزول، اسی طرح یہاں بھی نعمتوں سے تمامی نعمتیں مراد ہیں،

نعمتوں سے مراد کامل نعمتیں ہیں، جیسے ایک چیز ہوتی ہے جس کے بعض حصے اوراعضاء ہوتے ہیں، جب نعمتوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا تو اس سے مراد کل ہو گا، جیسے تریاق کا ذکر کیا جائے تو وہ ایک معجون کا نام ہے جو بہت سی دواؤں سے مل کر بنتا ہے، جب تریاق کا ذکر کیا جائے گا تو اس میں ساری وہ اشیاء شامل ہوں گی جو اس کے بنانے میں استعمال کی گئی ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی)

اسی طرح یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نعمتیں ظاہری بھی ہوتی ہیں اور باطنی بھی ہوتی ہیں، بعض ان میں متصل ہوتی ہیں اور بعض منفصل ہوتی ہیں، بعض ان میں دینی نعمتیں ہوتی ہیں اور بعض دنیوی ہوتی ہیں، ان نعمتوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اگر انسان انہیں گننا چاہے، شمار کرنا چاہے تو گن نہیں سکتا اور شمار نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کی سورۃ ابراہیم آیت ۳۴ میں فرمایا کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہیں سکتے۔

انسان صرف اپنے جسم وبدن پر ہی غور کرلے، اپنے جسم وبدن کی صحت سے متعلق ڈاکٹروں، طبیبوں اور حکیموں سے دریافت کرلے، مگر انسان ان نعمتوں سے بہت زیادہ غافل ہے، آسمان و زمین اور ستاروں کی تخلیق میں رب تعالیٰ کی معرفت میں جس قدر نعمتیں پوشیدہ اور پنہاں ہیں اہل نجوم سے ان کے بارے دریافت کرلیا جائے حالانکہ یہ صانع کی کاریگری سے بالکل ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں، رب تعالیٰ کی بادشاہی اور سلطنت کے بارے میں بادشاہوں سے دریافت کرلیا جائے حالانکہ یہ مخلوق میں سب سے زیادہ جاہل لوگ ہوتے ہیں۔

روایات میں ٹھنڈے پانی کا ذکر آیا، اسے ہلکا اور خفیف نہ سمجھا جائے، پانی ایسی چیز ہے جب موجود ہو تو اسے بہت ہی ہلکا سمجھا جاتا ہے اور جب پانی کا فقدان ہو تو اسے بہت ہی اہم اور بڑا خیال کیا جاتا ہے، ابن سماک نے ہارون الرشید سے کہا تھا کہ اگر آپ کو ایک جنگل میں پانی کے گھونٹ کی ضرورت پیش آجائے تو کیا آپ اس کی خاطر اپنے آدھے ملک کو صرف کرسکتے ہیں؟ اور کیا اسے پی لینے کے بعد اپنا نصف ملک اس پر لگا سکتا ہے؟ اور اگر وہ تیرا پائخانہ روک دے تو کیا تو سارا ملک لگا سکتا ہے؟ اس لیے تو اپنی سلطنت اور بادشاہی پر گھمنڈ اور غرور نہ کر، کیونکہ ایک بار پانی پینے کی قیمت دوبار ادا کرنا پڑتی

ہے، اس لیے کہ دوزخ والوں کو دوسروں کی بہ نسبت پانی کی بہت زیادہ طلب ہو گی، وہ کہیں گے کہ ہمیں پانی پلاؤ۔

نبی کریم ﷺ کے فرمان گرامی میں جو فرمایا گیا کہ ابن آدم کے قدم اپنی جگہ سے قیامت کے دن ہل نہیں سکیں گے جب تک وہ چار یا پانچ سوالوں کے جواب نہیں دے گا، ان میں اللہ کی تمام ہی نعمتوں کا ذکر آجائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے بارے میں کب اور کہاں سوال کیا جائے گا، اس بارے میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ سوال وہاں کیا جائے گا جہاں لوگ حساب کتاب کے لیے کھڑے ہوں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب لوگ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ان سے زجر و توبیخ کے طور پر اللہ کی نعمتوں سے متعلق سوال کیا جائے گا، جیسے سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا (الْمُلْكِ: ٨) جب بھی انہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا تو دوزخ کے داروغے ان سے سوال کریں گے

اور سورۃ المدثر میں ارشاد ہے کہ اہل دوزخ سے جہنم میں داخل ہونے کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (الْمُدَّثِّرِ: ۴۲) تمہیں دوزخ میں کیوں جانا پڑا؟

اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہ اللہ کے حبیب نبی کریم ﷺ اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت ہیں، اس نعمت کا تذکرہ قرآن کریم جیسی مقدس کتاب میں اللہ نے کیا اور احسان جتایا کہ میں نے تمہارے اندر عظیم الشان رسول بھیجا ہے، تو نبی کریم ﷺ کے بارے میں سوال تو دوزخ والوں سے دوزخ میں جانے کے بعد ہی پوچھا جائے گا، یا پھر جب انہیں دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا اور وہ دوزخ کو دیکھ لیں گے تو اس وقت انہیں بتایا جائے گا کہ یہ عذاب تمہارے لیے ہے، اس لیے کہ تم لوگ دنیا میں عملی زندگی چھوڑ کر دنیا کی نعمتوں میں مشغول رہے، عمل نے تمہیں آج اس عذاب سے نجات دلانا تھی، اگر تم اپنی عمر کو اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگاتے تو آج نجات پا جاتے، کامیاب

وکامران اور فائز المرام ہو جاتے، اونچے درجات جنت کے پالیتے، انسانوں کو دنیا میں ملنے والی نعمتوں کے بارے میں سوال فرشتوں سے بھی کیا جائے گا۔

یہ عظیم الشان سورت ہے جس کی تلاوت کو نبی کریم ﷺ نے ایک ہزار آیات تلاوت کرنے کے برابر قرار دیا۔ (تفسیر در منثور)

وحدہ لاشریک لہ آج سورۃ التکاثر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول و منظور فرما کر ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اسے ہماری نجات اور فلاح دارین کا ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

حال وارد کاشانہ فقیر، حدوٹ مری

۲۶ مئی ۲۰۲۰ھ ۳ شوال المکرم ۱۴۴۱ھ بروز منگل، پونے ایک بجے شب

حروف بینی: ۲۳ نومبر ۲۰۲۰ء بروز پیر ساڑھے گیارہ شب

العصر

زمانہ، انسان، نقصان، اعمال صالحہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالْعَصْرِ ۙ{۱}اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ {۲}اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ {۳}العصر.

جواب ترجمہ: زمانے کی قسم۔ انسان در حقیقت بڑے گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔

اس مختصر سی سورت میں اہل علم وارباب تفسیر نے بڑی قیمتی اور کارآمد باتیں ارشاد فرمائی ہیں، اس سورت کی ابتدا لفظ عصر سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے عصر کی قسم کھائی ہے، واؤ قسمیہ استعمال فرمائی ہے، عصر کے بارے میں ارباب تفسیر نے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ عصر سے کیا مراد ہے؟ پہلا قول یہ ہے کہ عصر سے مراد زمانہ ہے، یہ بات کہنے والوں نے کئی وجوہ سے دلیل پیش کی ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے اور آپ ﷺ جب اس سورت کی تلاوت فرماتے تو یوں تلاوت کرتے تھے وَالْعَصْرِ وَنَوَائِبِ الدَّهْرِ قسم ہے زمانے کی اور گردش زمانہ کی۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عصر کے بعد کے الفاظ آپ ﷺ نے بطور تفسیر کے ارشاد فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہاں عصر کا لفظ استعمال فرمایا، دھر کا لفظ استعمال نہیں فرمایا تاکہ ملحدین اور دھریوں کو اپنے عقائد فاسدہ کو پروان چڑھانے اور اترانے کا موقع نہ ملے، کیونکہ ملحدین اور دھریوں کے نزدیک کائنات ہستی میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب اتفاقیہ ہو رہا ہے، زمانہ ہی اس ساری چکی کو چلا رہا ہے، یہ سب کچھ خود بخود ہی ہو رہا ہے، دہر ان کے نزدیک بڑی عظمت و رفعت رکھتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ زمانہ بہت عجیب وغریب چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں خوشی اور غم کا، صحت اور بیماری کا، خوشحالی اور تنگ دستی کا ظہور ہوتا ہے، عقل محو حیرت ہے کہ زمانہ کو موجود کہے یا معدوم کہے، معدوم اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ زمانہ سال، مہینہ، ہفتہ، دن اور گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے اور زمانہ کم اور زیادہ ہوتا ہے اور جو چیز اس طرح ہو وہ معدوم ہو سکتی ہے اور موجود اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ زمانہ یا ماضی ہے یا مستقبل، ماضی گزر چکا وہ موجود نہیں ہے اور مستقبل ابھی آیا نہیں ہے وہ بھی موجود نہیں نہیں ہے اور رہا حاضر تو وہ ناقابل تقسیم ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی بقیہ زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے، اگر اس نے ایک ہزار سال ضائع کر دیا پھر اس نے آخری لمحہ میں توبہ کر لی تو وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہے گا پھر تجھے پتا چلے گا کہ وہ وقت تمہاری حیاتی کے اشرف، اعلیٰ اور عمدہ لمحات میں سے وہی لمحہ ہے، پتا چلا کہ دھر وزمان اصل نعمتوں میں سے ہیں، اس لیے اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اس بات پر خبردار کیا ہے کہ رات اور دن کی فرصت وہ ہے جسے بندہ مکلف نے ضائع کر دیا ہے، اسی طرح اللہ نے اشارہ فرمایا کہ **وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُوراً**، اور اسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، اس کے لیے جو نصیحت حاصل کرے یا شکر ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہو۔ (سورۃ الفرقان ۶۲)

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام ۱۲ میں ارشاد فرمایا **قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلْ لِلّٰهِ**، فرما دیجیے، جو کچھ آسمان وزمین میں ہے کس کا ہے؟ فرما دیجیے اللہ ہی کا ہے۔ یہاں اشارہ فرمایا دیا کہ مکان ومکانیات یہ سب اللہ ہی کے ہیں، پھر فرمایا کہ **وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ** اسی کا ہے جو کچھ دن رات میں سکونت پذیر ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ زمان وزمانیات بھی اللہ ہی کے ہیں، مکان ومکانیات سے زمان وزمانیات زیادہ اشرف واعلم ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ لوگ نقصان کی اضافت گردش زمانہ کی طرف کرتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ

نے اس بات پر قسم کھائی کہ دھر و عصر اللہ کی نعمت ہیں ان میں کوئی عیب نہیں ہے، نقصان اٹھانے والا اور عیب نکالنے والا انسان ہی ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کی قسم کھائی ہے جس کے گزرنے کے ساتھ ہی انسانی عمر کم ہوتی جاتی ہے، اگر انسان اس زمانے میں کوئی کمائی نہیں کرے گا تو سراسر گھاٹے اور نقصان میں چلا جائے گا، اسی لیے اللہ نے یہاں قسم کھانے کے بعد فرمایا کہ یہ نقصان میں ہے، اسی لیے کسی شاعر نے کہا

إِنَّا لَنَفْرَحُ بِالْأَيَّامِ نَقْطَعُهَا ... وَكُلُّ يَوْمٍ مَضَى نَقْصٌ مِنَ الْأَجَلِ

اس کا مفہوم و مطلب یہ ہوا کہ اس حیثیت سے زمانے کا معاملہ عجیب ہے کہ انسان اس گمان میں کہ اس کے گزرنے اور کٹنے میں خوش ہوتا ہے کہ باوجود اس کی عمر کے انہدام کے اسے نفع ملے گا، حالانکہ اسے نقصان ہوتا ہے۔ (ماخوذ از تفسیر الکبیر)

دوسرا قول شیخ ابو مسلم رحمہ اللہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ عصر سے مراد دن کے دونوں کنارے ہیں، اس کا سبب کیا ہے؟ اس میں کئی وجوہات ہیں، ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دن کے اُجالے کی قسم والضحیٰ میں کھائی ہے اسی طرح یہاں والعصر میں قسم کھائی ہے، اس لیے کہ ان دونوں میں قدرت کے دلائل پائے جاتے ہیں، کیونکہ ہر صبح قیامت کا منظر پیش کرتی ہے، قیامت برپا ہونے پر لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے، مردے زندہ ہو جائیں گے اور حساب کتاب کی میزان قائم کی جائے گی، اور ہر شام دنیا کی تخریب کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کہ جس طرح دنیا بے ہوش ہو کر موت کے منہ میں جا پہنچے گی، یہ دونوں حالتیں شاہد عدل ہیں، پھر جب دو گواہوں کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کرنے والا فیصل نہیں ہو گا تو یہ شخص نقصان اٹھانے والوں میں شمار کیا جائے گا، اسی طرح ان دونوں سے غافل انسان نقصان میں ہو گا۔

دوسری وجہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی قسم اس بات سے خبردار کرنے کے لیے کھائی ہے کہ یہ وقت بازاروں کی بندش اور تجارت و کسب کی انتہاء کا

ہے، جب ایک شخص کمائی کیے بغیر ہی گھر میں داخل ہو گا اور اس کے اھل وعیال اس کے گرد یہ سوال داغتے ہوئے منڈلائیں گے کہ ان کا حق اور حصہ کیا ہے تو اس وقت یہ شخص شرمندگی اٹھائے گا اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا، اسی طرح ہم کہتے ہیں دنیا کی عصر قریب آچکی ہے، قیامت آنے والی ہے اور انسان کی کوئی تیاری نہیں ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ کل اس سے ان دنیوی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، اس کے مخلوقِ خدا سے متعلقہ معاملات بارے اس سے سوال کیا جائے گا، ہر مظلوم ظالم کے خلاف دعویٰ دائر کرے گا، اس وقت ان معاملات میں کوتاہی کرنے والا نقصان میں چلا جائے گا، اس کی مثال قرآن کریم میں موجود ہے، ارشاد ہے

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُعْرِضُونَ (الْأَنْبِيَاءِ: ۱) لوگوں کے حساب کا وقت قریب آچکا ہے جب کہ یہ غافل ہیں منہ موڑے ہوئے ہیں

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ وقت بڑی شان والا ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ حَلَفَ بَعْدَ الْعَصْرِ كَاذِبًا لَا يُكَلِّمُهُ اللهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، جس نے عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائی اللہ تعالیٰ اس سے بات نہیں کریں گے، اور قیامت کے دن اسے (نظر رحمت سے) دیکھیں گے بھی نہیں۔

تو جس طرح نفع اٹھانے والے کے حق میں الضحیٰ (دن) کی قسم کھائی، اسی طرح نقصان اٹھانے والے کے حق میں العصر کی قسم کھائی، یہ اس لیے کہ ضحیٰ میں نفع کے حق میں قسم کھائی اور رسول اللہ کو بشارت دی کہ اس کا حکم تو اقبال وبلندی کے لیے ہے اور یہاں نقصان اٹھانے والے کے حق میں وعید ہے، ڈراوا ہے کہ اس کا معاملہ اِدبار، نکبت اور نقصان کی طرف جارہا ہے۔

پھر گویا کہ اللہ فرمارہے ہیں کہ دن کا کچھ حصہ باقی ہے، اسے ترغیب دے رہے ہیں کہ دن کے بقیہ حصہ میں کچھ کرلے، توبہ کرلے، معافی مانگ لے، کوتاہی کی تلافی کروالے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بزرگوں میں سے ایک کا فرمان ہے کہ میں نے سورۃ العصر کا مفہوم ایک برف فروش سے سیکھا کہ وہ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا ارْحَمُوا مَنْ يَذُوبُ رَأْسُ

مَالِهِ، ارْحَمُوا مَنْ يَذُوبُ رَأْسُ مَالِهِ، لوگو! اس شخص پر رحم کرو جس کا اصل سرمایہ پگھل رہا ہے، اس شخص پر رحم کرو لوگو جس کا رأس المال پگھل رہا ہے۔ برف فروش کی چیخ وپکار میں یہ کلمات والفاظ سن کر میں سمجھ گیا کہ اس سورت کا یہی مفہوم و معنیٰ ہے کہ انسان نقصان میں ہے، اس کی عصر گزر رہی ہے، اس کی عمر گزر رہی ہے مگر وہ پھر بھی کمائی نہیں کرتا تو وہ نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا۔

تیسرا قول حضرت مقاتل رحمہ اللہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ والعصر سے عصر کی نماز مراد ہے، اس میں انہوں نے کئی وجوہ ذکر فرمائی ہیں، ان میں ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز عصر کی قسم کھائی ہے اس کی فضیلت کی وجہ سے، اس کی دلیل قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۸ میں ہے، جہاں نماز عصر کو صلاۃ الوسطیٰ کہا گیا ہے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے نسخہ قرآنی میں صلاۃ الوسطیٰ سے عصر کی نماز ہی مراد لی گئی ہے، اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیت تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ (الْمَائِدَةِ: ۱۰۶) میں بعد الصلاۃ سے مراد یہی نماز عصر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلُهُ وَمَالُهُ، جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہو گئی گویا کہ اس کا اھل ومال سب برباد ہو گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے اس کی ادائیگی میں مشقت اٹھائی جاتی ہے کیونکہ لوگ اپنی تجارت اور دن کے کنارے میں کسب معاش میں مشغول ہوتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے، مروی ہے کہ ایک عورت مدینہ کی گلیوں میں چیخ وپکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے چلو، جب نبی کریم ﷺ نے اسے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ تو اس عورت نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا کہ یارسول اللہ! میرا خاوند مجھ سے کہیں چلا گیا تو میں نے بدکاری کا ارتکاب کر لیا، اس بدکاری کے نتیجہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، جسے میں نے سر کہ والے بڑے برتن میں پھینک دیا تو وہ مر گیا، پھر ہم نے یہ سر کہ بیچ دیا، تو کیا میرے لیے توبہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا أَمَّا الزِّنَا فَعَلَيْكِ الرَّجْمُ، أَمَّا قَتْلُ الْوَلَدِ فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ، وَأَمَّا بَيْعُ الْخَلِّ فَقَدِ ارْتَكَبْتِ كَبِيرًا، لَكِنْ ظَنَنْتُ أَنَّكِ تركت صَلَاةَ الْعَصْرِ، زنا کی وجہ سے تجھے سنگسار (پتھر مار

مار کر ختم کر دینا) کیا جائے گا، بچے کو قتل کرنے کی سزا جہنم ہے اور سر کہ کو بیچ کر تو نے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تو نے عصر کی نماز چھوڑی ہے۔

اس حدیث شریف میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز عصر کتنا بڑا اور اہم کام ہے، حدیث شریف میں نماز عصر کی اہمیت بیان کی گئی ہے، رسول کریم ﷺ اس عورت کی گفتگو اور پریشانی سے بھانپ گئے کہ یہ عورت نماز عصر کی اہمیت بارے پوچھتی ہے ورنہ باقی جتنے احکامات ہیں وہ تو ظاہر باہر ہیں، بدکاری کی سزا قرآن میں بتائی گئی ہے، سنگساری کا حکم بھی معلوم ہے، بچے کو مارنے کا حکم بھی بتایا گیا ہے، پھر جس برتن میں بچے کو مارا گیا اس میں موجود سرکے کو بیچنا اور اس کا حکم بھی عام فہم ہے، اگر کوئی بات پوشیدہ تھی تو وہی نماز عصر کی اہمیت تھی جس کو بھانپتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اس کی اہمیت بیان فرمائی۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ نماز عصر پر دن کی نیکیوں کا اختتام ہوتا ہے، تو گویا یہ توبہ کی طرح ہے کہ اس پر اعمال ختم کر دیے جاتے ہیں، تو جس طرح توبہ کی وصیت ضروری ہے اسی طرح صلاۃ العصر کی وصیت بھی ضروری ہے، کیونکہ اعمال کا مدار ان کے خاتمے پر ہوتا ہے، تو اس نماز کی شان عظمت کے باعث اس کی قسم کھائی گئی۔

تو مکلف آدمی کو اس بات کی وصیت کرنا کہ وہ اس نماز کو اپنے وقت پر ادا کرے اس طرف اشارہ ہے کہ اس سے وہ نقصان سے فائدے کی طرف لوٹ جائے گا، جیسے اگلی آیات میں استثنائی شکلیں موجود ہیں کہ ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والے، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرنے والے لوگ نقصان اٹھانے والوں میں نہیں ہوں گے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ تین لوگوں کی طرف قیامت کے دن (نظر رحمت سے) نہیں دیکھیں گے، نہ ان سے بات کریں گے اور نہ ان کا تزکیہ کریں گے، ان میں نماز عصر کے بعد جھوٹی قسم کھانے والے کا ذکر بھی ہے۔ (تفسیر الکبیر للرازی)

چوتھا قول یہ ہے کہ یہاں کھائی گئی قسم نبی کریم ﷺ کے زمانے کی قسم ہے، اس پر اہل علم نے نبی

کریم ﷺ کے فرمان سے دلیل لی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا إِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مَثَلُ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ مِنَ الْفَجْرِ إِلَى الظُّهْرِ بِقِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ الْيَهُودُ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ مِنَ الظُّهْرِ إِلَى الْعَصْرِ بِقِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ النَّصَارَى، ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ مِنَ الْعَصْرِ إِلَى الْمَغْرِبِ بِقِيرَاطَيْنِ، فَعَمِلْتُمْ أَنْتُمْ، فَغَضِبَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى وَقَالُوا: نَحْنُ أَكْثَرُ عَمَلًا وَأَقَلُّ أَجْرًا فَقَالَ اللهُ: وَهَلْ نَقَصْتُ مِنْ أَجْرِكُمْ شَيْئًا، قَالُوا: لَا، قَالَ: فَهُذَا فَضْلِي أُوتِيهِ مَنْ أَشَاءُ، فَكُنْتُمْ أَقَلَّ عَمَلًا وَأَكْثَرَ أَجْرًا

تمہاری مثال اور تم سے پہلے والے لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے اجرت پر ایک مزدور کام پر لگایا، پھر کہا کہ فجر سے ظہر تک ایک قیراط پر کون کام کرے گا؟ یہودیوں نے فجر سے ظہر تک ایک قیراط پر کام کیا، پھر کہا کہ ایک قیراط کے بدلے ظہر سے عصر تک کون کام کرے گا؟ چنانچہ عیسائی نے ایک قیراط میں اس وقت کام کرنا قبول کیا، پھر کہا کہ عصر سے مغرب تک دو قیراط کے عوض کون کام کرے گا؟ چنانچہ تم لوگوں نے دو قیراط کے عوض اس وقت کام کیا، اس کے بعد یہودیوں اور عیسائیوں کو غصہ آگیا اور انہوں نے کہا کہ ہم نے کام زیادہ کیا اور اجرت و مزدوری تھوڑی ملی، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہاری مزدوری میں سے کچھ کم کیا؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، فرمایا کہ یہ میرا فضل و کرم ہے میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، پس تم عمل کے لحاظ سے تھوڑے اور اجرت و مزدوری کے لحاظ سے زیادہ ہو۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عصر وہ زمانہ ہے جو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے ساتھ مختص ہے، اس لیے یقینی طور پر اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے تو اللہ نے جو فرمایا کہ والعصر اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمانے کی قسم جس میں آپ ہیں، اللہ اسی زمانے کی اس آیت میں قسم کھا رہا ہے، جس طرح اللہ نے اس جگہ کی قسم کھائی جس میں آپ ﷺ جلوہ افروز تھے وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (الْبَلَدِ: ۲) اور آپ ﷺ اس شہر میں اترے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کی عمر مبارک کی قسم سورۃ الحجر میں کھائی۔ لَعَمْرُكَ (الْحِجْرِ: ۷۲)

گویا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں تیرے زمانے کی قسم، تیرے شہر کی قسم، تیری عمر کی قسم، یہ

ساری باتیں گویا کہ آپ ﷺ کے لیے ظرف ہیں، جب ظرف کی تعظیم کا یہ حال ہے تو مظروف کی تعظیم کا کیا حال ہو گا، پھر قسم کی ایک توجیہ یوں بھی کر لیجیے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ اے میرے حبیب! آپ ﷺ ان کے پاس حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے انہیں دعوت دی مگر ان لوگوں نے آپ ﷺ سے روگردانی کی، اعراض کیا، منہ موڑا اور آپ کی طرف توجہ نہیں دی تو یہ ان لوگوں کے لیے کس قدر بڑا نقصان ہے، تو ان کی رسوائی کس قدر بڑی ہو گی۔ (الکبیر)

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ : بے شک ہر انسان نقصان میں ہے۔ الانسان پر الف لام کے بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ جنس کے لیے ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ معہود سابق کے لیے ہو، اسی لیے حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس بارے میں دو قول ذکر فرمائے ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ الانسان پر الف لام جنسی ہے، جس سے مراد ابن آدم ہے، استثناء انہیں حاصل ہو گا جنہیں اگلی آیت میں استثناء دیا گیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں انسان سے معین شخص مراد ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گروہ مشرکین ہے، جیسے ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبد المطلب، جب کہ حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب کہ خبر مرفوع میں ہے کہ جس کے بارے میں نازل ہوئی وہ ابو جہل ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ نقصان میں ہیں، تو اللہ نے قسم کھا کر ان کے وہم و گمان کے بالکل الٹ کر دیا۔

اَلْخُسْرُ اَوِ الْخُسْرَانُ دونوں کفر اور کفران کے وزن پر ہیں، دونوں کا معنیٰ نقصان، گھاٹا خسارہ، رأس المال کا ضائع ہو جانا، اصل پونجی کا برباد ہو جانا، پھر اس میں دو تفسیریں ہیں اور یہ اس لیے کہ جب ہم الانسان کے الف لام کو جنس پر محمول کریں، تو اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا بندہ مومن کے سوا ہر شخص کے نفس اور عمر کی بربادی اور تباہی، سوائے عمل کرنے والے مومن کے، کیونکہ اس کی عمر اور اس کا مال برباد نہیں ہو گا، نقصان میں نہیں ہو گا۔

اس لیے کہ اس نے اپنی جان اور اپنی عمر سے ابدی سعادت حاصل کی ہے، اگر ہم الانسان

سے مراد کافر لیں تو اس سے مراد ضلالت اور کفر ہے، مگر ان میں سے جو ایمان لے آئے تو اس وقت وہ خسارے اور نقصان سے نکل کر فائدے میں چلا جائے گا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے لفی خسر فرمایا اور لفی الخسر نہیں فرمایا، یعنی خسر نکرہ ہے اور الخسر معرفہ ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نکرہ کبھی تعظیم کے لیے آتا ہے اور کبھی تحقیر کے لیے آتا ہے، اگر ہم اسے نکرہ پر محمول کرتے ہیں تو یہ معنیٰ ہو گا کہ انسان البتہ بڑے نقصان میں ہے جس کا کنہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کتنے اور کس قدر نقصان میں ہے، اس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر بڑی ہستی کے حق میں کوئی گناہ کرے گا وہ گناہ اسی قدر بڑا ہو گا، یا وہ بڑی نعمتوں کے مقابلے میں ہو گا، دونوں صورتیں بندے کا اپنے رب کے حق میں گناہ کرنے کی صورت میں حاصل ہوتی ہیں، ایسی صورت میں یقینی طور پر گناہ بڑا ہی ہو گا، اگر ہم اسے معرفہ پر محمول کرتے ہیں تو معنیٰ یہ ہو گا کہ بندے کا نقصان شیطان کے نقصان کے مقابلے میں کم ہی ہے، اس میں ایک بشارت بھی ہے کہ میری مخلوق میں تجھ سے زیادہ نافرمان کون ہے؟ لیکن امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلے والی تاویل ہی صحیح ہے۔ (کبیر)

امام ابو اسحٰق احمد بن ابراہیم الثعلبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس سورت کو پڑھا اور آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو جائیں، فدا ہو جائیں، اس آیت کی کیا تفسیر ہے؟ آپ نے فرمایا: والعصر سے مراد ہے دن کا آخری حصہ، ان الانسان لفی خسر سے مراد ہے، ابو جہل بن ہشام، الا الذین امنوا، سے مراد ہے ابو بکر صدیق اور عملوا الصلحت سے مراد ہے، عمر بن الخطاب وتواصوا بالحق سے مراد ہے، عثمان بن عفان، وتواصوا بالصبر، سے مراد ہے، علی بن ابی طالب۔

امام الحسن بن مسعود بغوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، اس آیت میں الانسان سے مراد کافر ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد مومنین کا استثناء فرمایا ہے۔

امام عبد الرحمان بن علی بن محمد جوزی فرماتے ہیں انسان خسارہ سے الگ نہیں ہو سکتا، کیونکہ خسارہ کا معنیٰ ہے: اصل مال کا ضائع ہو جانا اور انسان کا اصل مال اس کی عمر ہے اور وہ بہت کم اپنی عمر کے ضائع

ہونے سے بچ سکتا ہے کیونکہ انسان کے اوپر جو ساعت بھی گزر رہی ہے، اس میں اگر وہ گناہوں میں مصروف ہے تو اس کے نقصان میں کوئی شک نہیں ہے اور اگر اس کی وہ ساعت مباح کاموں میں گزر رہی ہے، پھر بھی اس کا نقصان اس لحاظ سے ہے کہ اس کو ان کاموں پر ثواب نہیں ملا اور اگر اس کی وہ ساعت اطاعت اور عبادت میں گزر رہی تو وہ جس کیفیت سے عبادت کر رہا ہے، اس سے عمدہ اور اعلیٰ کیفیت سے بھی عبادت کرنا ممکن ہے کیونکہ خشوع اور خضوع کے درجات غیر متناہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال اور قہر کے مراتب بھی غیر متناہی ہیں تو انسان کو اللہ تعالیٰ کی جس قدر زیادہ معرفت ہو گی، اس کو اللہ تعالیٰ کا اتنا زیادہ خوف ہو گا اور جتنا زیادہ خوف ہو گا، وہ اتنی زیادہ تعظیم سے اللہ کی عبادت کرے گا اور اعلیٰ عبادت کو ترک کرنا اور ادنیٰ عبادت کو اختیار کرنا یہ بھی ایک قسم کا نقصان ہے، پس واضح ہو گیا کہ ہر انسان کسی نہ کسی قسم کے خسارے اور نقصان میں مبتلا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے۔ آمنوا ایمان سے ہے، ایمان باب افعال کی مصدر ہے، ایمان کا معنیٰ تصدیق کرنا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے اختیار مخبر کی طرف یا مخبر عنہ کی طرف سچائی کو منسوب کرو، ایمان امن سے ماخوذ ہے، باب افعال کا ہمزہ متعدی بنانے کے لیے ہے یا صیرورت کے لیے ہے، متعدی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جس کی تصدیق کی گئی ہے اس کو تکذیب سے امن میں کر دیا گیا ہے، صیرورت کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس کی تصدیق کی گئی ہے وہ امن والا ہو گیا ہے، اعتراف اور اقرار کی تضمین کی وجہ سے باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، آمن الرسول بما انزل الیہ اور قبول تضمین کی وجہ سے لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، فامن لہ لوط تصدیق کا اصل محل دِل ہے، زبان صرف دِل کی ترجمانی کرتی ہے۔ (ملخص از الخیر الجاری شرح صحیح البخاری)

شریعت میں ایمان کی تعریف یہ ہے الایمان ھو التصدیق بجمیع ماجاء بہ النبی ﷺ، ایمان ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا ہے جو نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تصدیق کی اور اس کی اطاعت اور عبادت کا اقرار کیا اور نیک اعمال کئے یعنی فرائض اور واجبات کو ادا کیا اور سنن اور مستحباب پر کار بند رہے اور گناہوں ونافرمانیوں کا ارتکاب نہیں کیا اور گناہ کبیرہ اور صغیرہ سے بچتے رہے اور دوسروں کو بھی کتاب اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیتے رہے اور صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اوقات، اپنی زندگی اور اپنی عمر کام والی بنائی اور دنیا میں بہترین فائدہ اٹھایا ان لوگوں کو نقصان وخسران نہیں ہوگا۔

ایمان کی اہمیت سے کسی مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے، ایمان کی بڑی اہمیت اور شان ہے، دنیا اور آخرت دونوں جہان میں مسلمان ومومن کے لیے ایمان میں بڑے فائدے اور منافع ہیں، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں اور خیریں ایمانِ صحیح پر موقوف ہیں، ایمان سب سے بڑا مطلوب ومقصود ہے، ایمان ہی ایسی چیز ہے جس سے بندہ مومن حیاتِ طیبہ سعیدہ میں اپنا وقت گزارتا ہے، ایمان ہی ایسی چیز ہے جس سے بندہ مومن ناپسندیدہ باتوں اور شرور وفتن، شدائد و مشکلات سے نجات پاتا ہے، ایمان ہی کی بدولت یہ آخرت کا ثواب پاتا ہے اور ہمیشہ کی نعمتیں اور بھلائیاں سمیٹتا ہے جو کبھی زوال پذیر نہیں ہوں گی۔

قرآن کریم کی اس تین آیات پر مشتمل سورت میں ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کے بارے میں ہی فرمایا گیا ہے کہ یہ نقصان والے نہیں ہیں، قرآن کریم کی سورۃ النحل میں بہت ہی واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل: ۹۷) مردوں اور عورتوں میں سے جس نے نیک عمل کیا درانحالیکہ وہ مومن تھا ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور اسے جو کچھ وہ کرتا تھا اس سے بہترین اجر دیں گے۔

آیت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات تو سمجھ میں بہت اچھی طرح آرہی ہے کہ اچھے اعمال ایمان والوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ کرسکتے ہیں، خیراتی کام انجام دے سکتے ہیں، انسانی فلاح و بہبود کے کام کرسکتے ہیں، ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ غیر مسلموں اور کافروں نے بھی بہت بڑے بڑے اور اچھے اچھے کام کیے ہیں اور ہر دیکھتی آنکھ کو دکھائی دیتے ہیں مگر وہ لوگ اِیمان واِیقان کی دولت سے خالی ہیں، اس لیے انہیں ان کے کیے کا اجر دگنا، یا بہترین کیا کچھ بھی نہیں ملے گا، اس لیے کہ وہ ایمان کی عظیم دولت سے محروم رہے، اس لیے ان کے اچھے کام کا صلہ دنیا میں ہی کسی نہ کسی شکل میں مل سکتا ہے، آخرت میں ان کے لیے کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ آخرت کے اجر و ثواب کے لیے ایمان ضروری ہے، اِیمان کی بدولت ہی خسارے سے بچا جاسکے گا۔

سورۃ الاسراء میں واضح فرمایا کہ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا اور جو شخص آخرت (کا فائدہ) چاہے اور اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرے جیسی اس کے لیے کرنی چاہیے، جبکہ وہ مومن بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی کوشش کی پوری قدر دانی کی جائے گی۔ (سورۃ الاسراء ۱۹)

انسانی چاہت یہ ہو کہ اسے آخرت میں فائدہ ملے، اس کے لیے یہاں دوڑ دھوپ بھی اچھی بھلی کرلے مگر ایمان سے خالی ہو تو اس کی یہ کاوش و کوشش، تگ و تاز اور سعی شب و روز سب بیکار چلی جائے گی، ایمان کے ساتھ ہی اس کی مساعی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی، ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

پھر سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ (۷۵) اور جو شخص اس کے پاس مومن بن کر آئے گا جس نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو ایسے ہی لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔

بلند درجات کے حصول کی خاطر ایمان ضروری ہے، ایمان کے بعد نیک اعمال بہت ضروری ہیں، محض دعوائے ایمانی زبانی کلامی کے ساتھ بلند درجات تک رسائی مشکل بلکہ ناممکن ہے، اس کے

لیے ایمان شرطِ اولین اور اعمال صالحہ شرط ثانی ہے۔

پھر سورۃ الکہف میں ایمان والوں اور نیک اعمال سر انجام دینے والوں کے لیے بہت ہی بہترین خوشخبری ہے، جس میں انہیں بتایا گیا کہ جنت الفردوس ان کی مہمانی کی جگہ ہو گی، فردوس میں دائمی مسکن ہو گا، ارشاد ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (۱۰۷) خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا (الکھف ۱۰۸) بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کی میزبانی فردوس کے باغ ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہ وہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہیں گے۔

قرآنی آیات میں ایمان کے ساتھ ہی اعمال صالحہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ایمان کے بعد نیک اعمال کی بجا آوری بہت ہی ضروری چیز ہے، دونوں چیزیں جہاں یکجا ہوں گی وہاں دنیا اور آخرت کی سعادتیں سمیٹ جائیں گی۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کو بہت سی ایسی آیات دکھائی دیں گی جن میں ایمان اور عمل صالح کا باہمی تعلق چولی دامن کی طرح دکھائی دے گا اور قرآن وسنت کی واضح نصوص میں یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ ایمان کی عمارت چھ اصولوں پر کھڑی ہے، ان میں پہلا ایمان باللہ، دوسرا ایمان بالملائکہ، تیسرا ایمان بالکتب، چوتھا ایمان بالرسل، پانچواں ایمان بالآخرت اور چھٹا اللہ کی اچھی اور بری تقدیر پر ایمان، ان چھ کا ذکر قرآن وسنت میں کئی مقامات پر موجود ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (النساء: ۱۳۶) اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری تھی۔ اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور یوم آخرت کا انکار کرے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دور جا پڑا ہے۔

سورۃ البقرہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اصل نیکی کا ذکر کیا گیا، ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ (البقرۃ: ۱۷۷) نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کردیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں اور تنگی اور تکلیف میں نیز جنگ کے وقت صبر واستقلال کے خوگر ہوں، ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (البقرۃ: ۲۸۵)

یہ رسول (یعنی حضرت محمد ﷺ اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی مغفرت کے طلبگار ہیں، اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

مشہور حدیث جبریل میں ہے کہ حضرت جبریل امین نے حضرت نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے ایمان کے بارے میں فرمایئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں جواب دیا کہ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ (مسلم، اصول

الایمان فی ضوء الکتاب والسنہ) ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ پر ایمان لائیں، اس کے فرشتوں پر ایمان لائیں، اس کی کتابوں پر ایمان لائیں، آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور یہ کہ آپ اللہ کی اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائیں۔

یہ وہ چھ اصول اور بنیادیں ہیں جن پر ایمان کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، کسی شخص کا ایمان اس وقت تک نہیں وجود میں آتا جب تک ان چھ اصولوں پر ایمان نہیں لاتا، یہ اصول ایک دوسرے کے ساتھ مترابط اور متلازم ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، ان اصولوں میں سے کچھ پر ایمان لانا یہ باقی والے اصولوں پر ایمان لانے کو مستلزم ہے، ان میں سے کسی اصول کا کفر باقیوں کے کفر کو مستلزم ہے، اسی لیے تاکیدی طور پر ہر مسلمان پر حق ہے کہ ان اصولوں کی عظمت کا خیال رکھے، ان کے بارے میں علم و تعلم و تحقیق رکھے۔

العصر کی اس آیت کے ذیل میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کو خسارہ سے بچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، اول خدا اور رسول پر ایمان لائے اور ان کی ہدایات اور وعدوں پر خواہ دنیا سے متعلق ہوں یا آخرت سے، پورا یقین رکھے۔

دوسرے اس یقین کا اثر محض قلب و دماغ تک محدود نہ رہے بلکہ جوارح میں ظاہر ہو اور اس کی عملی زندگی اس کے ایمان قلبی کا آئینہ ہو۔

تیسرے محض اپنی انفرادی صلاح و فلاح پر قناعت نہ کرے بلکہ قوم و ملت کے اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھے، جب دو مسلمان ملیں ایک دوسرے کو اپنے قول و فعل سے سچے دین اور ہر معاملہ میں سچائی اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہیں۔

چوتھے ہر ایک کو دوسرے کی یہ نصیحت و وصیت رہے کہ حق کے معاملہ میں اور شخصی و قومی اصلاح کے راستہ میں جس قدر سختیاں اور دشواریاں پیش آئیں یا خلاف طبع امور کا تحمل کرنا پڑے، پورے صبر و استقامت سے تحمل کریں، ہرگز قدم نیکی کے راستہ میں ڈگمگانے نہ پائے، جو خوش قسمت حضرات ان چار اوصاف کے جامع ہوں گے اور خود کامل ہو کر دوسروں کی تکمیل کریں گے ان کا نام

صفحات دہر پر زندہ جاوید رہے گا، اور جو آثار چھوڑ کر دنیا سے جائیں گے وہ بطور باقیات صالحات ہمیشہ ان کے اجر کو بڑھاتے رہیں گے، فی الحقیقت یہ چھوٹی سی سورت سارے دین وحکمت کا خلاصہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ایمان کے بعد اعمال صالحہ لازم ہیں، ان کو مختصراً ہم یوں عرض کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے انہیں بر ضاور غبت بجالانا اور جن سے اللہ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے روکا ہے ان سے اپنے کو بچائے رکھنا، کلمہ اسلام کے اقرار کے بعد ایک مسلمان پر پنجگانہ نماز کی ادائیگی فرض ہے، سال کے بعد ایک ماہ کے روزے فرض ہیں، صاحب نصاب مسلمان پر سال بعد زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے، صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار حج فرض ہے، اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جب جہاد کا پکارا ہو جائے تو میدان جہاد کی طرف نکلنا لازم ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے علاوہ بھی نیکی کے بے شمار کام ہیں، ان میں قرآن کریم جیسی عظیم الشان اور مقدس صحیفہ آسمانی کی تلاوت بڑی اہم عبادت ہے، اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، صبح وشام کے اوقات میں اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا بھی نیک اعمال کی فہرست میں ایک گراں قدر کام ہے، طلب رزق حلال بھی اہم نیک عمل ہے، حقوق اللہ کی رعایت کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی طرف دھیان دینا بھی نیک اعمال میں سے ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اہم کام ہے، اطاعت الٰہی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول بھی اہم نیک عمل ہے۔

ایک انسان ہونے کے ناطے انسان خطاکار ہے، انسانوں میں معصوم عن الخطاء صرف انبیاء کرام کی ذوات قدسیہ ہی ہوتی ہیں، خطاکار ابن آدم کی خطاؤں کی معافی کے لیے بہترین چیز توبہ اور استغفار ہے، قرآن وسنت کی تعلیمات میں جابجا توبہ اور استغفار کی تلقین وترغیب دی گئی ہے، توبہ اور استغفار کے باعث انسان کی خطائیں معاف کردی جاتی ہیں، اسی طرح اعمال صالحہ بجالانے کی وجہ سے بھی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں، جس طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ نیکیاں خطاؤں کو ختم کردیتی ہیں، اس لیے ایک مسلمان توبہ اور استغفار کو اپنا وظیفہ بنالے۔

انسان نیک اعمال کی بدولت اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلیتا ہے، نیک اعمال کو مزین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ توبہ اور استغفار کرتا رہے، خوف خداوندی اور خوف آخرت کو ہمیشہ سامنے رکھے، زہد و قناعت اختیار کرے، صبر و شکر سے زندگی بسر کرے، اخلاص و صدق کو حرز جاں بنائے، توکل اور رضا بر قضا اختیار کرے۔

نیک اور صالح اعمال کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ ہمت کرتے ہوئے ان امور سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے تاکہ نیک اعمال برباد اور تباہ نہ ہو جائیں، جن کاموں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے ان کی ایک طویل فہرست ہے، ان کو گناہ کبیرہ کہا جاتا ہے، الکبائر کے نام سے علامہ شمس الدین محمد الذہبی رحمہ اللہ نے باقاعدہ ایک کتاب لکھی ہے، جو عربی زبان میں ہے، اس فہرست میں جن گناہوں کو لکھا گیا ہے وہ یہ ہیں، ان سے بچا جائے۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، ناحق کسی کو قتل نہ کیا جائے، جادوگری نہ کی جائے، نماز ضائع نہ کی جائے، زکوٰۃ کی ادائیگی سے کنی نہ کترائی جائے، بلاعذر رمضان کے روزے ترک نہ کیے جائیں، استطاعت ہو جائے تو حج ترک نہ کیا جائے، والدین کی نافرمانی نہ کی جائے، رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی نہ کی جائے، بدکاری نہ کی جائے، خلاف فطرت شہوت رانی سے گریز کیا جائے، یتیم کا مال ظلماً نہ کھایا جائے، اللہ اور رسول اللہ پر جھوٹ نہ باندھا جائے، میدان جہاد سے نہ بھاگا جائے، حاکم بن جائے تو رعایا پر ظلم و ستم نہ ڈھائے، گھمنڈ اور تکبر نہ کرے، جھوٹی گواہی نہ دے، شراب نہ پی جائے، جوا نہ کھیلا جائے، پاک دامن عورتوں پر تہمت نہ لگائی جائے، مال غنیمت میں خیانت نہ کی جائے، چوری نہ کی جائے۔

ڈاکہ زنی نہ کی جائے، جھوٹی قسم نہ کھائی جائے، ظلم نہ کیا جائے، حرام مال نہ کھایا جائے، خودکشی نہ کی جائے، جھوٹ کی عادت ختم کی جائے، غلط فیصلے نہ کیے جائیں، رشوت ستانی سے بچا جائے، عورتیں مردوں اور مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے سے بچیں۔

بڑے گناہوں میں ایک گناہ پیشاب کی چھینٹوں سے نہ بچنا بھی ہے، اس لیے پیشاب کی چھینٹوں سے بچا جائے، ریاکاری نہ کی جائے، علم دین دنیا کمانے کے لیے نہ سیکھے بلکہ اللہ کی رضاجوئی کے لیے سیکھے، علم دین سیکھنے کے بعد اسے چھپانا نہیں چاہیے، امانت میں خیانت نہ کی جائے، احسان کر کے جتلایا نہ جائے، تقدیر کو جھٹلایا نہ جائے، دوسروں کے عیوب تلاش نہ کیے جائیں، چغل خوری نہ کی جائے، لعنت ملامت نہ کی جائے، وعدہ خلافی نہ کی جائے، غیب کی خبریں بتلانے والے کاہنوں اور نجومیوں کی تصدیق نہ کی جائے۔

بیوی شوہر کی نافرمانی نہ کرے، مرنے والوں پر ماتم اور نوحہ نہ کیا جائے، بغاوت اور سرکشی نہ کی جائے، کمزوروں پر زیادتی نہ کی جائے، پڑوسی کو تکلیف نہ دی جائے، مسلمانوں کو تکلیف نہ دی جائے اور انہیں برا بھلا نہ کہا جائے، اللہ کے نیک بندوں کو ستایا نہ جائے، شلوار ٹخنوں سے نیچی نہ رکھی جائے، مرد ریشم اور سونا استعمال نہ کریں۔

غلام اپنے آقا کے پاس سے بھاگے نہیں، غیر اللہ کے نام پر جانور وغیرہ ذبح نہ کرے، جان بوجھ کر غلط نسب بیان نہ کرے، لڑائی جھگڑا نہ کرے، اپنی ضرورت سے زائد پانی دوسروں سے نہ روکے، ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نڈر نہ ہو جائے۔

بلاعذر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا نہ چھوڑے، جمعہ کی نماز پڑھنا نہ چھوڑے، وصیت میں نافرمانی نہ کرے، دھوکہ نہ دیا جائے اور فریب دہی سے باز رہے، مسلمانوں کے خلاف جاسوسی نہ کی جائے، جاندار کی تصویریں بنانے سے گریز کیا جائے، حضرات انبیاء کرام کی توہین و تحقیر نہ کی جائے، قرآن اور دینی شعائر کی توہین و تحقیر نہ کرے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کی گستاخی و بے ادبی نہ کی جائے اسی طرح اولیاء اللہ کی بے ادبی اور بے اکرامی نہ کی جائے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ: کی تفسیر میں تین قول ہیں: یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ دوسروں کو بھی توحید پر ایمان لانے کی تلقین کرتے رہے، قتادہ نے کہا: وہ قران کے احکام پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے رہے،

سدی نے کہا: وہ اللہ کی اطاعت اور عبادت کی تلقین کرتے رہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ آیت کے دوسرے حصے کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ بات جان لیجیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کے حق میں یہ بیان کیا کہ وہ نقصان اٹھانے والوں اور گھاٹے میں جانے والوں سے نکل گئے اور ارباب سعادت میں سے ہو گئے اس طرح کہ انہوں نے اس چیز کو اختیار کیا جو انہیں ثواب کے ساتھ کامیابی و کامرانی کی طرف لے گئی، عذاب و سزا سے نجات کی طرف لے گئی، اس کے بعد ان کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ وہ طاعات اور نیکیوں کے ساتھ شدت محبت کے باعث صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے جو ان کے ساتھ ہی خاص رہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی اپنے طریقے کے مطابق وصیت کرتے ہیں تاکہ وہ دوسروں کی نیکیوں اور طاعات کا بھی سبب بن جائیں، جیسے اہل دین کا ان نیکیوں اور طاعات پر ہونا مناسب ہے، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التَّحْرِيمِ: ٦) اے اہل ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

تو حق بات کی تلقین کرنا اس میں وہ تمام دین داخل ہے جس کا تعلق علم و عمل سے ہے، واجب کے قیام کے لیے نفس کو مشقت برداشت کرنے اور حرام سے اجتناب کرنے کی تلقین کرنا یہ بھی ان کاموں میں سے ہے جن کی وجہ سے انسان خسارے، نقصان، ٹوٹے اور گھاٹے سے باہر نکل آتا ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: کی تفسیر میں بھی تین قول ہیں: قتادہ نے کہا: وہ اللہ کی فرماں برداری کی نصیحت کرتے رہے، ہشام بن حسان نے کہا: وہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے فرائض پر عمل کرنے کی تائید کرتے رہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ حرام کام کرنے کی خواہش پر صبر کرنے اور شہوت اور غضب کے تقاضوں پر صبر کرنے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی مشقت پر صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ (النکت والعیون)

☆☆☆☆

الھوزہ

غیبت، طعن، مال اور جہنم

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ {۱} الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ {۲} يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ {۳} كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ {۴} وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ {۵} نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ {۶} الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ {۷} اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ {۸} فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ {۹} الھمزۃ.

جواب ترجمہ: بڑی خرابی ہے اس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا (اور) منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو۔ جس نے مال اکٹھا کیا ہو اور اسے گنتا رہتا ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہر گز نہیں! اس کو تو ایسی جگہ میں پھینکا جائے گا جو چورا چورا کرنے والی ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ۔ جو دلوں تک جا چڑھے گی۔ یقین جانو وہ ان پر بند کر دی جائے گی۔ جبکہ وہ (آگ کے) لمبے چوڑے ستونوں میں (گھرے ہوئے) ہوں گے۔

ویل کلمہ عذاب ہے یا جہنم کی وادی ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسروں کی پیٹھ پیچھے غیبتیں کرتے ہیں اور منہ پر طنز و طعنوں کے نشتر چلاتے ہیں، یہ آیات امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ جیسے بدقماش انسانوں کے بارے میں اتاری گئیں جو نبی کریم ﷺ اور ان کے جانثاروں، فداکاروں، رضاکاروں اور خدمت گاروں کی غیبتیں کیا کرتے تھے۔

ان لوگوں کا مقصد حیات مال جمع کرنا اور اسے گن گن کر رکھنا تھا، وہ اس مال و دولت کو اپنی بڑائی اور عظمت کا ذریعہ اور حیاتِ دنیا میں ہمیشہ رہنے کا وسیلہ سمجھتے تھے، انہیں یہاں سمجھایا اور بتایا جا رہا ہے کہ معاملہ یوں نہیں جس طرح وہ گمان کرتے ہیں، یہ مال وزر ایسی چیز ہے جو انہیں جہنم میں پھنکوائے گی، یہ جلانے والی آگ میں جھونکے جائیں گے، یہ آگ انہیں چورا چورا بنا دے گی، ان کے اجسام

وابدان کو ادھیڑ ڈالے گی، یہ آگ ان پر اس طرح ڈھانپ دی جائے گی کہ یہ کہیں نکل کر بھاگ بھی نہیں سکیں گے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ: بڑی خرابی ہے اس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا (اور) منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے سورۃ کے آغاز میں لفظ ویل استعمال فرمایا ہے، ویل مذمت اور ناراضگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، یہ کلمہ تباہی اور بربادی کا ہے جو ہر پریشان حال، مکروب کی پریشانی کے دوران اس کی زبان سے نکلتا ہے، اس کی اصل عربی زبان میں وی لفلان ہے کہ فلاں شخص کے لیے ہلاکت، تباہی، بربادی، پھر عربی زبان میں بہت زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے لفلان کا لام اس کے ساتھ جڑ گیا اور یہ ویل کہا سنا اور پڑھا جانے لگا۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات مروی ہے کہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر اللہ نے لفظ ویل استعمال فرمایا، جب کہ دوسرے مقام پر **وَلَكُمُ الْوَيْلُ** (الأنبیاء: ۱۸) فرمایا گیا، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں تباہی اور بربادی میں پڑنے والوں نے خود ہی تمنا کی تھی کہ اگر ہم ظالموں میں سے ہیں تو ہمارے لیے ہلاکت، تباہی اور بربادی ہو، جیسے ارشاد ہے **يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ** (الأنبیاء: ۱۴) تو ان کے جواب میں اللہ نے ولکم الویل ارشاد فرمایا، اور یہاں سورۃ ہمزہ میں نکرہ ذکر فرمایا، اس لیے کہ اس تباہی، بربادی اور ہلاکت کی کنہ اور حقیقت اللہ ہی جانتا ہے کہ کس قدر ہو گی؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ویل ایسا کلمہ ہے جو قباحت اور برائی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، ویس ایسا کلمہ ہے جو کسی چیز کی حقارت اور چھوٹائی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ویح ایسا کلمہ ہے جس میں رحمانہ اور ترحمانہ جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے، یہاں جو ویل استعمال کیا گیا ہے اس میں غیبت اور طعن زنی جیسے فعل کی قباحت بیان کی گئی ہے، اور اس کی قباحت پر متنبہ کیا گیا ہے۔

اہل علم کا اس سورت میں بیان کی گئی وعید کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ وعید ہر اس شخص

کے لیے ہے جو اس طریقہ کے ساتھ برے، ردی اور بے کار افعال اختیار کرتا ہے یا کچھ اقوام مخصوصہ معینہ کے لیے خاص ہے، ارباب تحقیق کہتے ہیں کہ یہ وعید ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو اس طرح کرے گا چاہے وہ کوئی بھی ہو، کیونکہ خاص سبب عام لفظ کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔

بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ یہ معین لوگوں کے ساتھ خاص ہے، پھر حضرت عطاء، امام کلبی فرماتے ہیں کہ یہ سورت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو لوگوں پر طعن کرتا تھا اور ان کی غیبتیں کرتا تھا، خصوصاً حضرت نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ اس کا معاملہ اس طرح کا تھا، حضرت مقاتل کہتے ہیں کہ یہ سورت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نبی کریم ﷺ کی پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتا تھا جب کہ آپ ﷺ کے روبرو آپ ﷺ پر طعن کیا کرتا تھا، محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ہمیشہ سے یہ بات سنتے رہے ہیں کہ یہ سورت امیہ بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت فراء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ کا عام ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین اور مخصوص شخص مراد ہو، جیسے ایک انسان آپ سے کہے کہ میں کبھی بھی آپ سے نہیں ملوں گا تو آپ اسے کہیں کہ ہر وہ شخص جو مجھے نہیں ملے گا میں بھی اسے نہیں ملوں گا، جب کہ آپ اس عام جملہ سے وہی معین شخص مراد لے رہے ہیں، یہی وہ چیز ہے جسے اصول فقہ میں تخصیص عام بقرینہ عرف کا نام دیا جاتا ہے۔

مفسر قرآن شیخ عبد الحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہ دو قسم کے ہیں، اول حقوق اللہ میں کوتاہی یا تجاوز کرنا، عبادت نہ کرنا، زنا کرنا وغیرہ، دوم وہ جو حقوق العباد سے متعلق ہیں جیسا کہ کسی کا حق ادا نہ کرنا یا تکلیف و ایذا بلاوجہ پہنچانا، آبروریزی کرنا، دلوں کو رنج پہنچانا خصوصاً خاصانِ خدا کی دل آزاری کرنا اور ان کی جو بندگانِ خدا کی اِصلاح و تعلیم کے لیے اپنی جان اپنا مال اپنا آرام نذر کر چکے ہوں۔

یہ قسم دوم کے گناہ ایسے برے ہیں کہ بغیر اس کے کہ جس کو ایذا دی گئی ہے وہ معاف نہ کرے تو توبہ و استغفار سے بھی معاف نہیں ہوتے اور نیز ان افعال قبیحہ سے جماعت میں تفرقہ پڑتا ہے، فساد کا

دروازہ کھلتا ہے، تمدن میں خلل واقع ہوتا ہے اور اس لیے قرآن مجید میں غیبت کو اپنے بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے اور اس کو زنا سے سخت بیان فرمایا ہے۔

اسی طرح لوگوں پر طعن کرنا، منہ چڑانا، ان پر ٹھٹھا کرنا، مضحکہ اڑانا، آواز اور ان کی صورت کی نقلیں کرنا یہ کمینہ اخلاق بڑے خسارہ کے باعث ہیں ان سے دنیا میں بھی خسارہ ہے، عداوت پیدا ہوتی ہے اور ایسے شخص کی عزت لوگوں کی نگاہوں میں نہیں رہتی خود اسی کو بے ہودہ اور مسخرہ کہنے لگتے ہیں اور آخرت میں تو اس دل آزاری کی وجہ سے وہ آگ ہے جو تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ان کے دلوں کو جلائے گی۔

اور یہ عیب جاہلوں بدبختوں میں زیادہ مروج ہوتا ہے اور لطف یہ کہ اس کو عیب نہیں بلکہ ہنر جانتے ہیں، مکہ کے قریش کافر اس بلا میں سخت مبتلا تھے، بالخصوص ولید بن مغیرہ و اخنس بن شریق و امیہ بن خلف یہ بدنصیب آنحضرت ﷺ کی بدگوئی کیا کرتے تھے اور غریب ایمانداروں کی نماز و عبادت کی نقلیں کر کے لوگوں کو ہنسایا کرتے اور نفرت دلایا کرتے تھے اور اسی سبب سے بعض مفسرین نے انہیں کے ان افعال قبیحہ کو سبب نزول قرار دیا۔ (تفسیر حقانی)

هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ: ان دونوں لفظوں کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ ① ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں، غیبت و بدگوئی کرنے والا۔ ② ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ اس کو کہتے ہیں جو روبرو بدگوئی کرے اور لمزہ اس کو کہتے ہیں جو پیٹھ پیچھے برا کہے۔ ③ قتادہ اس کے برعکس معنیٰ بیان کرتے ہیں۔ ④ حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ ہمزہ وہ ہے جو کسی کے نسب میں طعن کرے فلاں کمینہ ہے اس کی ماں ایسی تھی باپ ایسا تھا اس کی قوم ایسی ہے وہ شریف نہیں اور لمزہ وہ ہے کہ ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ اعضاء کے اشاروں سے کسی کی آبروریزی کرے جیسا کہ سفلوں کی عادت ہوتی ہے کہ آنکھ، بھوؤں یا منہ بنانے سے کسی کی بے عزتی کرنے کے لیے اشارے کیا کرتے ہیں۔ ⑤ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمزہ وہ ہے جو زبان سے برائی کرے اور لمزہ وہ ہے جو افعال سے یعنی اعضاء کے اشاروں سے اور سب اقوال کا مطلب ایک ہی ہے، یعنی طعن اور اظہار عیب، کسی کی

دل آزاری اور بے عزتی کرنا، چغل خوری اور دو میں لڑائی کرادینا اور ایک کی بات دوسرے سے کہہ کر رنج پیدا کرنا اور نقلیں کرنا اور آواز کھینچنا اور قہقہے اڑانا اور آوازیں نکالنا سب اس میں آگئے۔ (تفسیر حقانی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خرابی ہے اس کی کہ جو لوگوں کے ہنسانے کو جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے، خرابی ہے اس کی خرابی ہے اس کی۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملا اور پوچھا کہ حضرت نجات کا راستہ بتایئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو بند کر اور گھر میں بیٹھ اور اپنے گناہوں پر رویا کر۔ (مسند احمد، ترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن نہ طعنہ باز ہے، نہ لعنت کرنے والا ہے، نہ فحش بکنے والا ہے، نہ بے حیائی کرنے والا ہے۔ (ترمذی) یعنی صاحب ایمان کی شان نہیں کہ وہ لوگوں کو برا کہا کرے، فحش بکے، گالیاں دیا کرے، ننگا لچا بن جائے، جو منہ میں آئے بک دیا کرے اور اس کو آزادی سمجھے۔ (تفسیر حقانی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کیا ہے غیبت (بدگوئی) لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے، فرمایا اپنے بھائی کی ایسی بات ذکر کرنی جو اس کو بری معلوم ہو کسی نے عرض کیا کہ اگر دراصل اس میں وہ عیب ہو تو بھی غیبت ہے؟ فرمایا اگر عیب ہے اور تو نے بیان کیا تب ہی تو غیبت ہے ورنہ وہ تو بہتان ہے۔ (مسلم) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو اس کے عیب پر طعنہ زنی نہ کر، خدا اس پر رحم کرے گا تجھے اسی بلا میں مبتلا کر دے گا۔ (ترمذی)

ہُمزہ اور لُمزہ فُعلہ کے وزن پر ایک صیغہ ہے جو مبالغہ کے لیے عرب کی زبان میں مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ ضحکۃ اس کو کہتے ہیں جو بہت ہنسا کرے اس صیغہ کے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس بدبخت کی یہ عادت ہوگئی اور اکثر ایسی بیماری میں مبتلا ہوا کرتا ہے، غالباً اس خبیث عادت کا سبب، کبر و تعلی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اس سے کہ جس کی بدگوئی کرتا ہے اچھا اور برتر سمجھتا ہے اور اس غرور و تعلی کے چند اسباب ہوتے ہیں، حسن و جمال، شرافت نسب و حسب، علم و ہنر اور سب سے

بڑھ کر مال ہے، یہ وہ نشہ ہے کہ انسان کو اندھا ہی کر دیتا ہے اور افلاس میں تو سارے غرور خاک میں مل جایا کرتے ہیں، اس لیے اب اس کے اس مایہ ناز کی حقیقت کھولتا ہے (حقانی)

قرآن کریم کی سورۃ الحجرات میں ان عیب چینوں اور عیب جوئی کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے، سورۃ القلم میں انہیں ھماز کہہ کر قابل مذمت ٹھہرایا گیا ہے، انہیں چغل خوری کے ساتھ پیش قدمی کرنے والے بتایا گیا ہے، لمز طعنے باز، لوگوں کی عزتیں اچھالنے والے، ان کی عزتوں میں ہاتھ ڈالنے والے، سورۃ الحجرات کی آیت گیارہ میں اللہ نے انہیں طعن زنی سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمزہ غیبتیں کرنے والے کو کہتے ہیں، لمزہ عیب لگانے والے کو کہتے ہیں، ابوزید فرماتے ہیں ہمزہ ہاتھ سے اور لمزہ زبان سے ایذا رسانی کرنے والے کو کہتے ہیں، ابوالعالیہ فرماتے ہیں ہمزہ رُودررُو اور لمزہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ کا معنیٰ علی الاعلان اور لمزہ کا معنیٰ ہے پوشیدہ طور پر ابروؤں آنکھوں سے ایذا دینا، اسی طرح ہمزہ اور لمزہ اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کو ایسے ایسے نام دیتا ہے جو لوگ پسند نہیں کرتے اور ایسا ولید بن مغیرہ کیا کرتا تھا، مگر یہ کام بڑے اور سردار لوگوں کے نہیں یہ تو سفلے، گرے پڑے اور نیچ لوگوں کے کام ہوتے ہیں۔ اس وعید میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو لوگوں کی باتوں، لوگوں کے افعال اور ان کی آوازوں کی نقلیں اتارتے ہیں تاکہ لوگ ان کی ان ایکٹنگ پر ہنسیں۔

حکم بن عاص نامی شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی نقلیں اتارا کرتا تھا، اسے مدینہ سے نکالا گیا تھا اور اس پر لعنت کی گئی۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ وہ شخص ہے جو اپنے ہم نشین کو طعنے دیتا ہے، آنکھوں کے اشاروں سے اس کی تحقیر کرتا ہے، لمزہ وہ شخص ہے جو اپنے بھائی کا برے الفاظ و انداز میں ذکر کرتا ہے، اس پر عیب لگاتا ہے۔

ابی الجوزاء کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس سے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی اللہ نے لفظ ویل کے ساتھ مذمت کی ہے تو حضرت ابن عباس فرمانے لگے کہ

اللہ نے یہاں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو لوگوں کی چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے مابین تفریق ڈالتے ہیں اور لوگوں میں عیب لگاتے پھرتے ہیں۔

جن جن ارباب علم و دانش نے ان کلمات کے جو جو معانی، مفاہیم اور مطالب اپنے اپنے انداز میں بیان فرمائے ہیں یہ سب ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، جن کا ایک ہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہے طعنہ زنی اور عیبوں کو ظاہر کرنا، پھر یہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جو انسانی کوشش کے ساتھ ہوتا ہے، ایسا حسد اور کینہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، دوسرا بطور مزاح کیا جاتا ہے، جیسے مزاح کرنے والے، تمسخر اڑانے، ہنسی ٹھٹھے کرنے والے لوگوں کی محافل و مجالس میں ہوتا ہے۔

پھر ان دونوں میں یا تو معاملہ دینی کاموں سے متعلق ہوتا ہے جیسے کسی کی نقل اتارنا، کسی کے چلنے کے انداز کو بیان کرنا، کسی کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز کی نقل اتارنا، اس طرح بہت سی چیزیں ہیں جو ضبط میں نہیں آتیں، پھر ان اقسام میں جو عیوب ظاہر کیے جاتے ہیں کبھی تو وہ شخص جس کے عیوب ظاہر کیے جاتے ہیں وہ سامنے ہوتا ہے اور کبھی سامنے نہیں ہوتا، دونوں صورتوں میں یہ عیب جوئی کبھی لفظوں کی شکل میں ہوتی ہے، کبھی سر اور آنکھ کے اشارہ سے ہوتی ہے، یہ ساری صورتیں اسی نہی اور ڈانٹ ڈپٹ میں آتی ہیں۔

جب عام انسانوں کی عیب جوئی کرنا، ان کو طعن و طنز کا نشانہ بنانا قابل مذمت اور داخل نہی ہے تو پھر رحمت دو عالم ﷺ کی ذات اقدس منصب، مرتبے اور مقام کے لحاظ سے بہت بلندی پر تھے، ان کے حق میں طعنہ زنی کرنا، ان کی عیب جوئی کرنا تو یقیناً اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔

الَّذِی جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ: جس نے مال اکٹھا کیا ہو اور اسے گنتا رہتا ہو۔ جس کے عیوب پہلی آیت میں بیان کیے گئے اسی کا ایک اور قابل مذمت عیب بیان کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس عیب جو اور طعنہ باز شخص کا یہ وصف اس لیے بیان کیا کیونکہ مال کے ساتھ اس قدر محبت اور مشغولیت ہی علت اور سبب ہے عیب جوئی اور طعنہ زنی کا، یہی وہ سبب ہے جس نے اس میں تکبر اور تعلی پیدا کی، وہ اس مال و زر کی وجہ سے اپنے کو صاحب کمال اور صاحب فضیلت سمجھتا ہے، اسی بناء پر وہ اپنے علاوہ

دوسروں کی تنقیص کرتا ہے، ان کی شان میں کمی کرتا ہے، ان کی تحقیر کرتا ہے۔

قرآن کریم کے ایک بڑے قاری حمزہ کسائی اور ابن عامر نے یہاں جمع کی جگہ جَمَّعَ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء تخفیف کے ساتھ جَمَعَ ہی پڑھتے ہیں، تشدید اور تخفیف دونوں صورتوں میں معنٰی قریب قریب ہی ہے، کوئی خاص فرق نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جَمَّعَ تشدید کی صورت میں معنٰی یہ ہے کہ مال کچھ کہاں سے کچھ کہاں سے جمع کیا، ایک ہی دن میں جمع نہیں کیا، دو دن میں جمع نہیں کیا، ایک ماہ یا دو ماہ میں جمع نہیں کیا، عربی محاورے میں بھی جب کسی کے بارے میں تشدید کے صیغہ کے ساتھ مال جمع کرنے کی بات کی جائے تو یہی معنٰی سمجھا اور بتایا جاتا ہے کہ اس شخص نے مال اِدھر اُدھر سے جمع کیا، جب کہ جَمَعَ تخفیف کی صورت میں ایسے معنٰی کے لیے مفید نہیں ہے۔

مَالًا کو نکرہ ذکر کیا گیا، اس کے معنٰی میں دو احتمالات ہیں، ایک یہ کہ مال نام ہے ہر اس چیز کا جو دنیا میں ہے، جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الْكَهْفِ: ۴۶) مال اور بیٹے حیات دنیوی کی زینت ہیں۔

جب ساری دنیا کی اشیاء مال ہیں، سب لوگوں کے پاس مال ہے تو ایک انسان کے پاس موجود مال کل دنیا کے مال کی بہ نسبت حقیر اور ہیچ ہے، تو اس کے مناسب یہ کیسے ہوا کہ وہ اس قلیل اور ہیچ پونجی پر اس قدر فخر و ناز کرے، اترائے، تکبر سے کام لے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نکرہ تعظیم کے لیے استعمال کیا گیا ہو جس کا مطلب یہ ہے جس مال کو اس نے جمع کیا اور جسے وہ گن گن کر رکھتا ہے وہ خباثت، گندگی، پلیدی اور فساد کی انتہاؤں کو پہنچا ہوا ہے تو کسی عاقل، دانا اور سمجھدار انسان کے شایان شان نہیں کہ وہ اس مال پر فخر و غرور کرے۔

مال فی نفسہ برا نہیں ہے، لیکن مال کی اشد محبت جس کا قرآن کریم میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے جو انسان کو غافل اور مدہوش کر دے اس کی مذمت ہے، ورنہ انفاق فی سبیل اللہ اور رفاہ عامہ کے کاموں میں اپنا مال لگانے کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، نبی کریم ﷺ جب لوگوں سے انفاق فی سبیل

اللہ کی بات کرتے تھے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے عظیم انسان اپنے گھر میں صفایا کر کے سارا مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ آدھا لے آتے تھے، عثمان غنی رضی اللہ عنہ سخاوت کی انتہا کر دیتے تھے، اسی لیے تو ان کی شانیں ہر جگہ نمایاں دکھائی دیتی ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو ایسا جملہ نبوت کی زبان سے ادا ہوا کہ ہنگامہ یوم النشور تک اس کو پڑھا اور اس پر سر دھنا جاتا رہے گا، فرمایا کہ میں نے سب کے احسانات کا بدلہ اتار دیا مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ وہ ہے جس کے احسانات کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اتاریں گے۔

عَدَّدَهُ یہ عُدَّةٌ سے ماخوذ ہے اس کا معنیٰ ہے جمع کرنا، گننا، ذخیرہ کرنا، حوادثات زمانہ سے بچاؤ کے لیے، مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے جو مال روکا اور جمع کیا جاتا ہے اس پر عربی زبان میں اس طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، عدد ہ میں تشدید لائی گئی جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ جس چیز کو شمار کیا جاتا ہے، گنا جاتا ہے اور گن گن کر رکھا جاتا ہے وہ بہت زیادہ ہے، گنتی کیے جانے والے مال کی کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے یہاں عَدَّدَهُ ذکر فرمایا گیا ہے۔

عدد ہ کا معنیٰ شمارہ کرنا، گننا، تشدید کثرت معدود کو بتانے کے لیے آتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ يُعَدِّدُ فَضَائِلَ فُلَانٍ فلاں آدمی فلاں آدمی کے بہت فضائل گنتا ہے اسی لیے امام سدی فرماتے ہیں کہ عدد ہ کا معنیٰ اس نے اسے گنا، اسے شمار کیا اور وہ کہتا ہے یہ مال میرا ہے، یہ مال میرا ہے، دن کے اجالے میں اس کا مال اسے غافل کر دیتا ہے اور جب رات کی تاریکی ہوتی ہے تو وہ اسے چھپاتا ہے۔

عدد ہ کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ اس نے مال کو زیادہ کر لیا، عربی محاورے میں جب کسی خاندان کی تعداد بڑھ جائے تو یہ جملہ بولا جاتا ہے فِي بَنِي فُلَانٍ عَدَدٌ یہ دونوں قول عدد یعنی گنتی کے معنیٰ کی طرف راجع ہیں۔

جن لوگوں نے اسے تشدید کی بجائے تخفیف پڑھا ہے یعنی عدد ہ پڑھا اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے مال جمع کیا اور اسے گن کر شمار کیا، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس نے اپنا مال جمع کیا اور اپنی قوم کے ان لوگوں کو شمار کیا جو اس کی مدد کرتے ہیں، جیسے عربی محاورہ ہے فُلَانٌ ذُو عَدَدٍ وَعُدَدٍ یہ اس وقت

بولتے ہیں جب اعوان وانصار اور مددگاروں کی تعداد وافر ہو، جب آدمی کے پاس اس طرح مال ودولت اور اعوان وانصار کی ریل پیل ہو تو وہ فخر وغرور میں مبتلا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

شیخ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس گن گن کے رکھنے میں اشارہ ہے کہ وہ مال اسباب خیر اور نیکی کی راہوں میں خرچ کرنے کے لیے جمع نہیں کرتا بلکہ دھر رکھنے کے لیے اور حوادث میں کام آنے کے لیے، اس سے معلوم ہوا کہ حرص اور حبِّ مال اس کے دل پر غالب ہے اور یہی تمام گناہوں کی جڑ ہے، یوں مال فی نفسہٖ برا نہیں نہ اس کا جمع کرنا بشرطیکہ جائز طریقوں سے حقوق بھی ادا کئے جائیں، زکوٰۃ، غربا کے ساتھ صلہ رحمی دینی کاموں میں تائید کی جائے، برائی اسی قسم کے مال جمع کرنے کی ہے کہ جس کا ذکر ہوا اور جس بخیل مالدار کا پوچھئے گا کہ یہ کس لیے جمع کیا ہے تو یہی کہے گا کہ وقت پر کام آئے گا اس بات کو رد کرتا ہے۔ (تفسیر حقانی)

امام ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ مال اس لئے گن گن کر جمع کر کے رکھتا ہے تاکہ اس کی اولاد اس مال کی وارث ہو جائے اور اس سے مقصود ان لوگوں کی مذمت کرنا ہے، جو اللہ کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتے اور اس کو بچا بچا کر رکھتے ہیں۔

مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب مال جمع کرنے کا ذہن ہوتا ہے تو نہ حلال حرام کا خیال رہتا ہے اور نہ لوگوں کے حق مارنے کو برا سمجھا جاتا ہے اور نہ مال کمانے میں فرائض اور واجبات کے ضائع کرنے سے دکھ ہوتا ہے اور نہ نیکیاں کرنے کی توفیق ہوتی ہے ثانیاً مال جمع کرنے والے مال ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے کہ مال ہی سب کچھ ہے یہ ہمیں دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھے گا (موت کا یقین ہوتے ہوئے رنگ ڈھنگ ایسا ہوتا ہے جیسے مرنا نہیں ہے اور یہ مال ہمیشہ کام دیتا رہے گا) (تفسیر انوار البیان)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، طعنہ زنی اور عیب جوئی کا منشاء تکبر اور تکبر کا سبب مال ہے جس کو مارے حرص کے ہر طرف سے سمیٹتا اور مارے بخل کے گن گن کر رکھتا ہے کہ کوئی پیسہ کہیں خرچ نہ ہو جائے یا نکل کر بھاگ نہ جائے۔ اکثر بخیل مالداروں کو دیکھا ہو گا کہ وہ

بار بار روپیہ شمار کرتے اور حساب لگاتے رہتے ہیں۔ اسی میں ان کو مزہ آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں، تیسری خصلت جس پر عذاب کی وعید اس سورت میں آئی ہے وہ مال کی حرص اور محبت ہے اسی کو آیت میں اس طرح سے تعبیر کیا ہے کہ حرص و محبت مال کی وجہ سے اس کو بار بار گنتا رہتا ہے چونکہ دوسری آیات و روایات اس پر شاہد ہیں کہ مطلقاً مال کا جمع رکھنا کوئی حرام و گناہ نہیں اس لئے یہاں بھی مراد وہ جمع کرنا ہے جس میں حقوق واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں یا فخر و تفاخر مقصود ہو یا اس کی محبت میں منہمک ہو کر دین کی ضروریات سے غفلت ہو۔ (معارف)

مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں، جائز طریقہ سے مال حاصل کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن اس کی ایسی محبت کہ ہر وقت انسان اسی کی گنتی میں لگا رہے، اسے گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے اور جب کسی شخص پر مال کی محبت اس طرح سوار ہو جائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری ہر مشکل اسی مال کے ذریعہ آسان ہو گی اور موت سے غافل ہو کر دنیاداری کے منصوبے اس طرح بناتا رہتا ہے جیسے یہ مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ (توضیح القرآن المعروف آسان ترجمہ)

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ: وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ **أَخْلَدَهُ اور خَلَّدَهُ** کا ایک ہی معنیٰ اور مفہوم ہے، اس کے مفہوم و مطلب میں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں، اس کا ایک معنیٰ اور مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ مال و زر کی کثرت کے ساتھ اس نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں، یہاں تک کہ وہ فرط غفلت اور لمبی لمبی امیدوں کے باعث یہ گمان و خیال کرتا ہو کہ اس کا مال و زر اسے دنیا میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا اور اسے موت نہیں آئے گی۔

یہاں مضارع کی بجائے ماضی کا صیغہ اخلدہ ذکر فرمایا گیا، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ انسان خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشگی کا ضامن ہو گیا، اس کے مال نے اسے موت سے امان عطا کر دی، گویا یہ ایسا فیصلہ ہے جس سے فارغ کر دیا گیا، اسی لیے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا۔

دوسرا یہ کہ وہ بڑے مضبوط کام کرتا ہے، جیسے عمارتوں کو اینٹوں اور چونے گچ سے مضبوط بنانا،

ایسے کام وہی شخص کرتا ہے جس کا یہ خیال ہو کہ وہ زندہ باقی رہے گا، یا اس لیے اس قدر مضبوط کام کرتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس بناء پر اس کا تذکرہ کیا جاتا رہے گا۔

تیسرا یہ کہ وہ مال سے بہت سے زیادہ محبت رکھتا ہے، حب مال کی بناء پر وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اگر میرا مال کم ہو گیا تو میں مر جاؤں گا اسی لیے وہ اسے نقصان سے بچانے کے لیے حفاظت کرتا ہے تاکہ وہ زندہ باقی رہے، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بخیل سے ایسا ناممکن اور بعید نہیں ہے۔

چوتھا یہ کہ یہ عمل صالح سے تعریض ہے کہ عمل صالح صاحب اعمال کو دنیا میں ذکر جمیل اور تذکرہ حسن کے ساتھ ہمیشہ رکھے گا اور آخرت میں اعمال صالحہ ہمیشہ کی نعمتوں میں اسے اقامت پذیر کر دیں گے۔ (تفسیر کبیر)

کلا اس شخص کے خیالات، گمان اور اعتقادات پر کلمہ ردع ہے کہ معاملہ یوں نہیں ہے جس طرح وہ سوچتا یا خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ علم اور صلاح انسان کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا فرمان بھی ہے مَاتَ خُزَّانُ الْمَالِ وَهُمْ أَحْيَاءٌ وَالْعُلَمَاءُ بَاقُونَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ خزانے والے مر گئے درانحالیکہ وہ زندہ تھے اور علماء جب تک زمانہ باقی رہے گا زندہ رہیں گے۔

یہ ان کے اس انہماک کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ یہ انہماک پتہ دیتا ہے کہ وہ گویا یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ یہ مال ان کو زندہ جاوید رکھے گا۔ اگر وہ جانتے ہیں کہ یہ مال بھی فانی اور ان کی زندگی بھی فانی ہے تو وہ مال کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے میں سبقت کرتے جو ان کی ابدی زندگی میں کام آنے والا ہوتا لیکن اس کی محبت میں ان کا یہ استغراق پتہ دیتا ہے کہ وہ اس مال ہی میں اپنی زندگی پا گئے ہیں۔ اسی ذہنیت کی تصویر سورۃ شعراء میں کھینچی گئی ہے أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ (۱۲۸) وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۱۲۹) (الشعرآء) کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے اور شاندار محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔

آدمی کے باطن کا سراغ دینے والی اصل چیز اس کی زبان نہیں بلکہ اس کی زندگی کا رویہ ہے۔ جو آدمی اسی دنیا کو اپنی منزل سمجھتا ہے اس کی زندگی اس شخص کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اس دنیا کو منزل نہیں بلکہ راہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کا قائل اور اس کا طالب ہو وہ اپنا مال گن گن کر اس دنیا کے بنکوں اور تجوریوں میں رکھے بلکہ وہ اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ " تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ اس لئے کہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔ (تفسیر تدبر قرآن)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور لکیر کھینچی اور مربع خط کے درمیان باہر کو نکلتی ہوئی ایک اور لکیر کھینچی اور اس وسطی لکیر کی جانب دونوں طرف سے آتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکیریں متعدد بنادیں اور فرمایا کہ یہ وسطی لکیر انسان ہے اور باہر کو نکلا ہوا حصہ انسان کی آرزوئیں ہیں اور یہ چھوٹی لکیریں انسانی اغراض ہیں، اب اگر ایک طرف والی لکیر سے بچ جاتا ہے تو دوسری طرف والی لکیر اس کو نوچتی ہے اور اس سے بچ جاتا ہے تو یہ نوچتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ آرزو ہے اور یہ انسان کی موت ہے اور آدمی اس حالت میں ہوتا ہے کہ اچانک قریب والا خط یعنی خطِ موت اس پر آپہنچتا ہے۔ (بخاری)

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ: ہرگز نہیں! اس کو تو ایسی جگہ میں پھینکا جائے گا جو چوراچورا کرنے والی ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم وہ چوراچورا کرنے والی چیز کیا ہے؟

لَيُنۢبَذَنَّ یہ نَبْذٌ سے ہے، نَبْذٌ کا معنٰی ذلت آمیز طریقہ سے پھینکنا، یہ لفظ اہانت اور توہین پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کافر اپنے کو بڑا معزز سمجھتا ہے، اسے صیغہ تثنیہ لَيُنۢبَذَانِ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں اس کا معنٰی یہ ہوگا کہ اسے اور اس کے مال دونوں کو جہنم میں پھینکا جائے گا اور اگر ذال کے ضمہ لَيُنۢبَذُنَّ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنٰی یہ ہے کہ وہ اور اس کے مددگار دوزخ میں پھینکے جائیں گے۔

الْحُطَمَة کے بارے مبرد فرماتے ہیں کہ یہ وہ آگ ہے جو ہر اس شخص کا چورا چورا کر دے گی جو اس کے اندر جائے گا، عربی محاورے میں رَجُلٌ حُطَمَةٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ کھاتا ہو حتی کہ لوگوں کے توشے دانوں سے ان کے توشے ہڑپ کر جاتا ہو، لغت میں حطم کا معنیٰ توڑنا ہے، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے شَرُّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ بدترین نگہبان وہ ہے جو توڑنے والا ہو۔ اسی طرح عربی محاورے میں رَاعٍ حُطَمَةٌ بھی کہا جاتا ہے، گویا کہ وہ جانوروں کو ہانکتے وقت اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ الْحُطَمَةُ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے، یہ جہنم کے درکات اور طبقات میں سے دوسرا طبقہ ہے، حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ یہ ہڈیاں توڑ دے گی، گوشت کھا جائے گی یہاں تک کہ دلوں پر حملہ آور ہو جائے گی، حضرت نبی کریم ﷺ کا فرمان گرامی ہے إن الْمَلَكَ لَيَأْخُذُ الْكَافِرَ فَيَكْسِرُهُ عَلَى صُلْبِهِ كَمَا تُوضَعُ الْخَشَبَةُ عَلَى الرُّكْبَةِ فَتُكْسَرُ ثُمَّ يُرْمَى به فی النار (تفسیر کبیر للرازی) بے شک فرشتہ کافر کو پکڑے گا اور اسے پشت سے دو ٹکڑے کر دے گا جیسا کہ لکڑی کو گھٹنے پر رکھ کر توڑا جاتا ہے پھر اسے آگ میں پھینکا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ یہاں غیبت کرنے والوں، طعنہ زنی کرنے والوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ اگر تو غیبت کرے گا، طعنے مارے گا تو تیرے پیچھے حطمہ (دوزخ) ہے۔

حطمہ انسان کو اس طرح بنا دے گی کہ یہ زندوں میں شمار ہو گا اور نہ ہی مردوں میں وہ اس کا چورا چورا بنا دے گی۔ پھر ھماز (بہت زیادہ غیبت کرنے والا) اور لماز (بہت زیادہ طعنے دینے والا) انسانی گوشت کھاتے ہیں تو حطمہ بھی ایسی دوزخ کا نام ہے وہ چمڑی اور گوشت کھا جائے گی، یہ بھی ممکن ہے کہ اس قدر برے انسان کی دو صفتیں یہاں بیان کیں تو ان کے مقابلے میں اللہ نے حطمہ (دوزخ) کا ایک ہی نام ذکر کر دیا ہو اور فرما دیا کہ میری طرف سے دو صفتوں کے مقابلے میں ایک ہی چیز لے لے یہ تجھے کافی وافی ہے۔ پھر سوال کیا جا سکتا ہے کہ دو صفتوں کے مقابلے میں ایک حطمہ کیسے کافی وافی

ہے؟تو اس کا جواب یہی ہے کہ تجھے معلوم نہیں کہ دو صفتوں کے مقابلے میں یہ ایک کس قدر بھاری ہے، تجھے کیا معلوم کہ حطمہ ہے کیا؟

نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ: اللہ کی سلگائی ہوئی آگ، جب آگ کی اضافت اللہ کی طرف ہو گئی تو اس کی ہولناکی اور تباہ کاری کا خود ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اضافت تفخیم کے لیے ہے یعنی یہ باقی آگوں کی طرح کی آگ نہیں ہے یہ وہ آگ ہے جو کبھی بجھے گی نہیں، یہ اللہ کے امر، اس کے ارادے، اس کی مشیت اور قدرت سے جلائی گئی ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان گرامی ہے عَجَبًا مِمَّنْ يَعْصِي اللّٰهَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ وَالنَّارُ تُسَعَّرُ مِنْ تَحْتِهِ، اس شخص پر تعجب ہے جو زمین کی پشت پر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ آگ اس کے نیچے دھکائی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ أُوقِدَ عَلَيْهَا أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى احْمَرَّتْ، ثُمَّ أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى ابْيَضَّتْ، ثُمَّ أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى اسْوَدَّتْ فَهِيَ الْآنَ سَوْدَاءُ مُظْلِمَةٌ (ترمذی) ایک ہزار سال تک دوزخ میں آگ جلائی گئی تو وہ سرخ ہوئی، پھر ایک ہزار سال تک جلائی گئی تو وہ سفید ہوئی، پھر ایک ہزار سال تک جلائی گئی تو وہ سیاہ ہو گئی، اس وقت وہ آگ انتہائی کالی اور سیاہ ہے۔

الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ: جو دلوں تک جا چڑھے گی۔ جب کوئی پہاڑ کی بلندی تک پہنچ جائے تو عربی محاورے میں طلع اور اطلاع کا لفظ بولا جاتا ہے کہ طَلَعَ الْجَبَلَ وَاطَّلَعَ عَلَيْهِ وہ پہاڑ پر چڑھ گیا، یا پہاڑی کی بلندی پر پہنچ گیا۔

اہل دوزخ کا کیا برا انجام ہو گا، الامان والحفیظ، دوزخ کی آگ ان کے پیٹوں میں داخل ہو جائے گی، پیٹوں سے سینوں تک جا پہنچے گی، پھر دلوں پر حملہ آور ہو گی، جب کہ انسانی بدن میں دل سے زیادہ لطیف کوئی چیز نہیں ہے، اور انسانی دل سے زیادہ کوئی حساس چیز نہیں ہے، ذرا سی تکلیف سے بھی دل بہت زیادہ درد محسوس کرتا ہے، پھر اس وقت کیا منظر ہو گا جب دوزخی آگ اس کے سینے پر قبضہ جما

کر دل پر حملہ کرے گی، امام رازی کہتے ہیں کہ سینے پر آگ کے قبضے اور تسلط کے باوجود انسانی دل جلے گا نہیں، کیونکہ اگر دل جائے گا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى (الْأَعْلَى: ۱۳) نہ مرے گا نہ زندہ رہے گا۔ کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔

اطلاع کا معنیٰ ہے آگ گوشت سے دل کی طرف اترے گی، پھر یہاں دل کا خصوصیت سے ذکر کیوں کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل ہی کفریات، عقائد باطلہ، نظریات خبیثہ، نیات فاسدہ کے مراکز ہوتے ہیں، اسی لیے دوزخی آگ اس مقام پر جھپٹے گی۔

حضرت نبی کریم ﷺ کا فرمان گرامی ہے کہ أَنَّ النَّارَ تَأْكُلُ أَهْلَهَا حَتَّى إِذَا اطَّلَعَتْ عَلَى أَفْئِدَتِهِمُ انْتَهَتْ، ثُمَّ إِنَّ اللهَ تَعَالَى يُعِيدُ لَحْمَهُمْ وَعَظْمَهُمْ مَرَّةً أُخْرَى. آگ جہنمیوں کو کھائے گی یہاں تک کہ جب وہ آگ ان کے دلوں تک پہنچے گی تو وہ رک جائے گی پھر اللہ تعالیٰ ان کے گوشت کو لوٹا دیں گے اور ان کی ہڈیوں کو دوبارہ پیدا فرما دیں گے۔

حضرت محمد بن کعب رحمہ اللہ فرماتے ہیں تَأْكُلُ النَّارُ جَمِيعَ مَا فِي أَجْسَادِهِمْ، حَتَّى إِذَا بَلَغَتْ إِلَى الْفُؤَادِ، خُلِقُوا خَلْقًا جَدِيدًا، فَرَجَعَتْ تَأْكُلُهُمْ (تفسیر قرطبی) آگ جو کچھ ان کے جسموں میں ہو گا اسے کھا جائے گی، یہاں تک کہ جب دلوں تک پہنچ جائے گی تو انہیں نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا، پھر وہ آگ بھی لوٹ آئے گی اور انہیں کھائے گی۔

إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُؤْصَدَةٌ () فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ: یقین جانو وہ ان پر بند کر دی جائے گی۔ جبکہ وہ (آگے کے) لمبے چوڑے ستونوں میں (گھرے ہوئے) ہوں گے۔ مؤصدہ کا معنیٰ بند کیا ہوا، بند کیا گیا، لغت قریب میں دروازہ بند کرنے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، یہاں فی باء کے معنیٰ میں ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ دروازے ستونوں کے ساتھ ڈھکے اور بند کیے گئے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

ثُمَّ إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ إِلَيْهِمْ مَلَائِكَةً بِأَطْبَاقٍ مِنْ نَارٍ، وَمَسَامِيرَ مِنْ نَارٍ وَعَمَدٍ مِنْ نَارٍ،

فَتُطْبِقُ عَلَيْهِمْ بِتِلْكَ الْأَطْبَاقِ، وَتَشُدُّ عَلَيْهِمْ بِتِلْكَ الْمَسَامِيرِ وَتُمَدُّ بِتِلْكَ الْعَمَدِ، فَلَا يَبْقَى فِيهَا خَلَلٌ يَدْخُلُ فِيهِ رَوْحٌ، وَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ غَمٌّ، وَيَنْسَاهُمُ الرَّحْمٰنُ عَلَى عَرْشِهِ، وَيَتَشَاغَلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ بِنَعِيمِهِمْ، وَلَا يَسْتَغِيثُونَ بَعْدَهَا أَبَدًا، وَيَنْقَطِعُ الْكَلَامُ، فَيَكُونُ كَلَامُهُمْ زَفِيرًا وَشَهِيقًا، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى: إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُؤْصَدَةٌ. فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ، پھر اللہ تعالیٰ ان پر فرشتے بھیجے گا جن کے ساتھ آگ کے کوڑے، آگ کے کیل اور آگ کے ہی ستون ہوں گے وہ ان پر ان کو اڑوں کو بند کر دیں گے، ان پر کیل لگا دیں گے اور ان ستونوں کے ساتھ انہیں باندھ دیا جائے گا کوئی سوراخ باقی نہیں رہے گا جس میں سے راحت داخل ہو سکے اور غم خارج ہو سکے اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر انہیں بھول جائے گا جنتی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جہنمی اس کے بعد کبھی بھی مدد طلب نہ کر سکیں گے، گفتگو ختم ہو جائے گی ان کی گفتگو چیخ و پکار ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُؤْصَدَةٌ. فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ ۔کا یہی مفہوم ہے۔ (قرطبی)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں عَمَدٍ کے ساتھ انہیں عذاب دیا جائے گا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ سے مراد ان کے گردنوں میں طوق ہیں۔ ابو صالح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی، علامہ قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمد سے مراد کو اڑوں کے کیل ہیں جو جہنمیوں پر بند کر دیئے جائیں گے اور ان پر کیل لگا دیئے جائیں گے یہاں تک کہ ان کا غم اور گرمی جہنمیوں پر ہی لوٹے گی۔ تو ان پر کسی قسم کی راحت داخل نہیں ہو گی۔ (تفسیر قرطبی)

ایک قول یہ کیا گیا، جہنم کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں گے جبکہ وہ بیڑیوں اور لمبے لمبے طوقوں میں جکڑے ہوں گے یہ چھوٹے چھوٹے طوقوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کے عذاب اور آلام میں انہیں اس کے ساتھ مارا جائے گا۔

اس آیت میں علماء نے عَمَدٍ پر اتفاق کیا ہے۔ جوہری نے کہا: العمود سے مراد گھر کے ستون ہوتے ہیں اس کی جمع قلت اعمدہ ہے جمع کثرت عمد اور عمد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس لفظ عمد کو دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: عمود ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو لمبی ہو خواہ وہ لکڑی کی ہو یا

لوہے کی ہو یہ تعمیر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح عماد کی حیثیت ہوتی ہے جس طرح جملہ بولتے ہیں: عمدت الشی فانعمد میں نے اسے عماد کے ذریعے سیدھا کیا جس پر اس کا انحصار تھا۔ اعمدتہ یعنی میں نے اس کے نیچے ستون (سہارا والی چیز) بنائی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی جہنم کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں ہو گا جو ایک ہزار سال تک یا حنان یا منان پکارے گا، تو رب العزت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے میرے بندے کو آگ میں سے نکالو چنانچہ وہ اس کے پاس آئے گا اور اس کو بند پائے گا، تو وہ واپس لوٹ جائے گا اور عرض کرے گا اے میرے رب! وہ ان پر چاروں طرف سے بند کر دی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے جبریل علیہ السلام اس کو کھول دو۔ اور میرے بندے کو آگ سے نکال دے، وہ اس کو کھولے گا اور اس کو کوئلے کی طرح نکال کر جنت کے ساحل پر ڈال دے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بالوں کو، گوشت کو اور خون کو سب کو پیدا فرمادیں گے۔ (تفسیر در منثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بے شک شفاعت قیامت کے دن ان کے لیے ہو گی جنہوں نے میری امت میں سے بڑے گناہ کیے ہوں گے، پھر اسی پر مر گئے توبہ نہیں کر سکے، وہ جہنم کے پہلے دروازہ میں ہوں گے ان کے چہرے کالے نہ ہوں گے اور ان کی آنکھیں نیلی نہ ہوں گی اور نہ ان کو طوق پہنایا جائے گا اور نہ ان کو شیطانوں کے ساتھ ملایا جائے گا اور نہ ان کو گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا اور نہ ان کو جہنم کے طبقوں میں پھینکا جائے گا۔

ان میں بعض وہ ہوں گے جو ایک ساعت اس میں ٹھہریں گے اور کچھ ایک دن ٹھہریں گے پھر نکال لیے جائیں گے اور ان میں سے وہ ہوں گے جو ایک مہینہ ٹھہریں گے پھر ان کو نکال لیا جائے گا اور ان میں سے وہ ہوں گے جو اس میں ایک سال تک رہیں گے پھر ان کو نکال لیا جائے گا اور ان میں سے زیادہ دیر تک ٹھہرنے والے جو دنیا کی مثل ٹھہرے گا یعنی دنیا کے پیدا ہونے کے دن سے لے کر اس کے فنا ہونے کے دن تک اور وہ مدت سات ہزار سال ہے پھر اللہ جل شانہ جب مؤحدین کے نکالنے کا ارادہ فرمائیں گے تو دوسرے دین والوں کے دلوں میں ڈال دیں گے، تو وہ ان سے کہیں گے تم اور ہم

دنیا میں اکٹھے تھے، تم ایمان لائے اور ہم نے کفر کیا اور تم نے تصدیق کی اور ہم نے تکذیب کی تم نے اقرار کیا اور ہم نے انکار کیا، پس اس نے تم کو کوئی نفع نہیں دیا، ہم اور تم اس میں برابر ہیں تم عذاب دیئے جاؤ گے جیسے ہم عذاب دیئے جاتے ہیں اور تم بھی اسی طرح ہمیشہ رہو گے جیسے ہم رہتے ہیں، تو اللہ اس وقت شدید غصہ ہوں گے کہ اس سے پہلے کسی چیز سے اتنا غصہ نہیں ہوئے اور نہ اس کے بعد کسی چیز پر اتنا غصہ فرمائیں گے۔

پھر اہلِ توحید کو جہنم سے جنت کے چشمے اور پل صراط کی طرف نکال لائے گا، اس کو زندگی کی نہر کہا جاتا ہے وہاں ان پر اس کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے گا، تو وہ اس طرح زندہ ہو کر اٹھیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے میں دانے اُگتے ہیں وہاں جو سائے کے قریب ہو گا وہ سبز ہو گا اور جو دھوپ کے قریب ہو گا وہ زرد ہو گا پھر وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کے چہرو پر لکھا ہو گا عتقاء اللہ عن النار کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے آزاد کردہ ہیں۔

مگر ایک آدمی ایسا ہو گا جو ان کے بعد ہزار سال تک جہنم میں رہے گا پھر وہ آواز دے گا۔ یَا حَنَّانُ یَا مَنَّانُ۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجیں گے تا کہ اس کو نکال لائے وہ اس کی تلاش میں جہنم کے ستر سال تک ادھر ادھر گھومتا پھرے گا، مگر اس کو نہ پا سکے گا، پھر لوٹ آئے گا اور کہے گا: یا میرے رب! بیشک آپ نے مجھے حکم فرمایا تھا کہ تیرے فلاں بندے کو میں آگ سے نکالوں، میں نے ستر سال تک اس کو آگ میں تلاش کیا مگر میں اس پر قادر نہیں ہوا۔

تو اللہ عزوجل فرمائیں گے تو چلا جا اور اس اس طرح کی وادی میں ایک چٹان کے نیچے ہے اس کو نکال کر آ، وہ جائے گا اس کو اس میں سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گا، پھر جہنمی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف التجاء کریں گے کہ وہ ان سے یہ نام مٹا دے۔

اللہ تعالیٰ ان کی طرف فرشتے کو بھیجیں گے تو وہ ان کی پیشانیوں سے اسے مٹا دے گا، پھر جنت والوں کو کہا جائے گا اور ان کو جو جہنمیوں میں سے داخل ہوئے کہ تم دوزخ والوں کی طرف جھانکو تو وہ

ان کی طرف جھانکیں گے تو کوئی آدمی اپنے باپ کو دیکھے گا اور کوئی اپنے بھائی کو اور کوئی اپنے پڑوسی کو اور کوئی اپنے دوست کو دیکھے گا اور غلام اپنے آقا کو دیکھے گا۔

پھر اللہ عزوجل ان کی طرف فرشتے بھیجے گا، جن کے پاس آگ کی بڑی بڑی پلیٹیں ہوں گی آگ کے کیل ہوں گے اور آگ کے ستون ہوں گے پس وہ جہنم والوں پر ان ڈھکنوں کو رکھ دیں گے اور وہ کیل ان میں لگادیں گے اور اوپر وہ ستون پھیلا دیں گے جہنم میں کوئی سوراخ باقی نہیں رہے گا کہ اس میں کوئی روح یعنی راحت داخل ہو سکتی ہو اور نہ ان میں سے کوئی غم باہر نکل سکے گا اور جبار مطلق اپنے عرش پر ان کو بھلا دے گا اور جنت والے اپنی نعمتوں میں مشغول ہو جائیں گے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے کبھی کوئی فریاد نہیں کریں گے اور کلام ختم ہو جائے گا اور ان کی آواز گدھے کی آوازوں کی طرح ہو جائے گی، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ. فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ بیشک ان پر جہنم کی آگ بند کر دی جائے گی اور اس کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی صورت میں ہوں گے۔ (در منثور، نوادرالاصول حکیم ترمذی، در منثور سیوطی)

حودللہ حودللہ آج سورۃ الھمزہ کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اساتذہ اور مشائخ کے لیے، میرے معاونین و مساعدین کے لیے تاقیام قیامت صدقہ جاریہ نافعہ بنائے۔ تمت سورۃ الھمزۃ

۹جون ۲۰۲۰ء ۱۷شوال ۱۴۴۱ھ بروز منگل بوقت ڈھائی بجے رات

حروف بینی: ۲۶نومبر ۲۰۲۰ء بروز جمعرات سوا بارہ بجے شب

☆☆☆☆

الفیل

اَصحاب الفیل، کنکر، پرندے اور انجامِ ابرہہ

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ {۱} اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِيۡ تَضۡلِيۡلٍ {۲} وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ {۳} تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ {۴} فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ {۵} الفیل

جواب ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ کیا اس نے ان لوگوں کی ساری چالیں بیکار نہیں کر دی تھیں؟ اور ان پر غول کے غول پرندے چھوڑ دیے تھے۔ جو ان پر پکی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، چنانچہ انہیں ایسا کر ڈالا جیسے کھایا ہوا بھوسا۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب حضرت نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کے پروردگار نے اصحاب الفیل (ہاتھی والوں) کے ساتھ کیا کیا؟ یمن کے بادشاہ ابرہہ اور اس کے لشکر کے ساتھ کیا کیا جو ناپاک عزائم کے ساتھ خانہ کعبہ جیسے بابرکت گھر کو منہدم کرنے کے لیے آئے تھے، ان کی سازش اور شر انگیزی کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح برباد اور تباہ کیا، ان کی کوشش کو رائیگاں کر دیا، ان پر ابابیلوں کے لشکر بھیج کر، کھنگر پھینکوا کر کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کروادیا، تباہی اور ہلاکت ان کا مقدر ٹھہری۔

قدرت کی کاریگری اور بوقلمونی کا کیا کہنا کہ ابابیلوں کی طرف سے برسائے گئے چھوٹے چھوٹے کھنگروں پر ان لشکروں کے نام بھی مرقوم تھے، یہ واقعہ اسی سال پیش آیا جس سے رحمت کائنات، مفخر موجودات، سرور جن وانس، حضرت محمد عربی ﷺ سرزمین عرب میں جلوہ افروز ہوئے۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے

ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ یہاں الم تر کا معنیٰ اور مفہوم یہ ہے کہ کیا آپ کو خبر نہیں دی گئی؟ کیا آپ کے علم میں نہیں ہے؟ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کیا آپ نے نہیں سنا؟ لفظ استفہام ہے، خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب عام ہے، یعنی کیا آپ لوگوں نے نہیں دیکھا کہ میں (اللہ) نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ یعنی تم جانتے ہو، تمہیں اپنے اوپر میرے احسان کی جگہ اور مقام معلوم ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم لوگ ایمان نہیں لاتے ہو؟

الفیل: فیل کی جمع افیال، فیول اور فیلۃٌ آتی ہے، اس کا معنیٰ ہاتھی ہے، عربی محاورے میں رَجُلٌ فِیلُ الرَّأْیِ اور رَجُلٌ فَالٌّ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص رائے کے لحاظ سے کمزور ہو اور فراست میں خطاکار ہو۔

قصہ اصحاب الفیل: یمن کے ابرہہ بادشاہ نے صنعاء میں ایک گرجا بنایا، جس کا نام قلیس رکھا، یہ ایسا شاندار، دلکش، دلربا، جاذب نظر گرجا تھا کہ اس زمانے میں زمین کی پشت پر اس جیسا گرجا دیکھا نہیں گیا، ابرہہ نصرانی تھا، اس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو خط لکھا، جس میں ابرہہ نے نجاشی کو بتایا کہ إِنِّي قَدْ بَنَيْتُ لَكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ كَنِيسَةً لَمْ يُبْنَ مِثْلُهَا لِمَلِكٍ كَانَ قَبْلَكَ، وَلَسْتُ بِمُنْتَهٍ حَتَّى أَصرِفَ إِلَيهَا حَجَّ العَرَب، اے بادشاہ! میں نے آپ کی خاطر ایک گرجا بنایا ہے، اس جیسا گرجا آپ سے پہلے کسی بادشاہ کے لیے نہیں بنایا گیا اور میں اس وقت تک اس کام سے رکنے والا نہیں ہوں جب تک عرب کے حاجیوں کا رخ اس کی طرف نہ موڑ دوں۔

جب ابرہہ کی طرف سے نجاشی کے نام لکھے گئے اس خط کی بابت عربوں کو پتا چلا جو اسی نجاشی کی رعایا تھے تو ایک آدمی کو سخت غصہ آیا اور اس نے آکر گرجے میں پائخانہ کر دیا، پھر وہاں سے نکل گیا، یہ بات ابرہہ کو معلوم ہوئی تو اس نے دریافت کیا کہ یہ کام کس نے کیا؟ اسے بتایا گیا کہ یہ کام اس شخص نے کیا ہے جو بیت اللہ شریف کے ساتھ تعلق رکھنے والوں میں سے ایک تھا، یہ کام اس نے اس وقت کیا جب اس نے آپ کی یہ بات سنی کہ میں بیت اللہ شریف کے حج سے لوگوں کو اس گرجے کی طرف

پھیروں گا، اس بات پر اسے طیش آئی اور آکر گرجے میں پائخانہ کر دیا، اس کے ایسا کرنے کی غرض یہ تھی کہ گرجا اس لائق نہیں کہ اس کی طرف لوگ آئیں اور یہاں آکر حج کریں۔

یہ منظر دیکھ کر اور یہ بات سن کر ابرہہ کو بھی غصہ آگیا، اس نے غصے میں قسم کھائی کہ وہ بیت اللہ کی طرف جائے گا اور اسے منہدم کر دے گا اور اس نے اپنے لوگوں میں سے ایک شخص کو بنی کنانہ کی طرف روانہ کیا کہ انہیں اس گرجا میں حج کرنے کی دعوت دے، جب یہ شخص بنی کنانہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا، اس پر ابرہہ کو بہت زیادہ غصہ آیا، پھر حبشیوں کو حکم دیا، انہوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی، پھر ابرہہ اپنے ہاتھیوں کے ہمراہ چل پڑا۔

جب عربوں کو اس کا پتا چلا تو انہوں نے اس کو بڑی جسارت سمجھا اور خوف زدہ ہو گئے، جب انہوں نے سنا کہ ابرہہ بیت اللہ شریف کو گرانے کے لیے آرہا ہے تو انہوں نے بیت اللہ شریف کا دفاع اور اس کی حفاظت کرنا اپنی ذمہ داری سمجھی، ابرہہ کی اس شر انگیز مہم کا سن کر یمن والوں میں سے ہی ایک سردار ذو نفر مقابلے کے لیے اٹھا، اس نے اپنی قوم کو اور اس کی آواز پر لبیک کہنے والے تمام عربوں کو دعوت دی کہ وہ ابرہہ کے ساتھ لڑیں اور بیت اللہ شریف کے دفاع کی تیاری کریں، ابرہہ نے بیت اللہ شریف کو گرانے اور ویران کرنے کی جو منصوبہ بندی کی ہے اسے اس سے روکیں، جن لوگوں نے ذو نفر کی آواز پر لبیک کہا سو کہا، پھر اس نے سامنے آکر اس کا مقابلہ کیا مگر ذو نفر اور اس کے ساتھی شکست سے دوچار ہوئے، ذو نفر کو گرفتار کر لیا گیا اور قیدی بنا کر ابرہہ کے سامنے لایا گیا۔

ابرہہ نے ذو نفر کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا، ذو نفر نے ابرہہ سے کہا کہ أَيُّهَا الْمَلِكُ لَا تَقْتُلْنِي، فَإِنَّهُ عَسَى أَنْ يَكُونَ بَقَائِي مَعَكَ خَيْرًا لَكَ مِنْ قَتْلِي، اے بادشاہ! مجھے قتل نہ کیجیے، ہو سکتا ہے کہ میری زندگی میری موت سے آپ کے لیے بہتر ہو۔

ذو نفر کی یہ بات سن کر بادشاہ نے اسے قتل نہیں کیا اور اسے اپنے پاس بیڑیوں میں جکڑ لیا، ابرہہ اگرچہ قد و قامت کے لحاظ سے چھوٹا، شکل و صورت کے لحاظ سے بدصورت تھا، مگر حلیم اور بردبار انسان تھا۔

پھر ابرہہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے آگے بڑھا، جب سرزمین خَثعم میں پہنچا تو یہاں اسے نفیل بن حبیب خَثعمی کا سامنا کرنا پڑا، نفیل اپنے دو قبیلوں شہران اور ناہس کو لے کر ابرہہ کے مقابلے کو آیا، ان کے علاوہ عرب کے اور قبائل بھی ان کے ہمراہ تھے، انہوں نے ابرہہ کا مقابلہ کیا، لڑائی کی مگر انہوں نے شکست کھائی، نفیل بن حبیب کو گرفتار کرلیا گیا، پھر اسے ابرہہ کے پاس لایا گیا، جب ابرہہ نے نفیل کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو نفیل بن حبیب نے اس سے کہا أَيُّهَا الْمَلِكُ لَا تَقْتُلْنِي فَإِنِّي دَلِيلُكَ بِأَرْضِ الْعَرَبِ، وَهَاتَانِ يَدَايَ لَكَ عَلَى قَبِيلَتَيْ خَثْعَمَ: شَهْرَانَ وَنَاهِسٍ، بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، اے بادشاہ! مجھے قتل نہ کیجیے، میں عرب تک رسائی میں آپ کی رہبری کروں گا، شہران اور ناہس میرے دو بازو سرزمین خَثعم پر آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے۔

ابرہہ نے نفیل بن حبیب کی یہ بات سن کر چھوڑ دیا اور اسے ساتھ لے کر اس کی راہنمائی میں اس طرح نکلا کہ وہ اسے اگلا راستہ بتا رہا تھا، جب یہ لوگ طائف پہنچے تو یہاں ابرہہ کو ثقیف کے لوگوں میں سے مسعود بن معتّب کا سامنا کرنا پڑا، طائف والوں نے ابرہہ سے کہا أَيُّهَا الْمَلِكُ، إِنَّمَا نَحْنُ عَبِيدُكَ، سَامِعُونَ لَكَ مُطِيعُونَ، لَيْسَ عِنْدَنَا لَكَ خِلَافٌ، وَلَيْسَ بَيْتُنَا هَذَا الْبَيْتَ الَّذِي تُرِيدُ يَعْنُونَ اللَّاتَ إِنَّمَا تُرِيدُ الْبَيْتَ الَّذِي بِمَكَّةَ، نَحْنُ نَبْعَثُ مَعَكَ مَنْ يَدُلُّكَ عَلَيْهِ، اے بادشاہ! ہم آپ کے غلام ہیں، ہم آپ کو سننے والے اطاعت گزار ہیں، ہمارے پاس تمہاری مخالفت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ہمارا یہ گھر وہ گھر نہیں جس کی طرف آپ نکلے ہیں، ان کی مراد لات نامی بت سے تھی، آپ جس گھر کو گرانے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ تو مکہ میں ہے، ہم آپ کے ہمراہ ایسا شخص روانہ کرتے ہیں جو آپ کی راہنمائی کرے گا۔

طائف والوں کی یہ بات سن کر ابرہہ نے ان سے بھی درگزر کر دیا اور اس کے ساتھ ابورغال نامی ایک شخص کو روانہ کر دیا، ابورغال ابرہہ اور اس کے لشکریوں کو خانہ کعبہ کی نشاندہی کے لیے طائف سے بھیجا گیا تھا، چنانچہ جب مغَمّس نامی جگہ پر انہوں نے پڑاؤ کیا ابورغال وہاں پہنچ کر مر گیا، ابورغال

کی اس غداری پر عربوں نے اس کی قبر پر سنگباری کی، یہ وہی قبر ہے جس پر مغمس نامی مقام پر پتھر برسائے جاتے رہے، کسی شاعر نے یوں نقشہ کشی کی

وَأَرْجُمُ قَبْرَهُ فِي كُلِّ عَامٍ ... كَرَجْمِ النَّاسِ قَبْرَ أَبِي رِغَالِ

میں اس کی قبر پر سالانہ سنگباری کروں گا جس طرح لوگ ابورغال کی قبر پر سنگباری کرتے ہیں۔

مغمّس میں پڑاؤ کے دوران ابرہہ نے اسود بن مقصود نامی ایک کالے حبشی کو اپنے گھوڑے پر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا، اسود بن مقصود حبشی مکہ پہنچ گیا، جہاں سے وہ قریش کے اموال ہانک لایا، ان میں نبی کریم ﷺ کے دادا عبد المطلب بن ہاشم کے بھی دوسو اونٹ تھے، عبد المطلب ہی ان دنوں قریش کے بڑے اور سردار تھے، چنانچہ قریش، کنانہ، ھذیل اوراس وقت جولوگ حرم میں تھے انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا، پھر انہیں پتا چل گیا کہ اس کا مقابلہ کرنے کی ان کے پاس طاقت نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے ابرہہ سے مقابلہ کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔

اس کے بعد ابرہہ نے حِناطہ حِمیری کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا اور یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ اس شہر کے شریف سردار سے جاکر کہے کہ بادشاہ ابرہہ یوں کہتا ہے إِنِّي لَمْ آتِ لِحَرْبِكُمْ، إِنَّمَا جِئْتُ لِهَدْمِ هَذَا الْبَيْتِ، فَإِنْ لَمْ تَعْرِضُوا لِي بِحَرْبٍ، فَلَا حَاجَةَ لِي بِدِمَائِكُمْ، فَإِنْ هُوَ لَمْ يُرِدْ حَرْبِي فَأْتِنِي بِهِ، میں تمہارے ساتھ لڑائی کے لیے نہیں آیا، میں تو اس بیت اللہ کو گرانے آیا ہوں، اگر تم میری مزاحمت نہیں کروگے تو مجھے تمہارے خون بہانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر اس کا میرے ساتھ لڑنے کا ارادہ نہیں تو پھر اسے میرے پاس لے آنا۔

جب حِناطہ حِمیری مکہ مکرمہ میں پہنچا تو لوگوں سے سردار قریش اور شریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا، اسے بتایا گیا کہ وہ عبد المطلب بن ہاشم ہیں، پھر حِناطہ ان کے پاس پہنچا اور ابرہہ نے جو پیغام اسے دے کر روانہ کیا تھا وہ ان تک پہنچایا، عبد المطلب نے اسے جواب دیا کہ

وَاللهِ مَا نُرِيدُ حَرْبَهُ، وَمَا لَنَا بِذَلِكَ مِنْهُ طَاقَةٌ، هَذَا بَيْتُ اللهِ الحَرَامِ، وَبَيْتُ خَلِيلِهِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَإِنْ يَمْنَعْهُ مِنْهُ فَهُوَ حَرَمُهُ وَبَيْتُهُ، وَإِنْ يُخَلِّ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ،

فَوَاللّٰہِ مَا عِنْدَنَا دَفْعٌ عَنْہُ، قسم بخدا! ہم اس سے لڑائی نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ہم اس سے لڑنے بھڑنے کی طاقت رکھتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت اور عزت والا گھر ہے، اللہ کے دوست ابراہیم خلیل کا گھر ہے، اگر وہ اسے اس سے باز رکھے تو یہ اس کا حرم اور اس کا گھر ہے اور اگر اس نے اس کو حملہ کرنے سے باز نہ رکھا تو یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے، ہمارے پاس تو واللہ اس کو روکنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

یہ بات سن کر حناطہ حمیری نے عبد المطلب سے کہا کہ پھر وہ ابرہہ کی طرف چلیں، اس نے مجھے کہہ کر بھیجا ہے کہ میں آپ کو لے کر آؤں، چنانچہ حناطہ کی بات سن کر عبد المطلب اس کے ساتھ چل پڑے، ان کے ہمراہ ان کے چند بیٹے بھی تھے۔

عبد المطلب لشکر ابرہہ میں پہنچ گئے، تو اپنے دوست ذو نفر کے بارے میں لشکر والوں سے پوچھا، جو ان کی قید میں تھا، پھر ذو نفر کے پاس پہنچے اور اس سے پوچھا کہ اے ذو نفر! جو مصیبت مجھ پر آن پڑی ہے اس سے چھٹکارے کے لیے کیا تدبیر ہے؟

ذو نفر نے عبد المطلب سے کہا کہ جو شخص کسی بادشاہ کا قیدی ہو اور اسے صبح و شام اپنی پھانسی کا انتظار رہتا ہے وہ مصیبت سے چھٹکارے کی کیا تدبیر بتا سکتا ہے؟ جو مصیبت آپ پر آن پہنچی ہے میرے پاس تو اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے، ہاں ہاتھی کا سائس جس کا نام انیس ہے وہ میرا دوست ہے، میں آپ کو اس کے پاس بھیج دیتا ہوں، میں اس سے سفارش کرتا ہوں اور اس پر آپ کا بڑا حق رکھتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ وہ بادشاہ سے آپ کے لیے اجازت لے کر دے تاکہ جو کچھ آپ سمجھتے ہیں اس سے بات کر لیں، اگر اس سے ہو سکا تو وہ بادشاہ کے سامنے آپ کی زوردار سفارش بھی کر دے گا، اس پر عبد المطلب نے کہا کہ کافی ہے۔

چنانچہ ذو نفر حضرت عبد المطلب کو انیس کے پاس لے گیا اور اس سے کہا کہ عبد المطلب سردار قریش ہیں، مکہ کے چاہ زمزم کے مالک ہیں، لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، پہاڑوں پر بسیرا کرنے والے وحشی جانوروں کی حفاظت کرتے ہیں، بادشاہ ابرہہ نے ان کے دو سو اونٹ تاوان میں لے لیے

ہیں، انہیں بادشاہ کے پاس لے جاؤ اور جتنا آپ سے ہو سکتا ہے ان کے ساتھ تعاون کیجیے، انیس نے کہا کہ میں ایسا کروں گا، چنانچہ انیس نے ابرہہ سے بات کی، اور کہا

اے بادشاہ! یہ سردار قریش آپ کے دروازے پر آئے ہیں، وہ آپ کے پاس آنے کی اجازت مانگتے ہیں، وہ مکہ کے آب زمزم کے چشمہ کے مالک ہیں، وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، وہ پہاڑوں پر رہنے والے جانوروں کی حفاظت کرتے ہیں، انہیں اپنے پاس آنے کی اجازت دیجیے، وہ کسی کام کے سلسلہ میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

ابرہہ نے عبد المطلب کو ملاقات کی اجازت دے دی، سیرتِ ابن ہشام میں ہے

وَكَانَ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ أَوْسَمَ النَّاسِ، وَأَعْظَمَهُمْ وَأَجْمَلَهُمْ، فَلَمَّا رَآهُ أَبْرَهَةُ أَجَلَّهُ، وَأَعْظَمَهُ عَنْ أَنْ يُجْلِسَهُ تَحْتَهُ، فَنَزَلَ أَبْرَهَةُ عَنْ سَرِيرِهِ، فَجَلَسَ عَلَى بِسَاطِهِ وَأَجْلَسَهُ مَعَهُ عَلَيْهِ إِلَى جَنْبِهِ، عبد المطلب بہت خوبصورت لوگوں میں سے تھے، ان میں سب سے عظیم اور سب سے زیادہ حسین و جمیل تھے، جب ابرہہ کی نگاہ ان پر پڑی تو ان کی جلالت اور عظمت شان کے باعث انہیں نیچے بٹھانا مناسب نہیں سمجھا، اس کے بعد ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اترا اور عبد المطلب کے ساتھ فرش پر ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

پھر ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا کہ عبد المطلب سے پوچھیں کہ ان کا کیا کام ہے؟ عبد المطلب نے ترجمان کو اپنی آمد کا مقصد کہہ سنایا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ بادشاہ میرے دوسو اونٹ واپس کر دے، جب ترجمان نے یہ بات بادشاہ کو بتائی تو ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا کہ وہ انہیں کہیں کہ

لَقَدْ كُنْتُ أَعْجَبْتَنِي حِينَ رَأَيْتُكَ، ثُمَّ قَدْ زَهِدْتُ فِيكَ حِينَ كَلَّمْتَنِي، أَتُكَلِّمُنِي فِي مِائَتَيْ بَعِيرٍ أَصَبْتُهَا لَكَ، وَتَتْرُكُ بَيْتًا هُوَ دِينُكَ وَدِينُ آبَائِكَ، قَدْ جِئْتُ لِهَدْمِهِ؟ لَا تُكَلِّمُنِي فِيهِ، مجھے تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی، پھر آپ کی یہ گفتگو سن کر، آپ اپنے دوسو اونٹوں کے لیے میرے ساتھ بات کرنے آئے ہیں، آپ اس گھر کی بات نہیں کرتے جو آپ کے دین کا مرکز ہے اور

آپ کے آباؤاجداد کے دین کا مرکز ہے، جس کو گرانے اور منہدم کرنے کے لیے میں آیا ہوں، آپ اس گھر کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے

ابرہہ کی طرف سے یہ بات سن کر عبد المطلب نے فرمایا کہ إِنِّي أَنَا رَبُّ الْإِبِلِ، وَإِنَّ لِلْبَيْتِ رَبًّا سَيَمْنَعُهُ، میں اونٹوں کا مالک ہوں اور بیت اللہ شریف کا رب اسے اس سے روک دے گا۔

ابرہہ نے عبد المطلب کی یہ بات سن کر ان کے اونٹ واپس لوٹانے کا حکم دے دیا، اس کے بعد عبد المطلب قریش کی طرف واپس لوٹے اور انہیں سارا معاملہ کہہ سنایا اور انہیں مکہ سے نکلنے کا حکم دے دیا، انہوں نے اپنے لوگوں کو بتایا کہ وہ ابرہہ کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے، بہتر یہ ہے کہ ہم پہاڑوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں پناہ لے لیں، کہیں ابرہہ کا لشکر انہیں، ان کے مال مویشی کو نقصان نہ پہنچادے۔

پھر عبد المطلب نے باب کعبہ کا حلقہ پکڑ لیا، ان کے ساتھ قریش کے کچھ لوگ بھی باب کعبہ کا حلقہ پکڑ کر اللہ سے دعا اور ابرہہ اور اس کے لشکریوں کے خلاف اللہ سے مدد مانگنے لگے، عبد المطلب خانہ کعبہ کا حلقہ پکڑے ہوئے یوں کہہ رہے تھے

لَا هُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْ ...-نَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حِلَالَكَ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ ...وَمِحَالُهُمْ عَدْوًا مِحَالَكَ
إِنْ يَّدْخُلُوا الْبَلَدَ الْحَرَا ...مَ فَأَمْرُ مَا بَدَا لَكَ

اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر (گھر کے مجاوروں) کی حفاظت فرما، صلیبیوں کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں کبھی غالب نہ آئے، اگر وہ حرمت والے شہر میں داخل ہو جائیں تو تو وہ کر جو تو کرنا چاہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ حضرت عبد المطلب نے باب کعبہ کا حلقہ تھام کر یہ دعا کی تھی

يَارَبِّ لَا أَرْجُو لَهُمْ سِوَا كَا ...يَارَبِّ فَامْنَعْ مِنْهُمْ حِمَا كَا
إِنَّ عَدُوَّ الْبَيْتِ مَنْ عَادَا كَا. ..إِنَّهُمْ لَنْ يَقْهَرُوا قُوَا كَا

اے میرے رب! تیرے سوا ان کے مقابلے کی مجھے کسی سے امید نہیں ہے، اے رب! انہیں اپنے حرم سے باز رکھیے، بیت اللہ شریف کا دشمن آپ کا دشمن ہے، وہ تیری قوتوں پر غالب نہیں آسکتے۔

ایک اور قریشی عکرمہ بن عامر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار نے کہا

لَا هُمَّ أَخْزِ الْأَسْوَدَ بْنَ مَقْصُودْ... الْآخِذَ الْهَجْمَةَ فِيهَا التَّقْلِيدْ

بَيْنَ حِرَاءٍ وَثَبِيرٍ فَالْبِيدْ... يَحْبِسُهَا وَهِيَ أُولَاتُ التَّطْرِيدْ

فَضَمَّهَا إِلَى طَمَاطِمٍ سُودْ... قَدْ أَجْمَعُوا أَلَّا يَكُونَ مَعْبُودْ

وَيَهْدِمُوا الْبَيْتَ الْحَرَامَ الْمَعْمُودْ... وَالْمَرْوَتَيْنِ وَالْمَشَاعِرِ السُّودْ

أَخْفِرْهُ يَا رَبِّ وَأَنْتَ مَحْمُودْ

اے اللہ! اسود بن مقصود کو ذلیل و رسوا کر جس نے سینکڑوں اونٹوں کو پکڑ لیا جن کی گردنوں میں قلادے تھے، وہ حرا، ثبیر کے درمیان تھے کھلے میدان نے انہیں محبوس کر رکھا تھا وہ پے در پے آنے والے ہیں۔ اس نے ان اونٹوں کو کالے عجمی کافر کے سپرد کر دیا انہوں نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ کوئی معبود نہ ہو اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ بیت حرام کو گرا دیں جس کا قصد کیا جاتا ہے وہ صفا و مروہ کے آثار مٹا دیں اور حجر اسود کو مٹا دیں اے میرے رب! اس کے عزم کو خاک میں ملا دے بیشک تو محمود ہے۔

ابن اسحاق نے کہا: پھر حضرت عبد المطلب نے بیت اللہ شریف کے دروازے کا حلقہ چھوڑ دیا پھر وہ اور آپ کے ساتھی قریشی پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف چلے گئے وہاں انہوں نے پناہ لی اور انتظار کرنے لگے کہ ابرہہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر کیا کرتا ہے؟

جب ابرہہ نے صبح کی تو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی کو تیار کیا اپنے لشکر کو صف آرا کیا ہاتھی کا نام محمود تھا اور ابرہہ بیت اللہ شریف کو گرانے کا قصد کرنے والا تھا پھر یمن جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ جب انہوں نے مکہ مکرمہ کی طرف ہاتھی کو لے جانا چاہا تو نفیل بن حبیب آگے بڑھا

یہاں تک کہ وہ ہاتھی کے پہلو میں جا کھڑا ہوا پھر اس کا کان پکڑا اسے کہا: اِبْرُكْ مَحْمُوْدُ، وَارْجِعْ رَاشِدًا مِنْ حَيْثُ جِئْتَ، فَإِنَّكَ فِي بَلَدِ اللهِ الْحَرَامِ، اے محمود! بیٹھ جا اور جہاں سے آیا ہے سیدھا اس کی طرف لوٹ جا کیونکہ تو اللہ تعالیٰ کے حرمت والے شہر میں ہے۔

نفیل بن حبیب دوڑتا ہوا نکل گیا یہاں تک کہ وہ پہاڑ پر چڑھ گیا انہوں نے ہاتھی کو اٹھانے کے لیے مارا تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا، انہوں نے اس کے سر میں کلہاڑا مارا تا کہ وہ اٹھے، تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا، انہوں نے اس کے پیٹ میں ایسا عصا مارا جس کا سرا مڑا ہوا تھا، انہوں نے اسے لہولہان کر دیا تا کہ وہ اٹھے، تو اس نے پھر بھی انکار کر دیا، انہوں نے اس کا منہ یمن کی طرف کیا تو وہ دوڑ پڑا، انہوں نے اس کا منہ شام کی طرف کیا تو پھر بھی اس نے اسی طرح کیا تو وہ دوڑ پڑا، انہوں نے اس کا منہ مشرق کی طرف کیا تو اس نے اس طرف کیا، انہوں نے اس کا منہ مکہ مکرمہ کی طرف کیا تو وہ بیٹھ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے سمندر کی جانب سے ان پر پرندے بھیجے جو خطاطیف اور بلسان جیسے تھے ہر پرندے کے ساتھ تین پتھر تھے ایک پتھر اس کی چونچ میں تھا دو پتھر اس کے پاؤں میں تھے جو چنے اور مسور کی دال کے درمیان تھے لشکر والوں میں سے جسے وہ پہنچتا وہ ہلاک ہو جاتا وہ سب کو نہ لگے وہ بھاگتے ہوئے نکلے وہ اس راستہ پر جلدی جلدی جا رہے تھے جس سے وہ آئے تھے وہ نفیل بن حبیب کے بارے میں پوچھ رہے تھے تا کہ یمن کے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرے اللہ تعالیٰ نے جو عذاب ان پر نازل کیا تھا جب نفیل نے وہ دیکھا تو کہا:

أَيْنَ الْمَفَرُّ وَالْإِلٰهُ الطَّالِبُ ... وَالْأَشْرَمُ الْمَغْلُوبُ لَيْسَ الْغَالِبُ

اب بھاگنے کے لیے کہاں جگہ ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تلاش میں ہو، اشرم مغلوب ہے وہ غالب نہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ

حَمِدْتُ اللهَ إِذْ أَبْصَرْتُ طَيْرًا ... وَخِفْتُ حِجَارَةً تُلْقَى عَلَيْنَا
فَكُلُّ الْقَوْمِ يَسْأَلُ عَنْ نُفَيْلٍ ... كَأَنَّ عَلَيَّ لِلْحُبْشَانِ دَيْنَا
أَلَا حُيِّيتَ عَنَّا يَا رُدَيْنَا ... نَعِمْنَا كُمْ مَعَ الْإِصْبَاحِ عَيْنَا

أَتَانَا قَابِسٌ مِنْكُمْ عِشَاءً ... فَلَمْ يُقْدَرْ لِقَابِسِكُمْ لَدَيْنَا
رُدَيْنَةُ لَوْ رَأَيْتِ وَلَا تَرَيْهِ ... لَدَى جَنْبِ الْمُحَصَّبِ مَا رَأَيْنَا
إِذَا لَعَذَرْتِنِي وَحَمِدْتِ أَمْرِي ... وَلَمْ تَأْسَيْ عَلَى مَا فَاتَ بَيْنَا

جب میں نے پرندوں کو دیکھا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، میں ان پتھروں سے ڈر رہا تھا جو ہم پر پھینکے جارہے تھے، تمام لوگ نفیل کے بارے میں پوچھ رہے تھے گویا حبشیوں کا مجھ پر کوئی قرض تھا، اے رُدینہ !کاش تو دیکھتی اور تو نہیں دیکھ سکے گی، جو کچھ ہم نے وادی محصّب کے قریب دیکھا، اس وقت تو مجھے معذور جانتی اور میرے کام کی تعریف کرتی اور جو کچھ ہو چکا ہے اس پر افسوس نہ کر۔

وہ ہر راستہ پر گرتے پڑتے نکل پڑے، وہ ہر میدانی جگہ میں مرتے جارہے تھے ابرہہ کے جسم میں بیماری لگ گئی وہ اسے لے کر نکل پڑے اس سے پورا پورا گر رہا تھا جب بھی اس سے پورا بھر حصہ گرتا اس سے پیپ نمودار ہوتی اور خون اور پیپ پھوٹ پڑتی یہاں تک کہ وہ اسے صنعا لے آئے وہ پرندے کے ایک چوزے کی طرح تھا اسے اس وقت موت واقع نہ ہوئی یہاں تک کہ اس کے دل کی جگہ سے اس کا سینہ پھٹ گیا۔ (تفسیر کبیر للرازی، تفسیر قرطبی)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ابرہہ کا خاص ہاتھی آگے کی طرف نہ بڑھا تو انہوں نے دوسرا ہاتھی آگے کیا، پرندوں کی ایک کنکری اسے لگی تو بلبلا کر پیچھے ہٹا اسے دیکھ کر دوسرے ہاتھی بھی بھاگ گئے، اوپر سے مسلسل کنکریاں برسنے لگیں، بہت سے وہیں ڈھیر ہو گئے اور جو دائیں بائیں بھاگ گئے وہ بھی نہ بچ سکے، بھاگتے بھاگتے ان کے اعضاء کٹ کٹ کر گرتے جاتے تھے اور جان ہی چلی جاتی تھی، ابرہہ بھی بھاگا لیکن اس بھاگم بھاگ میں اس کا ایک ایک عضو کٹ کٹ کر گرنا شروع ہو گیا، جب وہ خشعم کے شہروں سے صنعاء پہنچا تو ابرہہ گوشت کا مکمل لوتھڑا بن چکا تھا، وہیں بلک بلک کر دم توڑ دیا۔ (تفسیر ابن کثیر، آخری دس سورتوں کی تفسیر مؤلفہ راقم الحروف)

مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے ابرہہ کی عبرت ناک موت کی عجیب نقشہ کشی فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں

وَجَعَلُوا يَتَسَاقَطُونَ بِكُلِّ طَرِيقٍ وَيَهْلِكُونَ فِي كُلِّ مَنْهَلٍ، وَأُصِيبَ أَبْرَهَةُ فِي جَسَدِهِ وَخَرَجُوا بِهِ مَعَهُمْ تَسْقُطُ أَنَامِلُهُ كُلَّمَا سَقَطَتْ أَنْمِلَةٌ تَبِعَهَا مِنْهُ مُدَّةٌ ثُمَّ دَمٌ وَقَيْحٌ حَتَّى قَدِمُوا صَنْعَاءَ وَهُوَ مِثْلُ فَرْخِ الطَّائِرِ، فَمَا مَاتَ حَتَّى انْصَدَعَ صَدْرُهُ عَنْ قَلْبِهِ (روح المعانی)

سارے راستے میں گوشت گرتا جاتا تھا، ہر پڑاؤ پر ہلاکت میں چلے جاتے تھے، ابرہہ کے جسم میں ایسی بیماری لگی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر وہاں سے نکلے اس کی انگلیوں کا پورا پورا گر رہا تھا، کچھ دیر اسی طرح رہتا پھر خون اور پیپ نکلتی تھی یہاں تک کہ وہ صنعاء اس حال میں پہنچے کہ ابرہہ پرندے کے چوزے کی طرح ہو چکا تھا، اسکے دل کی جگہ اس کا سینہ پھٹا اور وہ مر گیا۔ (آخری دس سورتوں کی تفسیر مؤلفہ راقم الحروف)

ابن الزبعری نے اپنے اشعار میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ

سَائِلْ أَمِيرَ الْجَيْشِ عَنْهَا مَا رَأَى ... وَلَسَوْفَ يُنْبِي الْجَاهِلِينَ عَلِيمُهَا
سِتُّونَ أَلْفًا لَمْ يَئُوبُوا أَرْضَهُمْ ... وَلَمْ يَعِشْ بَعْدَ الْإِيَابِ سَقِيمُهَا
كَانَتْ بِهَا عَادٌ وَجُرْهُمُ قَبْلَهُمْ ... وَاللّٰهُ مِنْ فَوْقِ الْعِبَادِ يُقِيمُهَا

لشکر کے سربراہ (ابرہہ) سے پوچھ لو کہ اس نے مکہ میں کیا دیکھا؟ عنقریب جاننے والے نہ جاننے والوں کو خبر دیں گے، ساٹھ ہزار مخالف ہلاک ہو گئے اور اپنے ملک یمن کی طرف نہیں لوٹے، بلکہ ان کا بیمار ابرہہ بھی لوٹنے کے بعد زندہ نہ رہا، ان سے پہلے اس سرزمین (یمن) میں قبائل عاد اور جرہم بھی رہ چکے ہیں، اور اللہ ہمیشہ بندوں سے بڑھ کر مکہ کی حفاظت کر رہا ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ساٹھ ہزار نشان عبرت بن گئے، ان میں صرف ایک ہی شخص بچا تھا جس نے شاہ حبشہ نجاشی کو جا کر اس واقعہ کی اطلاع دی، ایک پرندہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا، جونہی وہ نجاشی کو اطلاع دے کر فارغ ہوا تو اس پرندے نے اس کے سر پر کنکری دے ماری، جس کے لگتے ہی وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔ (روح المعانی)

صیفی بن اسلت نے عبرت ناک سزا پانے والوں کے بارے میں کہا

وَمِنْ صُنْعِهِ يَوْمَ فِيلِ الْحَبُوشِ ... إِذْ كُلَّمَا بَعَثُوهُ رَزَمْ
مَحَاجِنُهُمْ تَحْتَ أَقْرَابِهِ ... وَقَدْ شَرَّمُوا أَنْفَهُ فَانْخَرَمْ
وَقَدْ جَعَلُوا سَوْطَهُ مِغْوَلًا ... إِذَا يَمَّمُوهُ قَفَاهُ كُلِمْ
فَوَلَّى وَأَدْبَرَ أَدْرَاجَهُ ... وَقَدْ بَاءَ بِالظُّلْمِ مَنْ كَانَ ثَمَّ
فَأَرْسَلَ مِنْ فَوْقِهِمْ حَاصِبًا ... فَلَفَّهُمْ مِثْلَ لَفِّ الْقُزُمْ
تَحُضُّ عَلَى الصَّبْرِ أَحْبَارُهُمْ ... وَقَدْ ثَأَجُوا كَثُؤَاجِ الْغَنَمْ

سرکش اور مست ہاتھی کا واقعہ اللہ کی حکمت پر دلالت کرتا ہے کہ جب وہ ہاتھی والے اسے لڑائی کے لیے اٹھاتے تھے، تو وہ ہاتھی اس سے بھاگتا تھا، وہ لوگ اپنی ڈھالیں اس کی پسلیوں میں مارتے تھے، مگر وہ نہیں مانتا تھا، ابرہہ کی ناک کاٹی گئی اور وہ نک کٹا ہو گیا، انہیں نے مضبوط کوڑے بنا کر ہاتھی کو مارا اور اس کی پیٹھ کو زخمی کر دیا مگر وہ پھر بھی نہ مانا، آخر وہ بھاگ گیا اور پیٹھ پھیر گیا اور جو اس کے ساتھی تھے ظالم ہو گئے، پھر اللہ نے ان ظالموں کی ہلاکت وتباہی کے لیے اوپر سے کنکر برسائے اور انہیں قیمہ کی طرح تہہ وبالا کر دیا، ان کے پادری انہیں صبر کی ترغیب دے رہے تھے اور وہ بکریوں کی طرح گرمائے ہوئے تھے۔

یہی ابو قیس بن اصلت صیفی کہتا ہے

فَقُومُوا فَصَلُّوا رَبَّكُمْ وَتَمَسَّحُوا ... بِأَرْكَانِ هَذَا الْبَيْتِ بَيْنَ الْأَخَاشِبِ
فَعِنْدَكُمْ مِنْهُ بَلَاءٌ مُصَدَّقٌ ... غَدَاةَ أَبِي يَكْسُومَ هَادِي الْكَتَائِبِ
كَتِيبَتُهُ بِالسَّهْلِ تُمْسِي وَرَجْلُهُ ... عَلَى الْقَاذِفَاتِ فِي رُءُوسِ الْمَنَاقِبِ
فَلَمَّا أَتَاكُمْ نَصْرُ ذِي الْعَرْشِ رَدَّهُمْ ... جُنُودُ الْمَلِيكِ بَيْنَ سَافٍ وَحَاصِبِ
فَوَلَّوْا سِرَاعًا هَارِبِينَ وَلَمْ يَؤُبْ ... إِلَى أَهْلِهِ مِلْحَبْشِ غَيْرُ عَصَائِبِ

اب اٹھو اور اپنے رب کی نماز ادا کرو، ان حبشیوں کے بیچ میں اس عظیم الشان گھر کے ارکان کو چھو لو، کیونکہ تم پر اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس دن کہ تم نے ابو یکسوم (ابرہہ) پر فتح پائی، جس کے ساتھ بہت سے لشکر تھے، اس کے سوار تو ہموار زمین پر چلتے تھے، اور اس کے پیادے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلتے تھے، لیکن جب اللہ ذوالعرش کی مدد تمہارے پاس آئی تو اللہ کے لشکر (ابابیل) نے انہیں کھنگروں سے ہلاک کر دیا، پس مخالف جلدی سے پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگ گئے، اور حبش کے لشکر میں سے کوئی اپنے سر پر پٹی کے بغیر گھر کی طرف نہیں لوٹا۔

طالب بن ابی طالب بن عبد المطلب نے کہا

أَلَمْ تَعْلَمُوا مَا كَانَ فِي حَرْبِ دَاحِسٍ. وَجَيْشِ أَبِي يَكْسُومَ إِذْ مَلَئُوا الشِّعْبَا

فَلَوْلَا دِفَاعُ اللهِ لَا شَيْءَ غَيْرُهُ... لَأَصْبَحْتُمْ لَا تَمْنَعُونَ لَكُمْ سِرْبَا

کیا تم نہیں جانتے کہ داحس کی لڑائی اور ابو یکسوم (ابرہہ) کے لشکر کا کیا حال ہوا؟ جب کہ وہ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں پھیلا ہوا تھا، اگر اللہ انہیں دفع نہ کرتے تو تم ان کے لشکر کو نہیں روک سکتے تھے۔

ابو صلت بن ابو ربیعہ ثقفی نے کہا تھا کہ

إِنَّ آيَاتِ رَبِّنَا ثَاقِبَاتُ. ..لَا يُمَارِي فِيهِنَّ إِلَّا الْكَفُورُ

خُلِقَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ فَكُلٌّ مُسْتَبِينٌ حِسَابُهُ مَقْدُورُ

ثُمَّ يَجْلُو النَّهَارَ رَبٌّ رَحِيمٌ بِمَهَاةٍ شَعَاعُهَا مَبْثُورُ

حُبِسَ الْفِيلُ بِالْمُغَمِّسِ حَتَّى ظَلَّ يَحْبُو كَأَنَّهُ مَعْقُورُ

لَازِمًا حَلْقَةَ الْجِرَانِ كَمَا قُطِّرَ مِنْ صَخْرٍ كَبْكَبٍ مَحْدُورُ

حَوْلَهُ مِنْ مُلُوكِ كِنْدَةَ أَبْطَالٌ مَلَاوِيثُ فِي الْحُرُوبِ صُقُورُ

خَلَّفُوهُ ثُمَّ ابْذَعَرُّوا جَمِيعًا كُلُّهُمْ عَظْمُ سَاقِهِ مَكْسُورُ

كُلُّ دِينٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ اللهِ إِلَّا دِينَ الْحَنِيفَةِ بُورُ

ہمارے رب کے دلائل واضح اور روشن ہیں، کافروں کے سوا ان میں کوئی جھگڑا نہیں کرتا، رات اور دن پیدا کیے گئے، ہر ایک اپنے حساب و اندازے سے چل رہا ہے، پھر رب رحیم سورج کے ذریعے سے دن کو روشن کرتا ہے جس کی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں، ابرہہ کے ہاتھی کو مغمس میں بند کر دیا گیا کہ مکہ پر حملہ نہ کر سکا گویا اس کے پاؤں کاٹ دیے گئے تھے، اگرچہ اس کے ارد گرد سلاطین کندہ کے بہادر آدمی تھے، جو لڑائیوں میں باز کی طرح کام آتے تھے، اور اس کو اشتعال دیتے تھے، آخر جب ہاتھی نے نہ مانا تو ناچار انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، اور آپ سب بھاگ گئے، اور ہر ایک کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی، تمام ادیان قیامت کے دن اللہ کے ہاں تباہ ہوں گے سوائے دین حنیف (دین ابراہیمی) کے۔

اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو عبرت ناک سزا سے دوچار کیا، حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ جن پرندوں نے ابرہہ کے لشکر پر حملہ کیا وہ رات ہی کو اس طرف آ گئے تھے، انہوں نے یہاں رات گزاری اور جونہی صبح ہوئی تو انہوں نے اس لشکر پر حملہ کر دیا اور ان پر کھنگر برسائے۔

حضرت کلبی فرماتے ہیں کہ ان پرندوں کی چونچوں میں ٹھیکری کی طرح کنکریاں تھیں، ہر ٹولی کے آگے آگے ایک پرندہ ان کی راہنمائی کر رہا تھا، سرخ چونچیں، کالے سر اور لمبی گردنیں یہ سراپا ان پرندوں کا تھا، جن جن پر کنکر، کھنگر پڑتے تھے بندوں کے نام ان پر مرقوم تھے کہ یہ کنکر کھنگر کسے لگنا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر میں ہے کہ ہر کنکر پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی مَنْ أَطَاعَ اللّٰهَ نَجَا، وَمَنْ عَصَاهُ غَوَى. جس نے اللہ کی اطاعت کی وہ نجات پا گیا، اور جس نے اس کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا۔

یہ پرندے پتھر، کنکر، کھنگر پھینکتے اور ادھر ہی واپس چلے جاتے تھے جدھر سے آئے تھے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان میں مکہ کے کبوتر بھی تھے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ پرندوں کی طرف سے پھینکے جانے والے کنکر، کنگھر ان کے لوہے کے ٹوپوں پر پڑتے تو انہیں پھاڑ دیتے تھے، ان کے دماغ میں اتر جاتے، ہاتھیوں اور جانوروں کو پھاڑ دیتے تھے، یہ کنکر کنگھر اس قدر زور سے برستا تھا کہ انہیں لگنے کے بعد زمین میں پیوست ہو جاتا تھا، ہاتھی والے ساٹھ ہزار لوگ تھے، ان میں ایک ابرہہ

کو چھوڑ کر کوئی بھی واپس نہیں گیا، چند گنتی کے تھوڑے سے لوگ اس کے ہمراہ تھے، جب ان لوگوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والے ہولناک منظر کو یمن والوں کے سامنے بیان کیا تو اس کے بعد یہ مر گئے تھے۔

علامہ واقدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ابرہہ اس نجاشی کا دادا تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، اسے ابرہہ الاشرم کہا جاتا ہے، اس ابرہہ اور ارياط کے مابین لڑائی ہوئی تھی، یہ ابرہہ چھوٹے قد کا تھا، جب کہ ارياط بڑے قد اور بڑے جثے والا تھا، اس کے ہاتھ میں برچھی یا نیزہ تھا، جو اس نے ابرہہ کو دے مارا، برچھی ابرہہ کے سر پر لگی، جو اس کی پیشانی میں اتر گئی، جس نے اس کی آنکھ، ناک، پیشانی اور ہونٹوں کو متاثر کیا، اسی وجہ سے ابرہہ کو الاشرم کہا جاتا ہے، ابرہہ کو جس وقت برچھی لگی اس وقت اس کے پیچھے اس کا ایک وزیر عتوَدہ کھڑا تھا، اس نے ارياط پر حملہ کر دیا اور اسے مار ڈالا۔

جب حبشہ میں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو نجاشی سخت غصہ ہوا اور قسم اٹھائی اور ابرہہ کو خط لکھا کہ وہ ابرہہ کی چوٹی کاٹ لائے گا اور اس کے شہروں کو روند ڈالے گا، ابرہہ نجاشی کا پیغام پڑھنے کے بعد اشتعال میں نہیں آیا، اس نے اپنے اقتدار کے دوام اور بقاء کی خاطر انتہائی عاجزی اور انکساری سے نجاشی کو خط کا جواب دیا، بہت سے تحائف نجاشی کے لیے روانہ کرنے کا ارادہ کر لیا، یمن کی مٹی ایک تھیلی میں ڈال کر اپنی پیشانی کے بال کاٹ کر اس میں رکھ دیے، اس خط میں ابرہہ نے اپنے قصور کی معافی مانگی، اور لکھا کہ یمن کی مٹی حاضر ہے، میری چوٹی کے بال حاضر ہیں، آپ اپنی قسم پوری کر لیں، ناراضگی معاف فرما دیں، اس سے شاہ حبشہ نجاشی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ خوش ہو گیا اور یمن کی سرداری کا تاج ابرہہ کے سر پر سج گیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ ابرہہ کے خط کے مندرجات نقل کرتے ہیں جس میں اس نے لکھا کہ وہ (ارياط) بھی آپ کا غلام تھا اور میں بھی آپ کا غلام ہوں یہ تحریر پڑھنے کے بعد نجاشی کا غصہ فرو ہوا اور یوں یمن کی سرداری ابرہہ کو مل گئی۔ اس کے بعد پھر ابرہہ نے یمن میں ایک گرجا بنایا تاکہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کے حج سے صنعاء یمن کے اس گرجے کی طرف پھیرا جا سکے۔

ولادتِ مصطفےٰ کریم ﷺ

مفسر قرآن حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے چالیس سال پہلے واقعہ فیل رونما ہوا، کلبی اور عبید بن عمیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اصحاب الفیل نبی کریم ﷺ کی ولادت مبارکہ سے تئیس سال پہلے ہوا، امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست بات وہ ہے جو حدیث شریف میں ہے، نبی کریم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے کہ میں عام الفیل (ہاتھی والے واقعے کے سال) میں پیدا ہوا ہوں۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور کتاب اعلام النبوت میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو واقعہ فیل کے پچاس روز بعد پیدا ہوئے۔ (قرطبی)

حضرت وہب بن مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے، حضرت قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

عبد الملک بن مروان نے عتاب بن اسید سے سوال کیا کہ آپ بڑے ہیں یا نبی کریم ﷺ؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ مجھ سے درجے اور مقام میں بڑے ہیں، جب کہ میں آپ ﷺ سے عمر میں بڑا ہوں، نبی کریم ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ: امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نے یا رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ بلکہ لکھا ہے آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اس میں یہ اشارہ ہے کہ کفار مکہ نے دیکھا کہ جو لوگ کعبہ گرانے آئے تھے، ان سے اللہ تعالیٰ نے کس طرح انتقام لیا، پھر بھی انہوں نے بت پرستی نہیں چھوڑی، اور اے محمد ﷺ! آپ نے اس واقعہ کا مشاہدہ نہیں کیا، پھر بھی آپ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کر کے اس کا شکر ادا کیا اور اس کی اطاعت اور عبادت کی، پس گویا کہ آپ نے اللہ سبحانہ کا یہ انتقام دیکھا، سو آپ ان کفار سے بری ہو گئے اور میں نے سب لوگوں میں سے آپ کو پسند کر کے چن لیا، پس میں کہتا ہوں: "ربک" یعنی میں آپ کا رب ہوں اور آپ کا حامی اور ناصر ہوں نہ کسی اور کا۔

اور اس میں دوسرا اشارہ یہ ہے کہ میں نے اصحاب الفیل سے جو یہ انتقام لیا ہے، وہ محض آپ کے اکرام اور آپ کی تعظیم کے لئے لیا ہے اور آپ کی آمد کی عزت افزائی کے لئے، پس جب میں نے آپ کی آمد سے پہلے آپ کی تکریم کی ہے تو آپ کے ظہور کے بعد میں آپ کی حمایت اور نصرت کیوں نہ کروں گا اور اس میں نبی ﷺ کے لئے یہ بشارت ہے کہ آپ ضرور فتح مند اور کامیاب اور سرخ رو ہوں گے۔

فرمایا: کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ اس میں یہ اشارہ ہے کہ کعبہ سیدنا محمد ﷺ کے تابع ہے، کعبہ صدف اور سیپی کی طرح ہے اور آپ اس میں موتی کی طرح ہیں، سو جب کسی نے کعبہ کو نقصان پہنچانے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے انتقام لیا، تو ولید بن مغیرہ اور اخنس بن شریق جو آپ کو طعنے دے کر اور آپ کے عیب نکال کر آپ کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور آپ کا دل دکھاتے ہیں، حالانکہ آپ باعث تخلیق کائنات ہیں تو میں ان کو کیوں نہ سزا دوں گا اور ان کی گرفت کیوں نہ کروں گا اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کعبہ آپ کی نمازوں کا قبلہ ہے اور آپ کا دل آپ کی معرفت رب کا قبلہ ہے تو جب میں نے آپ کے اعمال کے قبلہ کی دشمنوں سے حفاظت کی ہے تو میں آپ کے عقائد کے قبلہ کی دشمنوں سے حفاظت کیوں نہ کروں گا اور آپ کی ذات سے عداوت رکھنے والوں کو ملیامیٹ کر دوں گا۔

بِأَصْحَابِ الْفِيلِ: اس آیت میں اصحاب الفیل فرمایا ہے، ارباب الفیل (ہاتھیوں کے مالکوں) نہیں فرمایا کیونکہ اصحاب جب کسی چیز کی طرف مضاف ہو تو وہ مضاف الیہ کی جنس سے ہوتا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ ابرھہ اور اس کا لشکر ہاتھیوں کی جنس سے تھا یعنی جس طرح ہاتھی حیوان اور بے عقل ہیں، اسی طرح ابرھہ اور اس کا لشکر بھی حیوانوں کی طرح بے عقل تھا، ورنہ وہ اللہ سبحانہ کے گھر کو گرانے کے لئے نہ آتا۔

اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب دو شخصوں میں مصاحبت ہو تو ان میں سے ادنی کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ کا صاحب ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر، رسول اللہ ﷺ کے صاحب ہیں،

یہ نہیں کہا جاتا کہ آپ ان کے صاحب ہیں اور جو لوگ آپ کی صحبت میں رہے ان کو صحابہ کہا جاتا ہے، پس ابرھہ اور اس کے لشکر کو اصحاب الفیل فرمایا یعنی وہ ہاتھیوں سے بھی ادنیٰ درجہ کے ہیں کیونکہ جب انہوں نے ہاتھیوں کو مکہ کی طرف چلانا چاہا تو ہاتھی بیٹھ گئے اور ان کی ہزار کوشش کے باوجود وہ مکہ کی طرف ایک قدم بھی نہیں چلے، اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھیوں کو یہ معرفت تھی کہ خالق کی معصیت اور اس کے خلاف بغاوت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاتی اور ابرھہ اور اس کا لشکر اس معرفت سے خالی تھے، وہ خالق سے بغاوت کرنے اور اس کا گھر گرانے چلے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الاعراف:۱۷۹) یہ کفار جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

لشکر ابرہہ کو فوری عذاب کیوں؟

کفار کعبہ میں بت پرستی کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام نہیں لیا اور ابرھہ نے کعبہ کی دیواروں کو گرانے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام لیا، اس کی وجہ کیا ہے؟ امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کعبہ میں بت پرستی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حق میں کمی اور تعدی کرتے ہیں اور کعبہ کی دیواریں گرانے سے مخلوق کے حق میں کمی اور تعدی اور بعض اوقات مخلوق کے حق میں کمی اور تعدی کو برداشت نہیں کیا جاتا، جیسے ڈاکو، باغی اور قاتل خواہ مسلمان ہوں، ان کو قتل کر دیا جاتا ہے اور جہاد میں جو کافر بوڑھا ہو یا اندھا ہو یا بچہ ہو یا عورت ہو، اس کو قتل نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ مخلوق کو ضرر نہیں پہنچاتے۔

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ: کیا اس نے ان لوگوں کی ساری چالیں بیکار نہیں کر دی تھیں؟ کید خفیہ طریقہ سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے ارادے کو کہا جاتا ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر نے تو خفیہ طریقہ سے کوئی سازش نہیں کی، وہ تو کھلم کھلا بیت اللہ شریف کو منہدم کرنے اور گرانے کے لیے آئے تھے، پھر ان کے اس شر انگیز عمل کو کید کیوں کہا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کو کھلم کھلا گرانے کے لیے آئے تھے خفیہ پروگرام نہیں تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ ابرہہ کے دل میں یک شر پوشیدہ تھا جسے اس نے ظاہر کیا، کیونکہ وہ عربوں کے لیے حسد اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا، وہ یہ چاہتا تھا کہ عربوں کو خانہ کعبہ کی وجہ سے جو شرف و بزرگی حاصل ہے اسے وہ عربوں کے شہر سے اپنے شہر اور اپنی ذات کی طرف پھیر سکے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور (سینوں کے بھید جاننے والے اللہ) نے یہاں کید کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اللہ کے علم میں تھا کہ ابرہہ کے دل کے نہان خانہ میں کیا حسد کی آگ بھڑک رہی ہے۔

تضلیل باب تفعیل کی مصدر ہے، اس کا معنیٰ ضائع کرنا، باطل کرنا، برباد و تباہ کرنا، کافروں کی پکار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ضلال کا لفظ استعمال فرمایا ہے وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (الرعد:۱۴) اور (بتوں سے) کافروں کے دعا کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بھٹکتی ہی پھرتی رہے۔

عرب کے شاعر امرء القیس کو الملک الضلیل کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے اپنے والد کی سلطنت کو ضائع کر دیا تھا، تو یہاں فی تضلیل کا مطلب یہ ہے کہ ابرہہ نے پہلے تو قلیس (گرجا) تعمیر کر کے خفیہ سازش کی، ان کی کوشش تھی کہ وہ گرجا میں اپنا سلسلہ شروع کریں گے تو حاجیوں کا رخ اس گرجا کی طرف موڑ دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سازش کو اس وقت ناکام بنا دیا تھا جب گرجا میں آگ لگا دی گئی تھی، پھر دوسری باریوں سازش کی کہ بیت اللہ شریف کو گرا دیا جائے مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر ابابیل بھیج دیے یوں دوسری سازش بھی ان کی ناکام بنا دی گئی۔

بعض مفسرین کرام نے ابرہہ کی سازشوں کی ایک فہرست یوں بیان کی ہے ① اس نے محترم مہینوں میں حملہ کیا، اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ، خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

② اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونے کی کوشش کی جب اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مناسک ادا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

③ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منی میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا تھکے ماندے گھروں کو واپس آرہے ہوں گے۔ (تدبر)

بعض اہل تفسیر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کی چالوں کو یوں ناکام بنایا① ان کی فوج کو وادی محسّر ہی میں روک دیا۔ ② محسّر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا اور ان پر سنگ باری کی۔ ③ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے ان دشمنوں پر سنگ باری کرنے والی ہوا (حاصب) بھی بھیجی جس نے ان کو بالکل پامال کر دیا۔ (تفسیر تدبر قرآن)

صاحب فی ظلال القرآن اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یعنی ان کے مکر و تدبیر کو اس طرح بے راہ نہیں کر دیا کہ وہ نشانے پر نہ لگے اور اپنی منزل تک نہ پہنچے، اسی طرح جس طرح ایک انسان راہ گم کر دے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، اس طرح اللہ تعالیٰ قریش کو یاد دلاتا ہے کہ اس نے ان پر انعام و احسان کیا، ان کی حمایت کی اور اس گھر کو بچایا اور اس وقت بچایا جب وہ خود ابرہہ کے لشکر جرار کا سامنا کرنے سے قاصر تھے، شاید کہ وہ شرم کریں اور اس ذات باری کا انکار نہ کریں، جس نے ان کی مدد نہایت کمزوری اور عاجزی کی حالت میں کی تھی۔

ان کا کردار اس وقت بعینہ اسی طرح کا ہے جس طرح ابرہہ کا تھا، وہ مکہ کے مٹھی بھر مسلمان کو اپنے غرور اور قوت کے بل بوتے پر روند ڈالنا چاہتے تھے، ان کو چاہیے کہ ذرا اس زور آور کا حال یاد کرلیں جس نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کی حرمت کو پامال کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اللہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ جس طرح اس نے بیت اللہ کو بچایا، اسی طرح اس کی دعوت کو لے کر چلنے والی حزب اللہ کو بھی بچائے۔ (فی ظلال القرآن)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہاتھی والوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ قریش کو قتل کریں گے اور انہیں گرفتار کریں گے اور بیت اللہ شریف کے بارے میں انہوں نے ارادہ کیا تھا وہ اسے برباد کر دیں گے۔

حضرت عبد المطلب سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ کو بھیجا کہ وہ دیکھے کہ انہوں نے پرندوں سے کیا پایا ہے تو حضرت عبد اللہ کیا دیکھتے ہیں کہ سب لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے ان کی ران سے کپڑا ہٹا ہوا تھا جب انہیں ان کے والد نے دیکھا تو فرمایا إِنَّ ابْنِي هٰذَا أَفْرَسُ الْعَرَبِ وَمَا كَشَفَ عَنْ فَخِذِهٖ إِلَّا بَشِيْرًا أَوْ نَذِيْرًا، میرا یہ بیٹا عربوں میں سے شاہسوار ہے اس نے ران سے کپڑا نہیں ہٹایا مگر بشارت دینے کی وجہ سے یا ڈرانے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔

جب وہ مجلس کے قریب ہوئے کہ وہ اپنی آواز لوگوں کو سنا سکتے لوگوں نے پوچھا: پیچھے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو فرمایا سب لوگ ہلاک ہو گئے۔ حضرت عبد المطلب اور ان کے ساتھی نکلے انہوں نے ابرہہ کے لشکر میں مرنے والے لوگوں کا سامان لے لیا، بنی عبد المطلب کے اموال اسی وجہ سے بنے اور اسی مال کی وجہ سے حضرت عبد المطلب کی سرداری مکمل ہوئی کیونکہ سونے اور چاندی میں سے جو چاہا اٹھا لیا پھر اہل مکہ نکلے اور ان لشکریوں کا سامان لوٹا۔ (تفسیر قرطبی)

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عبد المطلب نے دو گڑھے کھود کر ان کو سونے اور جواہرات سے بھر دیا پھر ابو مسعود ثقفی سے کہا جو حضرت عبد المطلب کا دوست تھا ان دونوں میں سے جو چاہو لے لے پھر لوگوں نے حبشیوں کے اموال کو لیا یہاں تک کہ ان کے ہاں جگہیں کم پڑ گئیں حضرت عبد المطلب نے اس موقع پر کہا۔

أَنْتَ مَنَعْتَ الْحَبَشَ وَالْأَفْيَالَا ... وَقَدْ رَعَوْا بِمَكَّةَ إِلَّا جِبَالَا
وَقَدْ خَشِينَا مِنْهُمُ الْقِتَالَا ... وَكُلُّ أَمْرٍ لَهُمْ مِعْضَالَا
شُكْرًا وَحَمْدًا لَكَ ذَا الْجَلَالَا

اے اللہ! تو نے حبشیوں اور ہاتھیوں کو روکا جبکہ انہوں نے تو مکہ مکرمہ میں پہاڑوں کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا ہم تو ان کے ساتھ جنگ کرنے سے ڈرے اور ان کی جانب سے ہر مشکل امر سے ڈرے۔ اے رب ذوالجلال! تیرا شکر ہے اور تیرے لیے حمد ہے۔

ابن اسحاق نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو مکہ مکرمہ سے واپس کر دیا تو عربوں نے قریش کو بڑی عظمت دی انہوں نے کہا: هُمْ أَهْلُ اللهِ، قَاتَلَ اللهُ عَنْهُمْ وَ كَفَاهُمْ مَوتَةَ عَدُوِّهُمْ، یہ اللہ والے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب سے قتال کیا اور ان کے دشمن کی موت سے انہیں کافی ہو گئے۔

عبداللہ بن عمر ابن مخزوم نے اصحاب فیل کے قصہ میں کہا:

أَنْتَ الْجَلِيلُ رَبَّنَا لَمْ تَدْنِسِ ... أَنْتَ حَبَسْتَ الْفِيلَ بِالْمُغَمَّسِ

مِنْ بَعْدِ مَا هَمَّ بِشَرٍّ مُبْلِسِ ... حَبَسْتَهُ فِي هَيْئَةِ الْمُكَرْكَسِ

وَمَا لَهُمْ مِنْ فَرَجٍ وَمَنْفَسِ

اے ہمارے رب! تو جلیل الشان ہے تو کمزوری سے آلودہ نہیں تو نے مغمس کے مقام پر ہاتھیوں کو روک لیا کہ بعد اس کے کہ اس نے تکلیف دہ شر کا ارادہ کیا تھا تو نے اسے اوندھے منہ روک لیا، ان کے لیے کوئی آسانی اور راحت والی چیز نہ تھی۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ: اور ان پر بھیج دیے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے ہوئے پرندوں کے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں طیراً تحقیر کے لیے نکرہ استعمال فرمایا ہے، یہ پرندے اللہ کی مخلوق، اللہ کی کاریگری اور صنعت کاری میں سب سے حقیر ہیں، جنہیں اس عظیم الشان کام کے لیے مامور کیا گیا، بیت اللہ کی ان سے حفاظت کروائی گئی۔

دوسرا طیراً نکرہ تعظیم کے لیے بھی ہو سکتا ہے، گویا اللہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اللہ نے ابرہہ کے لشکر پر سنگباری اور کھنگر باری کے لیے پرندے بھیجے، کیسے عظیم پرندے کہ چھوٹے چھوٹے سنگریزے اور کھنگر پھینکتے تھے جو قتل گاہ سے ذرا نہیں چوکتے تھے، جہاں وہ نشانہ باندھتے تھے ٹھیک درست طریقہ سے نشانہ پہ سنگریزے لگتے تھے۔

أَبَابِيلَ: ابو عبیدہ اور دوسرے اہل لغت کہتے ہیں کہ ابابیل کا معنیٰ ہے جھنڈ، غول، جماعت کی الگ الگ ٹولیاں، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے کہ گھوڑے ٹولیوں کی شکل میں آئے، کوئی کہیں سے

اور کوئی کہیں سے، اس لفظ کے مفرد بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس کا کوئی واحد نہیں ہے، یہ شماطیط اور عبادید کی طرح ہے، جن کی واحد نہیں آتی۔

دوسرا قول یہ ہے اس کی واحد ہے، ابو جعفر رؤواسی کہتے ہیں کہ اس کی واحد ابالہ ہے، کسائی نحوی کہتے ہیں کہ میں نے نحویوں سے سن رکھا ہے وہ کہتے تھے اَبُوْلٌ وَاَبَابِیل جس طرح عُجُوْلٌ اور عَجَاجِیْل ہے۔

تیسرا قول فراکا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر ابابیل کی جمع کوئی ابالۃ کہے تو یہ ٹھیک ہے، جیسے دینار کی جمع دنانیر آتی ہے۔

جو پرندے اللہ نے ابرہہ کے لشکر پر مسلط کیے اور جن کے پنجوں اور چونچوں سے اللہ نے اسے عبرت ناک سزا دلوائی ان کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کَانَتْ طَیْرًا لَهَا خَرَاطِیْمُ كَخَرَاطِیْمِ الْفِیَلِ وَأَكُفٌّ كَاكُفِّ الْكِلَابِ، ان پرندوں کی چونچیں ہاتھی کی سونڈھ کی طرح تھی، ان کے پنجے کتوں کے پنجوں جیسے تھے۔ (قرطبی، تفسیر کبیر للرازی)

حضرت عطاء ان پرندوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ کالے سیاہ پرندے تھے جو دریا کی جانب سے ٹولیوں کی شکل میں آئے تھے، یہ ہو سکتا ہے کہ ان پرندوں کو ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا ہو جو انہی کی طرح کالے اور سیاہ رنگ کے ہوں، جن کے درون خانہ کفر اور معصیت کی تاریکی اور سیاہی ہو۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی رائے ان سے مختلف تھی وہ فرماتے ہیں کہ یہ سفید رنگ کے پرندے تھے، سفید پرندے بھیجنے کا ہو سکتا ہے سبب یہ ہو کہ کفر کی سیاہی اور تاریکی کو اس کے ساتھ شکست دی جا سکتی تھی، کیونکہ بیاض (سفیدی) سواد (سیاہی) کی ضد ہے، اور امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں صیغہ تمریض کے ساتھ ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ یہ پرندے سبز رنگ کے تھے، ان کے سر درندوں کے سروں جیسے تھے، جب کہ امام رازی رحمہ اللہ کا اپنا مؤقف یہ ہے کہ جب یہ پرندے افواج تھے تو پھر ہو سکتا ہے کہ ہر فوج ان میں سے دوسری فوج سے مختلف شکل میں ہوئی ہو، جن جن

راویوں نے ان پرندوں کی مختلف صفات بیان کی ہیں انہوں نے اپنی معلومات کے مطابق بیان کی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، إِنَّهَا طَيْرٌ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ تُعَشِّشُ وَتُفَرِّخُ، وہ ایسے پرندے تھے جو آسمان اور زمین کے درمیان گھونسلے بناتے اور بچے دیتے تھے۔ (تفسیر قرطبی)

محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: یہ سیاہ سمندری پرندے تھے ان کی چونچوں اور ناخنوں میں پتھر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ نادر و نایاب عنقاء تھے جن کی ضرب الامثال ذکر کی جاتی ہیں۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ابابیل کا معنی مجتمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی پے در پے ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے تھے۔ (قرطبی)

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ: جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔ رمیٰ یرمی کا معنیٰ پھینکنا ہے، حجارہ کا معنیٰ کنکر، پتھر، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سجیل کا معنیٰ سنگ و گل سے کرتے ہیں، یہ فارسی زبان میں معنیٰ ہے، یہ کنکریاں جو پرندوں کی چونچوں اور پنجوں میں تھیں یہ مٹی اور پتھر کی تھیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سفید رنگ کے پرندے تھے، جو سمندر کی طرف سے آئے تھے، ہر پرندہ کے ساتھ تین پتھر ہوتے تھے، وہ پتھر اس کے پنجوں میں تھے اور ایک پتھر اس کی چونچ میں تھا، جس کو بھی وہ کنکر لگتا تھا، اس کے جسم کے آر پار ہو جاتا تھا۔ (جامع البیان)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے کسی جانب وہ کنکر لگتا تو اس کے مقابل جانب سے نکل جاتا، اگر سر پر لگتا تو اس کی مقعد سے نکل جاتا (معالم التنزیل) سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ کنکر چنے سے چھوٹے اور تل سے بڑے تھے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ: سو انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔ اس آیت میں عصف کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے: بھوسا، بھوسی، چھلکا، کھیت کے پتے، وہ بھوسا جس کو ہمارے مویشی استعمال کرتے ہیں، پودے کے پتے جس کے اطراف میں ڈنٹھل ہوں اور اس ڈنٹھل کے اطراف میں پتے ہوں، جیسے خوشے کے اوپر پتے ہوتے ہیں، کھائے ہوئے پھل کا چھلکا، گندم، جو وغیرہ کے دانے سے

جب چھلکا الگ کر لیا جائے تو اس چھلکے کو بھوسا کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے۔ جانور جب بھوسے کو کھالیتا ہے تو وہ جگالی کر کے اس کو مزید پیستا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح جانور کا کھایا ہوا بھوسا بالکل ریزہ ریزہ ہوتا ہے، اس طرح کنکریاں لگنے کے بعد ان کے اجسام بالکل گل کر ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

الحمد للہ آج سورۃ الفیل کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، بندہ نے اس سے پہلے دس سورتوں کی تفسیر بھی تحریر کی ہے، جس کے کئی ایڈیشن زیور طباعت سے آراستہ ہوئے، میرے دل میں پہلے پہل خیال آیا کہ اسی کتاب کو یہاں منتہی کر دوں لیکن چاہت کے باوجود میں ایسا نہیں کر سکا، بس بار بار دل میں اللہ یہی بات ڈالتے رہے کہ جب میں کئی سالوں سے تفسیر قرآن پر کام کر رہا ہوں تو اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے تو میں کیوں سستی اور کاہلی سے کام لوں، بس اللہ کی توفیق سے میں نے سورۃ الفیل کی تفسیر لکھنا شروع کر دی، اس کے مضامین نئے انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اگرچہ دس سورتوں کی تفسیر میں بھی کافی مواد موجود ہے مگر میں نے کوشش کی کہ معارف الفرقان کے اس آخری حصہ میں الگ مواد شامل کروں اور وہاں سے مواد اس کی طرف منتقل نہ کروں، اللہ کی توفیق خاص سے ایک بہترین مواد یہاں پیش کر دیا گیا ہے، اللہ اسے قبول فرمائے اور ہمارے لیے اسے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۱۵ جون ۲۰۲۰ء ۲۳ شوال المکرم ۱۴۴۱ھ بروز پیر بوقت ۴ بجے سہ پہر

حروف بینی: ۲۷ نومبر ۲۰۲۰ء بروز جمعۃ المبارک، سوا گیارہ بجے شب

☆☆☆☆

قریش

قریش کے تجارتی اسفار اور پر امن زندگی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ{۱}اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ {۲}فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ {۳}الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۬ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ {۴}قریش.

جواب ترجمہ: چونکہ قریش کے لوگ عادی ہیں۔ یعنی وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں (یمن اور شام کے) سفر کرنے کے عادی ہیں۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے بھوک کی حالت میں انہیں کھانے کو دیا، اور بدامنی سے انہیں محفوظ رکھا۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موجودہ عثمانی قرآن کی ترتیب میں یہ سورت سورۃ فیل سے علیحدہ ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ کی آیت کا فاصلہ ہے مضمون کے اعتبار سے یہ سورت پہلی سے ہی متعلق ہے جیسے کہ محمد بن اسحاق اور عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ نے تصریح کی ہے اس بناء پر معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے مکہ سے ہاتھیوں کو روکا اور ہاتھی والوں کو ہلاک کیا یہ قریشیوں کو الفت دلانے اور انہیں اجتماع میں ساتھ با امن اس شہر میں رہنے سہنے کے لیے تھا۔

اور یہ مراد بھی کی گئی ہے کہ یہ قریشی جاڑوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی تجارت گاہوں کی طرف دور دراز کے سفر امن وامان سے طے کرسکتے تھے اور بحفاظت اپنے شہر کی طرف واپس لوٹ آتے تھے کیونکہ مکہ جیسے محترم شہر میں رہنے کی وجہ سے ہر جگہ ان کی عزت ہوتی تھی بلکہ ان کے ساتھ بھی جو ہوتا تھا امن وامان سے سفر طے کرلیتا تھا اسی طرح وطن سے ہر طرح کا امن انہیں حاصل ہوتا تھا جیسے کہ اور جگہ قرآن کریم میں موجود ہے کہ

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت ۶۷)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو امن والی جگہ بنادیا ہے اس کے آس پاس تو لوگ اُچک لئے جاتے

ہیں۔ لیکن یہاں کے رہنے والے نڈر ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں لا یلف، میں پہلا لام تعجب کا لام ہے اور دونوں سورتیں بالکل جداگانہ ہیں جیسا کہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ تو گویا یوں فرمایا جارہا ہے کہ تم قریشیوں کے اس اجتماع اور الفت پر تعجب کرو کہ میں نے انہیں کیسی بھاری نعمت عطا فرمارکھی ہے انہیں چاہیے کہ میری اس نعمت کا شکر اس طرح ادا کریں کہ صرف میری ہی عبادت کرتے رہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ام ہانی بنت ابی طالب فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فَضَّلَ اللهُ قُرَيْشًا بِسَبْعِ خِلَالٍ: أَنِّي مِنْهُمْ وَأَنَّ النُّبُوَّةَ فِيهِمْ، وَالْحِجَابَةَ، وَالسِّقَايَةَ فِيهِمْ، وَأَنَّ اللهَ نَصَرَهُمْ عَلَى الْفِيلِ، وَأَنَّهُمْ عَبَدُوا اللهَ، عَزَّ وَجَلَّ، عَشْرَ سِنِينَ لَا يَعْبُدُهُ غَيْرُهُمْ، وَأَنَّ اللهَ أَنْزَلَ فِيهِمْ سُورَةً مِنَ الْقُرْآنِ ثُمَّ تَلَاهَا رَسُولُ اللهِ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (مناقب الشافعی للبیہقی)

اللہ تعالیٰ نے قریش کو سات چیزوں میں فضیلت دی ہے، وہ یہ کہ میں ان میں سے ہوں، نبوت ان میں رکھی ہے، حجابہ اور سقایہ کی خدمت ان کے سپرد کی ہے، اللہ نے ہاتھی والوں پر ان کی مدد کی ہے، انہوں نے دس سال یوں اللہ کی بندگی کی کہ ان دس سالوں میں ان کے علاوہ کسی نے بندگی نہیں کی، اللہ نے ان میں قرآن کریم کی ایک عظیم الشان سورت نازل فرمائی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ القریش کی تلاوت شروع کردی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا،

النَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِي هٰذَا الشَّأْنِ، مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ، وَكَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِكَافِرِهِمْ (بخاری، مسلم، مسند احمد) اس دین میں لوگ قریش کے تابع ہیں، مسلمان مسلمان کے تابع ہیں اور کافر کافر کے تابع ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، النَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِي

الْخَيْرِ وَالشَّرِّ (مسلم، مسند احمد) لوگ خیر اور شر میں قریش کے تابع ہیں۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کے لیے گیا، تو میں نے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَا يَنْقَضِي حَتّٰى يَمْضِيَ فِيهِمِ اثْنَا عَشَرَ خَلِيفَةً، قَالَ: ثُمَّ تَكَلَّمَ بِكَلَامٍ خَفِيَ عَلَيَّ، قَالَ: فَقُلْتُ لِأَبِي: مَا قَالَ؟ قَالَ: كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ، یہ خلافت تمام نہ ہو گی جب تک کہ مسلمانوں میں بارہ خلیفہ نہ ہو لیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ سے کچھ فرمایا، میں نے اپنے والد سے پوچھا: کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ یہ سب خلیفہ قریش میں سے ہوں گے۔ (بخاری، مسلم)

محمد بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ يُرِدْ هَوَانَ قُرَيْشٍ أَهَانَهُ اللّٰهُ (ترمذی، مسند احمد) جس نے قریش کو ذلیل کرنے کا ارادہ کیا، اللہ اس کو ذلیل کر دے گا۔

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ: ہم نے یہ جو کچھ ہاتھی والوں کے ساتھ کیا قریش کے الفت دلانے کے لیے کیا کہ انہیں خانہ کعبہ کے رب کی الفت دلائیں تاکہ وہ اس کا یہ انعام واحسان خیال کرتے ہوئے بیت اللہ کے رب کی بندگی بجالائیں۔

مفسر قرآن امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ سورت معنی میں ماقبل سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے أَهْلَكْتُ أَصْحَابَ الْفِيلِ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ، أَيْ لِتَأْتَلِفَ، أَوْ لِتَتَّفِقَ قُرَيْشٌ، أَوْ لِكَيْ تَأْمَنَ قُرَيْشٌ فَتُؤَلِّفُ رِحْلَتَيْهَا، کہ میں نے اصحاب فیل کو ہلاک کیا تاکہ قریش باہم الفت کرنے لگیں یا باہم متفق ہو جائیں یا قریش امن میں ہو جائیں اور اپنے دونوں سفروں سے مانوس ہو جائیں۔ جنہوں نے دونوں سورتوں کو ایک سورت شمار کیا ہے وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے مصحف میں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا، ہمارا ایک امام تھا جو دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا وہ ان دونوں کو اکٹھا پڑھا کرتا تھا۔

حضرت عمرو بن میمون اَودِی رضی اللہ عنہ نے کہا، ہم نے مغرب کی نماز حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے

پیچھے پڑھی تو انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ التین کی تلاوت کی اور دوسری میں الم ترکیف اور لایلف قریش پڑھی۔

فراء رحمۃ اللہ نے کہا، یہ سورت پہلی سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کے سامنے اپنی اس عظیم نعمت کا ذکر کیا جو اس نے حبشہ کے ساتھ وہ سلوک کر کے کی تھی، پھر فرمایا: ہم نے یہ اصحاب فیل کے ساتھ اس لیے کیا تاکہ قریش پر احسان ہو، اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش اپنی تجارت کے لیے نکلتے، دور جاہلیت میں نہ ان پر کوئی حملہ کیا جاتا اور نہ بری نیت سے ان کے قریب ہوا جاتا، لوگ کہتے، وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے خادم ہیں یہاں تک کہ ہاتھی والا آیا تاکہ کعبہ کو گرائے، اس کے پتھر اٹھالے جائے اور ان کے ساتھ یمن میں گھر بنائے تاکہ لوگ اس کا حج کریں اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمت کو یاد دلایا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ اس لیے کیا تاکہ قریش اس سفر سے مانوس ہوں، اور ان پر حملہ کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔ (قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس کا معنی ہے قریش پر میرا احسان یہ ہے کہ انہیں موسم سرما اور موسم گرما میں سفر سے مانوس کر دیا، کہا، وہ مکہ مکرمہ میں موسم سرما گزارتے اور طائف میں موسم گرما گزارا کرتے تھے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ ماقبل کے ساتھ متصل نہیں کیونکہ دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ ہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ پہلی سورت ختم ہو چکی ہے اور دوسری شروع ہو چکی ہے اور لام فلیعبدوا کے متعلق ہے یعنی ان لوگوں کو اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے کیونکہ انہیں خوراک کے حصول کے لیے موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے مانوس کر دیا۔

خلیل رحمۃ اللہ نے اس طرح کہا کہ یہ متصل نہیں گویا فرمایا، اللہ تعالیٰ نے قریش کو مانوس کیا پس انہیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے۔

قریش عرب کے اس قبیلہ کا نام ہے جو نضر بن کنانہ کی اولاد ہے، اسی قبیلہ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں کیونکہ نضر بن کنانہ کی تیرہویں پشت میں ہیں، آپ کا نسب نامہ یہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن

عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئ بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ، پھر آگے چل کر یہ نسب نامہ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام میں جاملتا ہے۔

یہ قبیلہ قریش مکہ میں رہا کرتا تھا اور خانہ کعبہ کی خدمت اور زمزم کی حفاظت انہیں کے سپرد تھی، اسی لیے تمام قبائل عرب ان کی عزت و حرمت کرتے تھے اور جب یہ لوگ باہر جاتے تو خادم کعبہ سمجھ کر لوگ ان کے ساتھ سلوک کیا کرتے تھے۔

پہلے یہ ملت ابراہیمیہ پر تھے مگر عرصہ سے ان میں بھی بت پرستی آگئی تھی اور جو تاریکی تمام عرب بلکہ اس وقت دنیا پر چھائی ہوئی تھی ان پر بھی چھاگئی اور جب آنحضرت ﷺ کو مبعوث کیا اور آپ نے بت پرستی کی برائی بیان کرنی شروع کی تو یہی لوگ دشمن ہوگئے، ابو جہل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ وغیرہ قریش کے سردار سخت دشمنی کرنے لگے مگر بعد میں ایمان لائے اور قریش میں سے بڑے بڑے نامور صحابہ ہوئے، چاروں خلفاء قریش ہی تھے اور اسلام کے شائع کرنے میں قریش کی عادت سفر بڑی کارگر ہوئی، اس لیے چند روز میں اندلس سے چین تک اسلام پھیل گیا۔ (حقانی)

قریش تصغیر ہے قرش کی جس کے معنیٰ میں متعدد اقوال ہیں ① یہ کہ قرش ایک سمندر کا سخت اور بہادر جانور ہے چونکہ قریش کا قبیلہ بھی بہادر تھا اس لیے ان کو قریش کہنے لگے۔ ② تقرش کے معنیٰ ہیں جمع کرنے کے چونکہ قصی بن کلاب نے اس متفرق قوم کو مکہ میں جمع کیا تھا اس لیے ان کو قریش کہتے تھے اور جمعیت و اتفاق بھی ان میں بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تھا۔ ③ یہ کہ قرش کے معنیٰ کسب کے بھی ہیں چونکہ یہ لوگ تجارت سے کسب کرتے اور کما کر کھاتے تھے لوٹ مار کم کرتے تھے اس لیے ان کو قریش کہنے لگے، اسلام میں اس قبیلہ کی بسبب ان کے مساعی جمیلہ کے اور بسبب قرابت نبی کریم ﷺ کے فضیلت ہے۔ (تفسیر حقانی)

إِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ: یعنی وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں (یمن اور شام کے) سفر کرنے کے عادی ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان پر موسم سرما اور موسم گرما کا سفر شاق نہیں، یہ قریش پر اللہ کی جانب سے احسان ہے۔

علامہ ہروی رحمہ اللہ اور دوسرے علماء نے کہا، اصحاب ایلاف چار تھے، ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل یہ سب بنو عبد مناف تھے، جہاں تک حضرت ہاشم کا تعلق ہے اس نے شام کے بادشاہ سے معاہد کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی شام کی طرف تجارت امن میں ہوتی تھی ان کے بھائی عبد شمس تھے انہوں نے حبشہ والوں سے معاہدہ کیا تھا، مطلب نے یمن والوں سے معاہدہ کیا تھا اور نوفل نے فارس والوں سے معاہدہ کیا تھا۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یؤلف کا معنی پناہ دینا بھی ہے انہیں بھائیوں کو پناہ دینے والے بھی کہتے تھے، قریش کے تاجر ان بھائیوں کے معاہدہ کی وجہ سے مختلف شہروں کی طرف آیا جایا کرتے تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جاتا۔

ازہری رحمہ اللہ نے کہا، ایلاف اجارہ کو خفارہ سے تشبیہ دینا، اجارہ کا معنی مدد کرنا اور حمایت کرنا ہے اور خفارہ کا معنی امان ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: آلف یولف یہ اس وقت کہتے ہیں جب اس نے بوجھ اٹھانے والے اونٹوں کو امان دے کر مدد کی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ قریش حرم کے رہائشی تھے ان کے لیے کوئی کھیتی اور جانور نہ تھے وہ موسم سرما اور موسم گرما میں امن سے تجارت کو جاتے تھے جبکہ ان کے ارد گرد لوگوں سے مال چھین لیا جاتا تھا، جب کوئی آدمی ان کے سامنے رکاوٹ بنتا تو یہ کہتے، ہم اللہ کے حرم والے ہیں تو لوگ ان کا راستہ چھوڑ دیتے۔

ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا رحمہ اللہ کی تفسیر میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس کا معنی ہے کہ موسم سرما اور موسم گرما میں انہیں سفر سے مانوس کر دیا، اس کی صورت یہ بنی کہ قریش میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تو وہ اور اس کے گھر والے ایک معروف جگہ کی طرف جاتے اپنے اوپر ایک خیمہ لگاتے تو وہ مر جاتے یہاں تک کہ عمرو بن عبد مناف کا زمانہ آیا وہ اپنے زمانے کا سردار تھا اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اسد تھا، اس کا بنی مخزوم میں ایک ہم عمر تھا جس سے اسد محبت کرتا اور اسی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اس ساتھی نے اسد سے کہا: نَحْنُ غَدًا نَعْتَفِدُ ہم کل اعتفاد

(بھوکا مرنے اور نہ مانگنے کے ارادے سے خود پر دروازہ بند کر لینا) کریں گے۔

ابن فارس رحمہ اللہ نے کہا: اس روایت میں یہ ایسا لفظ ہے جس کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ یہ دال کے ساتھ ہے یا راء کے ساتھ ہے، اگر یہ راء کے ساتھ ہے تو شاید عفر سے ہو جس کا معنی مٹی میں ڈالنا یا مٹی میں لت پت کرنا ہے اگر وہ دال کے ساتھ ہو تو میں اس کا معنی نہیں جانتا جو میں گمان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس خیمہ کی طرف جائیں گے اور ایک ایک کر کے مر جائیں گے۔

اسد اپنی ماں کے پاس روتے ہوئے گیا اور اس کے ہم عمر ساتھی نے جو کچھ کہا تھا اس کا ذکر کیا تو اسد کی والدہ نے ان لوگوں کی طرف آٹا اور چربی بھیجی جس کی مدد سے انہوں نے چند دن گزارے پھر اس کا ساتھی آیا کہا: ہم کل اعتقاد کریں گے تو اسد اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے گیا اور اپنے ساتھی کی بات بتائی، یہ بات عمرو بن عبد مناف پر شاق گزری، وہ قریش کی مجلس میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، سارے قریش ان کی اطاعت کرتے تھے۔

عمرو نے کہا، تم نے ایک ایسا کام شروع کر رکھا ہے جس کے ذریعے تم کم ہوتے جا رہے ہو اور عرب بڑھتے جا رہے ہیں تم بے یار و مددگار ہو رہے ہو جبکہ عرب غالب ہو رہے ہیں، تم اللہ کے حرم والے اور حضرت آدم کی اولاد میں سے سب سے معزز ہو لوگ تمہارے تابع ہیں ممکن ہے یہ اعتقاد تم پر غالب آجائے۔

انہوں نے کہا، ہم تیری اتباع کریں گے، عمرو نے کہا، اس آدمی سے آغاز کرو یعنی اسد کے ہم عمر کے والد سے، اسے اعتقاد سے غنی کر دو، تو انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر انہوں نے اونٹ ذبح کیا بھیڑ بکریاں ذبح کیں پھر ثرید بنایا اور لوگوں کو کھلایا تو اس کا نام ہاشم پڑ گیا، عرب شاعر نے اسی کا یوں اظہار کیا

عَمْرُو الَّذِی هَشَمَ الثَّرِیدَ لِقَوْمِهِ ... وَرِجَالُ مَکَّةَ مُسْنِتُونَ عِجَافُ

عمرو وہی ہے جس نے اپنی قوم کے لیے ثرید تیار کیا ورنہ مکہ کے لوگوں کی حالت یہ تھی وہ فقر و فاقہ میں زندگی گزارتے تھے۔

پھر اس نے تمام خاندانوں کو دو تجارتی سفروں پر جمع کیا موسم سرما میں یمن کی طرف اور موسم

گرما میں شام کی طرف، غنی نے جو نفع کمایا اسے اپنے اور فقیر کے درمیان تقسیم کیا یہاں تک کہ ان کا فقیر غنی ہو گیا، اسلام آیا تو وہ اس معاشرتی ادب پر تھے، عربوں میں سے کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو مال اور عزت میں قریش سے بڑھ کر ہو شاعر نے اسی کی ترجمانی کی

وَالْخَالِطُوْنَ فَقِيْرَهُمْ بِغَنِيِّهِمْ ... حَتّٰى يَصِيْرَ فَقِيْرُهُمْ كَالْكَافِي

وہ اپنے فقیر کو اپنے غنی کے ساتھ ملانے والے ہیں یہاں تک کہ ان کا فقیر کفایت کرنے والے کی طرح ہو جاتا ہے۔

عرب نبی کریم ﷺ کی آمد تک یونہی رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنا رسول بنا کر بھیج دیا تو ارشاد فرمایا پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ہاشم کے عمل کے واسطے سے بھوک میں کھانا کھلایا اور عربوں کے بڑھنے اور قریش کے کم ہونے کے خوف سے نجات عطا فرمائی۔ (قرطبی)

دو سفروں میں سے ایک سفر موسم سرما میں یمن کی طرف ہوتا کیونکہ یمن کا علاقہ گرم ہے اور دوسرا سفر موسم سرما میں شام کی طرف ہوتا کیونکہ وہ سرد علاقہ تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے، وہ موسم سرما مکہ مکرمہ میں گزارتے تھے کیونکہ یہ علاقہ گرم تھا اور موسم گرما طائف میں گزارتے تھے کیونکہ اس کی آب و ہوا بہت اچھی تھی، یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ ایک قوم کے لیے گرم علاقہ ہو جس کے ذریعہ وہ موسم سرما کی سردی کو دور کر سکے اور ایک سرد علاقہ ہو جس کے ذریعہ وہ موسم گرما کی گرمی دور کر سکے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس نعمت کا ذکر کیا۔ شاعر نے کہا:

تَشْتِيْ بِمَكَّةَ نَعْمَةٌ ... وَمَصِيْفُهَا بِالطَّائِفِ

وہ آسودگی سے مکہ مکرمہ میں موسم سرما گزارتی ہے اور اس کا موسم گرما طائف میں گزرتا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ: پس انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قریش پر جن انعامات واحسانات کی بارش کی اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ عزوجل کی عبادت میں کسی

کو شریک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کے انعامات کی دو قسمیں ہیں ① دفع مضرت یعنی ضرر کو دور کرنا ② جلب منفعت یعنی نفع دینا، اللہ تعالیٰ نے قریش پر دونوں قسم کے انعامات فرمائے اور چونکہ دفع ضرر جلب منفعت سے مقدم ہے، اس لیے سورۃ الفیل میں قریش کے دشمن ابرہہ کے لشکر کو ہلاک کرنے کا ذکر فرمایا اور سورۃ القریش میں ان کو تجارتی سفر کے لئے راغب کرنے کا بیان فرمایا اور ہر نعمت پر اس کا شکر کرنا واجب ہوتا ہے، اس لئے فرمایا، چونکہ ہم نے قریش کو یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس لئے ان پر واجب ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کرنے کے لئے بیت اللہ کے رب کی عبادت کریں۔

اس کی عبادت کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی عجز اور تذلل کا اظہار کریں یا اس بیت اللہ کے رب کی توحید کا اعتراف کریں کیونکہ صرف اسی نے اس گھر کی حفاظت کی ہے، نہ کہ ان بتوں نے جن کی وہ پرستش کرتے ہیں اور اس آیت میں "رب" کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا ہے کہ حضرت عبد المطلب نے ابرہہ سے کہا تھا کہ اس بیت کا ایک رب ہے، جو اس کی حفاظت کرے گا اور کعبہ کی حفاظت کو بتوں کے حوالے نہیں کرے گا، سو اب قریش پر لازم تھا کہ اعتراف اور اقرار کی بناء پر صرف اللہ وحدہ کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش سے فرمایا کہ چونکہ تم نے کعبہ کی حفاظت کے لئے صرف اللہ وحدہ پر اعتماد کیا ہے، لہٰذا تم اس بیت میں صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ (تفسیر کبیر)

الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ: جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور ان کو خوف سے امن میں رکھا۔ قریش مکہ کو بھوک کے بعد اللہ نے کھانا کھلایا، ان کے خوف کے بعد انہیں امن عطا کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ دعائے ابراہیم کی قبولیت تھی، انہوں نے اہل مکہ کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا فرمائی تھی کہ **رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ** (البقرۃ:۱۲۶) اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنادے اور اس کے رہنے والوں کو پھل عطا فرما۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے قریش مکہ کو کھانا کھلانے اور امن دینے کی وجوہات بیان فرمائی ہیں

① اللہ تعالیٰ نے قریش کو حرم میں مامون کر دیا تو ان کو اپنے تجارتی سفر میں کوئی خطرہ نہ رہا، وہ امن اور چین کے ساتھ تجاری سفر کرتے اور شام اور یمن سے غلہ خرید کر لاتے اور اپنی معیشت اور خورد و نوش کا انتظام کرتے۔

② حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تلاش رزق کے لیے موسم سرما اور موسم گرما میں ان پر یمن اور شام کا سفر بڑا شاق گزرا تو اللہ تعالیٰ نے اہل حبشہ کے دلوں میں یہ ڈال دیا کہ وہ کھانا کشتیوں کے ذریعہ مکہ تک پہنچائیں تو انہوں نے اس طرح کھانا ان تک پہنچایا، قریش ان سے خوفزدہ ہوئے کہ وہ ان سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں تو قریش اپنا دفاع کرنے کے لیے ان کی طرف نکلے تو کیا دیکھا کہ وہ ان کے لیے کھانا لائے ہیں اور ان کی خوراک کے ذریعے ان کی مدد کی، اہل مکہ جدہ سے اونٹوں اور گدھوں کو لے جاتے اور کھانا خرید لیتے یہ دو راتوں کی مسافت پر تھا۔

③ کلبی رحمہ اللہ نے کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کو جھٹلایا تو آپ ﷺ نے ان کے خلاف یہ بد دعا فرمائی تھی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا عَلَیْھِمْ سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ اے اللہ! ان کے اوپر قحط کے ایسے سات سال مسلط کر دے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال قحط آیا تھا۔

یہ آپ ﷺ کی اس دعا کا ہی نتیجہ تھا کہ پھر ان پر ایسا قحط آیا، جس نے ہر چیز کو ختم کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے جانوروں کی کھالیں، مردے اور مردار کھالیے، اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے نبی کریم ﷺ پر ظاہر فرمایا ہے کہ اگر جانوروں کو بھی کوئی شخص کھلائے اور پلائے تو جانور اسی کی اطاعت کرتے ہیں، گویا مشرکین مکہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک میں کھلایا اور یہ پھر بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت نہیں کرتے۔

④ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قریش جہالت کی بھوک میں مبتلا تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی نازل فرمائی، جس سے ان کی جہالت دور ہو گئی گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے قریش مکہ! تم (سیدنا) محمد

ﷺ کی بعثت سے پہلے جاہل لوگ تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی پر وحی نازل فرمائی، جنہوں نے تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دی تھی کہ اب تم کو اہل علم کہا جاتا ہے پھر کھانا کھلانا جسم کی غذا ہے جو کھانا کھلانے والے کے شکر کو واجب کرتا ہے تو جو طعام روح کی غذا ہے، اس طعام کا شکر ادا کرنا کیوں کر شکر کا سبب نہیں ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ کو خوف سے امن میں رکھا، اس کی وجوہات کیا ہیں؟

① قریش، مکہ سے مختلف شہروں کا سفر کرتے تھے اور ان کو اپنے سفر میں کسی ڈاکے یا لوٹ مار کا خطرہ نہیں تھا، ان کو اپنے سفر میں کسی خطرے کا سامنا نہیں ہوتا تھا جب کہ دوسرے لوگ جو دور دراز کے شہروں کا سفر کرتے تھے ان کو بہت خطرات پیش آتے تھے، اس معنیٰ میں یہ آیت نازل ہوئی أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا (الْعَنْكَبُوتِ: ٦٧) کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو پر امن بنا دیا ہے حالانکہ ان کے ارد گرد سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔ (کبیر، تبیان القرآن)

② اللہ تعالیٰ نے اَصحاب الفیل کو ہلاک کر کے ان کے شہر کو اور ان کے سفر کو مامون بنا دیا۔ (کبیر)

③ حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جذام کی بیماری سے محفوظ کر دیا تھا، اسی وجہ سے مکہ مکرمہ کے باشندوں پر کبھی جذام نہیں آیا۔ (الکبیر)

④ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات پر مامون کر دیا کہ خلافت ان کے علاوہ کسی کو نہیں ملے گی۔

⑤ اسلام کی وجہ سے انہیں امن دیا گیا، جب کہ وہ کفر کی حالت میں فکر مند تھے، وہ جانتے تھے کہ جس دین پر وہ ہیں وہ کچھ بھی نہیں ہے، مگر وہ اس دین کو نہیں جانتے تھے جس کو تھامنا ایک عاقل کے لیے ضروری تھا۔

⑥ اللہ نے انہیں جہالت کی بھوک سے وحی کے طعام کے ساتھ کھانا کھلایا اور انہیں ضلالت کے خوف سے بیان ہدایت کے ساتھ امن دیا، گویا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرمانا چاہتے ہیں کہ اے مکہ والو! تم نبی محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے جہالِ عرب اور اجڈ لوگ تھے اور جو تم سے برسرپیکار تھے انہیں اہل کتاب کہا جاتا تھا، پھر میں نے تمہارے نبی ﷺ پر وحی نازل کی، تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی، یہاں تک

کہ تم اس حالت میں ہوگئے کہ آج تمہیں اہل علم اوراہل قرآن کہاجاتا ہے اور ان لوگوں کا نام یہود ونصاریٰ کے جہلاء پڑگیا ہے،جب جسم کی غذابننے والے کھانا کھانے پر شکر واجب ہے توروح کی غذابننے والے کھانے پر شکر کیونکر واجب نہیں ہے؟(الکبیر)

حودہلالثانی حودہلل، آج سورۃ قریش کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی،اللہ اسے قبول ومنظور فرماکر ہمارے لیے سرمایہ نجات بنادے، آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی،

۳۰جون ۲۰۲۰ء۸ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ بروز منگل، ساڑھے بارہ بجے شب۔

حروف بینی:۲۸نومبر ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ بوقت ۱۰بجے علی الصبح

الماعون

منکرین روز جزا اور منافقین کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ {۱} فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ {۲} وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ {۳} فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ {۴} الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ {۵} الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ {۶} وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ {۷} الماعون.

جواب ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے، وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پھر بڑی خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کی۔ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو دکھاوا کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اس بدبخت اور بدنصیب انسان کا ذکر کیا ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے اور روز جزا کا انکار کرتا ہے، جو مسکینوں کو دھکے دیتا ہے، وہ اپنے طور پر مسکینوں کو کھلاتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ مسکینوں کو کھانا کھلائیں اور ان کی ضروریات پوری کریں، اسی طرح اس سورت میں ان کم نصیب نمازیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، انہیں پتا ہی نہیں کہ وہ نمازوں میں کیا کرتے اور کیا پڑھتے ہیں، وہ درست طور پر نمازیں ادا نہیں کرتے، نماز وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے مگر وہ اپنی نماز بروقت ادا نہیں کرتے، ریاکاروں کی حرماں نصیبی ہے کہ وہ نیکی اور خیر کے کام لوگوں کو دکھلانے کے لیے کرتے ہیں، ان کی کنجوسی اور بخیلی کا یہ عالم ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی استعمال کی اشیاء عاریۃً بھی کسی کو نہیں دیتے، وہ برتنے اور استعمال کے برتن پیالی، گلاس، ہانڈی اور پلیٹ تک کسی کو استعمال کے لیے نہیں دیتے، نہ وہ اپنے پروردگار کی بندگی درست طور بجالاتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی مخلوق جسے الخلق عیال اللہ کہا گیا کہ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اس کے ساتھ ان کا ہمدردانہ اور مخلصانہ تعلق ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے ؟یوم جزا، حساب کتاب کے دن کو جھٹلانے والے شخص کے بارے میں پوچھا جارہا ہے کہ کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا ہے؟ یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اگرچہ یہاں صورتاً عبارت استفہامیہ دکھائی دے رہی ہے مگر مراد تعجب میں مبالغہ ہے، جیسے عرب کے محاورے میں بہت ہی تعجب کے موقع پر کہا جاتا ہے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ فلاں نے کیا کرتوت کیا؟اس نے اپنے کو اس کام میں کیوں گھسایا؟

یہاں مخاطب کا صیغہ استعمال فرمایا گیا، ایک قول اس بارے میں یہ ہے کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ سے کیا جارہا ہے، ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ خطاب ہر عاقل انسان کے لیے ہے، گویا کہ یوں کہا جارہا ہے، اے دانا! اے عاقل! اے سمجھدار! کیا تو اس شخص کو جانتا ہے جو دلائل وبراہین کی موجودگی میں روز جزا اور حساب کتاب کو جھٹلاتا ہے؟ کیا وہ ایسا کسی مقصد اور غرض کے لیے کرتا ہے؟ تو کسی دانا، عاقل اور سمجھدار انسان کے لیے کیونکر مناسب ہے کہ وہ ابدی اور دائمی سزا کو بلاوجہ اپنی طرف کھینچے؟ یا دنیوی مال ومتاع، سازوسامان اور اغراض کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لے؟ کسی عاقل کے لیے یہ کیونکر مناسب ہوسکتا ہے کہ وہ باقی رہنے والی بہت سی چیزوں کو ختم ہوجانے والی تھوڑی سی چیزوں کے بدلے میں فروخت کرڈالے؟

اس آیت کے بارے میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ کسی معین شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسی قول کی بناء پر کئی لوگوں کے الگ الگ نام لیے گئے ہیں کہ یہ آیت ان کے بارے میں اتری ہے۔ (الکبیر للرازی)

ابن جریج کہتے ہیں کہ یہ آیت ابوسفیان (ان کے اسلام لانے سے پہلے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ ہر ہفتے دو اونٹ نحر (ذبح) کیا کرتے تھے، ان کے پاس ایک یتیم گوشت مانگنے کے لیے آیا تو انہوں نے اسے اپنی لاٹھی سے ہانکا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عاص بن وائل سہمی کے بارے میں اتری ہے، اس کی عادات میں سے یہ بات تھی کہ یہ قیام کے دن کو جھٹلاتا تھا اور بری حرکتیں بھی کرتا تھا۔ (تفسیر کبیر

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب کہ علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ ایک یتیم کا وَصِی تھا جو عریاں حالت میں اس کے پاس اپنا مال مانگنے کے لیے آیا، اس نے اسے دھکیل دیا، بچہ مایوس ہو گیا، پھر اسے قریش کے بڑوں نے کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کرو وہ تمہاری سفارش کر دیں گے، مگر ان قریش نے بھی بچہ سے بطور استہزا ایسا کہا، مگر اس یتیم کو اس کی حقیقت کا علم نہ ہوا، وہ بچہ ان بڑے قریشیوں کی بات سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے التماس کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ ایسی تھی کہ وہ کسی محتاج وضرورت مند کو یونہی خالی نہیں لوٹاتے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس یتیم بچے کے ساتھ ابو جہل کی طرف تشریف لے گئے، اس نے آپ کو مرحبا کہا اور یتیم کو مال دے دیا، اس پر اسے قریش نے شرم دلائی، اور اسے کہا کہ تو تو بے دین ہو گیا ہے، اس نے کہا اللہ کی قسم میں بے دین نہیں ہوا، لیکن میں ان کے دائیں اور بائیں نیزہ بازوں کو دیکھ رہا تھا مجھے ڈر لگا کہ اگر میں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا تو وہ نیزے میرے اندر پیوست کر دیں گے۔ (الکبیر للرازی)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس منافق کے بارے میں نازل ہوئی جس میں بخل اور دکھلاوے والی دونوں بیماریاں تھیں، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت ہر اس شخص کے بارے میں عام ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ اس لیے کہ انسان نیکی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے باز اس لیے آتا ہے کہ اسے ثواب کی امید ہوتی ہے اور سزا سے ڈر لگتا ہے، جب وہ روز محشر کا منکر ہو گا تو کسی چیز کو نہیں چھوڑے گا، وہ شہوات میں گھسے گا، گناہ بے لذت میں پڑتا رہے گا، اس سے پتا چلا کہ روز محشر کا انکار ہی کفر اور تمام نافرمانیوں کی جڑ ہے۔

یہاں دِین کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ شخص نفس دین اور اسلام کو جھٹلاتا ہے، اس لیے کہ وہ پیدا کرنے والے، بنانے والے، وجود دینے والے خالق کا انکار کرتا ہے، یا وہ نبوت کا منکر ہے، یا وہ آخرت کا منکر ہے یا شرعی احکامات میں سے کسی حکم کا انکار کرتا ہے۔

اہل اسلام کی اصطلاح میں مطلق دین جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد اسلام ہی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں دین کے لیے لفظ اسلام استعمال فرمایا إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آلِ عِمْرَانَ: ۱۹) بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ باقی جتنے بھی مذاہب ہیں ان پر دین کا لفظ نہیں بولا جاتا، سوائے کسی قید کے جیسے دین نصاریٰ اور دین یہود کا لفظ بولا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان مقالات باطلہ کا نام دین نہیں ہے اس لیے کہ دین تو نام ہے اللہ کے لیے عاجزی، انکساری، خشوع و خضوع اور فروتنی اختیار کرنے کا، جب کہ اسلام کے علاوہ یہ مذاہب تو شہوات اور شبہات کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جمہور مفسرین کرام یہاں دِین سے مراد یہ لیتے ہیں کہ یہ شخص حساب کا انکار کرتا ہے، جزا کو جھٹلاتا ہے، دین سے یہ مراد لینے کو اولیٰ اور بہتر خیال کرتے ہیں، کیونکہ منکر اسلام کبھی کبھی اچھے کام بھی کرلیتا ہے، برے کاموں سے اجتناب کرتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ قیامت کا قائل ہو، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا اقرار کرے، مگر قیامت کا منکر، بعث بعد الموت کا منکر، حساب کتاب کا منکر ہر قبیح کام کرے گا، برائی کا ارتکاب کرے گا، شنیع کاموں میں پڑے گا کیونکہ اس نے روز جزا کا انکار کر دیا ہے اس لیے اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے۔

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ {} وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ: وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ فذالک میں فاسببیت کے معنیٰ دیتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جھٹلانے والے کافر کی طرف سے یتیم کو جو دھکے دیے جاتے ہیں اس کا سبب اس کا کفر ہے، اگر یہ کافر اور جھٹلانے والا نہ ہوتا تو یتیم کا خیال رکھتا، اسے دھکے نہ دیتا، اسے رسوا نہ کرتا، اس کی دل آزاری نہ کرتا۔

جو کافر روز جزا کو، روز محشر کو، حساب کتاب کو، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو جھٹلاتا ہے اس کی اور بھی بے شمار بری باتیں ہوں گی مگر یہاں اللہ نے اس کی ان دو خصلتوں کو ہی ذکر کیا ہے کیونکہ روز جزا کو جھٹلانے والے سے یہی کچھ ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ صرف علی سبیل التمثیل ہے، گویا کہ اللہ

تعالیٰ نے ان دو قسموں میں سے ایک ہی مثال خبر دار کرنے کے لیے ذکر کی ہے باقی قبائح اور بری عادات و خصلتوں کا ذکر نہیں کیا۔ یا یہ دو خصلتیں اس لیے ذکر کی ہیں کہ جس طرح یہ دونوں قبیح اور ناپسندیدہ ہیں شریعت کی رو سے، اسی طرح قبیح اور ناپسندیدہ ہیں مروت اور انسانیت کے لحاظ سے بھی۔

یوم جزا اور حساب کتاب کو جھٹلانے والا یتیم کو دھکے دیتا ہے، اس کے ساتھ سختی کرتا ہے، ترش اور دُرشت لب ولہجہ سے بات کرتا ہے، یہ ظالم یتیم کو اس کا حق نہیں دیتا، وہ اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے یہ اسے اس کے حق سے محروم کرتا ہے، اس پر مظالم ڈھاتا ہے، یتیم کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری نہیں کرتا، یہ ظالم یتیم کو جھڑکتا ہے، اسے مارتا ہے، اس کی تحقیر کرتا ہے، یہاں دال پر شد ہے جس کا معنیٰ دھکے دیتا ہے جب کہ ایک قرأت میں دال پر صرف زبر ہے، اس کا معنیٰ ہے یتیم کو چھوڑ دیتا ہے، اسے کسی دعوت طعام پر بلاتا نہیں ہے، تمام لوگوں کو شادی بیاہ پر دعوت دے گا، خاص پروگراموں پر بلائے گا، کھاتے پیتے صاحب ثروت لوگ اس کے دستر خوان پر چوکڑی مارے دکھائی دیں گے مگر یتیم کو سرے سے دعوت ہی نہیں دے گا۔

حالانکہ یتیموں کے والی اور غلاموں کے مولا آقا مدنی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مَا مِنْ مَائِدَةٍ أَعْظَمُ مِنْ مَائِدَةٍ عَلَيْهَا يَتِيمٌ (الکبیر للرازی) اس دستر خوان سے کوئی دستر خوان عظمت والا نہیں جس پر کوئی یتیم بیٹھا ہوا ہو۔

ایک قرأت میں يَدُعُو الْيَتِيمَ ہے کہ وہ یتیم کو بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے یعنی اسے دکھلاوے اور ریاکاری کے طور پر بلاتا ہے بلا تو لیتا ہے مگر اسے کھانا پھر بھی نہیں کھلاتا، اسے بلاتا تو ہے مگر خدمت گزاری کے لیے، اس پر اپنی بڑائی جتانے کے لیے فخر وغرور کی خاطر اسے بلاتا ہے، کوئی نیکی اور اللہ کی رضا مقصود نہیں ہوتی۔

یہاں يَدُعُّ جو فرمایا، اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جس نے یتیموں کو دھکے دینا اور انہیں محروم رکھنا اپنی عادت بنالی ہو، ہاں اگر کسی نے یتیم کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا اور بعد میں اسے شرمندگی اور ندامت ہوئی تو وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہے، جیسے اللہ نے

سورۃ النجم میں ان اہل ایمان کی تعریف کی جو بڑے گناہوں اور فحاشی سے بچتے اور اجتناب کرتے ہیں، ان کے گناہ کو صرف لَمَمٌ کہا گیا، کیونکہ مؤمن لوگ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے، گناہوں کی مستقل عادت اختیار نہیں کرتے اگر کہیں گناہ سرزد ہو جائے تو انہیں سخت شرمندگی اور ندامت ہوتی ہے، تو ندامت و شرمندگی کے بعد جب وہ توبہ تائب ہوتے ہیں تو ان کے گناہ اڑ جاتے ہیں، باقی نہیں رہتے، یہی فرق ہے کہ اہل ایمان سے گناہ کا صدور ہو جائے تو انہیں ندامت ہوتی ہے، جب کہ یوم جزا اور دین کو جھٹلانے والا شخص گناہوں پر اصرار کرتا ہے، وہ عادی مجرموں والا کردار ادا کرتا ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ: اس میں دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے کو تیار نہیں کرتا کہ مسکین کو کھانا کھلائے، طعام کی نسبت مسکین کی طرف یہ بتاتی ہے کہ اس کھانے پر مسکین کا حق ہے، پتا چلا کہ وہ مسکین کو اس کھانے سے روکتا ہے جو اس کا حق ہے، جسے وہ روک نہیں سکتا، یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ روز جزا کو جھٹلانے والا یہ شخص بخل و قساوت قلبی کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے اس کی طبیعت کی کمینگی کو یہ آیت بہت اچھی طرح واضح کر رہی ہے، دوسرا وہ اپنے علاوہ لوگوں کو بھی ترغیب نہیں دیتا کہ وہ مسکین کو کھانا کھلائیں، اس کی وجہ اور سبب یہ ہے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانا کار ثواب ہی نہیں سمجھتا۔

پتا چلا کہ انکار قیامت، تکذیب قیامت کس قدر بڑا جرم ہے جس کی بناء پر انسان کمزوروں کو ایذا دیتا ہے، نیکی کے سامنے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس کے برعکس اگر وہ روز جزا پر ایمان رکھتا، اللہ کی وعیدوں پر یقین رکھتا تو اس سے ایسے قبیح اور برے کام کبھی صادر نہ ہوتے، گویا کہ تمام جرائم اور گناہوں کی اصل وجہ انکار اور تکذیب قیامت ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے حالات میں آدمی کسی کو ترغیب نہیں دیتا تو وہ گناہ گار نہیں ہوتا، یہاں ترغیب نہ دینے والے کے لیے سخت وعید سنائی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے حالات میں یہ کام اس کی جگہ کوئی اور بھی کر سکتا ہے، یا اس لیے کہ اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترغیب کو کوئی قبول نہیں کرے گا یا وہ ترغیب نہیں دیتا کسی اور متوقع خرابی کی وجہ سے، اور یہاں ترغیب نہ دینا اس لیے تھا کہ وہ شخص بدلے کے دن کو جھٹلاتا تھا۔ (تفسیر کبیر للرازی)

یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ یتیم کو کھانا کھلاتا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے جب وہ یتیم کو اس کا اپنا حق نہیں دیتا تو وہ اپنے ذاتی مال سے اسے کھانا کیسے کھلا سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کے مال میں بھی بخل سے کام لیتا ہے، یہ اس کی کمینگی کی انتہاء ہے، تو اپنے مال میں تو بدرجہ اولیٰ وہ بخیل ہے، جب کہ اس کے برعکس اہل ایمان کی تعریف وستائش کی گئی ہے کہ وہ تو مہربان ہوتے ہیں، وہ تو لوگوں کے خیر خواہ اور ہمدرد ہوتے ہیں، وہ تو خود حق پر گامزن رہتے ہوئے دوسروں کو بھی حق بات کی تلقین کرتے ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ {} الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ: پھر بڑی خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کی۔ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ نمازی ہے اگر وہ نماز پڑھے تو وہ ثواب کی امید نہ رکھے اگر اسے چھوڑ دے تو اس پر سزا کا خوف نہ ہو۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں **الَّذِينَ يُؤَخِّرُونَهَا عَنْ أَوْقَاتِهَا** جو نمازوں کو ان کے اوقات سے مؤخر کرتے ہیں۔ (قرطبی)

مغیرہ نے ابراہیم سے یہ قول نقل کیا ہے، وہ وقت ضائع کرنے کے ساتھ لاپرواہی کرتے ہیں، ابو العالیہ سے مروی ہے **لَا يُصَلُّونَهَا لِمَوَاقِيتِهَا، وَلَا يُتِمُّونَ رُكُوعَهَا وَلَا سُجُودَهَا** وہ نمازوں کو ان کے اوقات میں نہیں پڑھتے اور ان کے رکوع وسجود کو مکمل نہیں کرتے۔ (تفسیر قرطبی)

ابراہیم رحمہ اللہ سے مروی ہے، اس سے مراد وہ ہے جو سجدہ کرتا ہے تو اپنے سر کو اس طرح کھڑا کرلیتا ہے کہ ادھر ادھر متوجہ ہوجاتا ہے، قُطرب نے کہا، وہ نہ قرأت کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ساھون کی جگہ لاھون کا لفظ ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا، **الَّذِينَ يُؤَخِّرُونَ الصَّلَاةَ عَنْ وَقْتِهَا، تَهَاوُنًا بِهَا،** سستی کرتے ہوئے جو نماز میں اس کے وقت سے تاخیر کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے **هُمُ الْمُنَافِقُونَ يَتْرُكُونَ الصَّلَاةَ سِرًّا، يُصَلُّونَهَا عَلَانِيَةً وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَى،** اس سے مراد منافقین ہیں جو چھپ کر نماز پڑھنا

چھوڑ دیتے ہیں اور علانیہ اس کو پڑھتے ہیں، جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں الذین ھم یراؤن، اس چیز پر دال ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وَلَوْ قَالَ فِي صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ لَكَانَتْ فِي الْمُؤْمِنِينَ اگر اللہ تعالیٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ کی بجائے فِي صَلَاتِهِمْ فرماتے تو یہ آیت منافقین کے لیے نہ ہوتی بلکہ اہل ایمان کے لیے ہوتی۔

حضرت عطا رحمہ اللہ نے کلمات تحمید ادا کرتے ہوئے کہا کہ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي قَالَ عَنْ صَلَاتِهِمْ وَلَمْ يَقُلْ فِي صَلَاتِهِمْ، تمام کامل تعریفیں اللہ کے لیے ہیں وہ ذات جس نے یہاں سورۃ الماعون میں عن صلاتھم فرمایا ہے فی صلاتھم نہیں فرمایا۔

علامہ زمخشری نے کہا: اگر تو پوچھے عَنْ صَلَاتِهِمْ اور فِي صَلَاتِهِمْ میں کیا فرق ہے؟ تو میں کہوں گا: عَنْ کا معنی ہے وہ نماز سے غفلت کرتے ہیں وہ اسے ترک کرتے ہیں اس کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں، یہ منافقوں کا اور مسلمانوں میں شاطر فاسقوں کا طرز عمل ہے اور فی کا معنی ہے کہ سہو نماز میں انہیں لاحق ہو جاتا ہے خواہ شیطان کی جانب سے وسوسہ ہو یا ذہن کسی طرف متوجہ ہو جائے یہ ایسی صورت ہے کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز میں سہو واقع ہوا کسی اور کی کیا حیثیت ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے اپنی کتابوں میں سجدہ سہو کے ابواب شامل کیے ہیں۔ (قرطبی)

ابن عربی نے کہا، سہو سے سلامت رہنا محال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اپنی نماز میں بھولے، وہ آدمی جو اپنی نماز میں نہیں بھولتا تو وہ ایسا آدمی ہے جو اس میں تدبر نہیں کرتا، اس کی قرأت کو نہیں سمجھتا اس کا مقصود صرف اس کی تعداد میں ہوا کرتا ہے یہ ایسا آدمی ہے جو چھلکا تو کھا لیتا ہے اور مغز پھینک دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس لیے بھولتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے بڑی ذات میں غور و فکر کر رہے ہوتے تھے یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ نماز میں اس لیے بھولتے ہوں کہ آپ

شیطان کے وساوس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں جب شیطان نمازی کو یہ کہے فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو جن کو وہ پہلے یاد نہیں کرتا یہاں تک کہ آدمی بھٹک جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی۔ (تفسیر قرطبی)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَيْلٌ کا لفظ شدید قسم کے جرم پر استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ناپ تول میں کمی بیشی کرنے والوں کے لیے سورۃ المطففین کے شروع میں وَيْلٌ کا لفظ استعمال فرمایا، اسی طرح سورۃ البقرہ میں یہود کا اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ کر یہ کہنا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اس پر ویلٌ کا لفظ استعمال کیا گیا، اسی طرح پس پشت غیبت کرنے والے اور چغل خوری کرنے والوں کے لیے سورۃ الھمزہ کے شروع میں ویلٌ کا لفظ استعمال فرمایا۔ (الکبیر للرازی)

یہ بھی مروی ہے کہ دوزخ میں ہر کوئی اپنے اپنے جرائم کے لحاظ سے روئے گا، کوئی کہنے والا کہے گا میری بربادی میں حب جاہ کا مریض تھا، کوئی کہے گا میری بربادی میرے اندر زمانہ جاہلیت کی حمیت پائی جاتی تھی، نماز میں کوتاہی کا ارتکاب کرنے والا کہے گا کہ اے میری بربادی، میری نماز، اسی لیے یہ آیت مبارکہ سنتے وقت مستحب یہی ہے کہ انسان کہے بربادی میرے لیے اگر میری بخشش نہ کی گئی۔

آیت میں تین امور پر سخت وعید و تہدید سنائی گئی ہے، ایک نماز فراموشی، دوسرا دکھلاوا، تیسرا چھوٹی چھوٹی استعمال کی اشیاء دوسروں سے روکنا، یہ ساری باتیں گناہوں کے باب سے ہیں۔

اگرچہ ان امور کی بناء پر انسان منافق نہیں کہلاتا مگر اللہ نے پھر بھی ان افعال کا ارتکاب کرنے والے کے لیے وعید شدید فرمائی ہے، اس میں حضرات مفسرین کرام نے کئی وجوہات بیان فرمائی ہیں، ایک فرمان تو یہ ہے کہ یہاں نمازیوں کے لیے بربادی کا ذکر فرمایا اس سے مراد منافقین میں سے وہ لوگ جو نماز پڑھتے ہیں، جو ان افعال کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے بربادی، تباہی اور ویل ہے۔

اس تقدیر پر تو یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کافر کی سزا مزید سخت ہو گی کیونکہ شریعت میں جن چیزوں پر پابندی لگائی گئی تھی وہ اس پابندی کو توڑتا تھا، وہ شرعی واجبات کو چھوڑتا تھا، یہ بات

امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ کفار بھی شریعت کی فروعات کے مخاطب ہیں، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی جواب قابل اعتماد ہے۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَآؤُنَ: جو دکھاوا کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ ہم اطاعت وبندگی کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ وہ تقیہ والی نماز پڑھتے ہیں، جس طرح فساق وفجار لوگ پڑھتے ہیں، یہ لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ وہ نماز عبادت سمجھ کر پڑھ رہے ہیں جب کہ وہ نماز اس لیے پڑھ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں یہ کہا جائے کہ اس نے نماز پڑھی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ریا کی صورتیں یوں بیان کی ہیں

طَلَبُ مَا فِي الدُّنْيَا بِالْعِبَادَةِ، وَأَصْلُهُ طَلَبُ الْمَنْزِلَةِ فِي قُلُوبِ النَّاسِ، وَأَوَّلُهَا تَحْسِينُ السَّمْتِ وَهُوَ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ، وَيُرِيدُ بِذٰلِكَ الْجَاهَ وَالثَّنَاءَ، الرِّيَاءُ بِالثِّيَابِ الْقِصَارِ وَالْخَشِنَةِ، لِيَأْخُذَ بِذٰلِكَ هيئة الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا. الرِّيَاءُ بِالْقَوْلِ، بِإِظْهَارِ التَّسَخُّطِ عَلَى أَهْلِ الدُّنْيَا، وَإِظْهَارِ الْوَعْظِ وَالتَّأَسُّفِ عَلَى مَا يَفُوتُ مِنَ الْخَيْرِ وَالطَّاعَةِ. الرِّيَاءُ بِإِظْهَارِ الصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ، أَوْ بِتَحْسِينِ الصَّلَاةِ لِأَجْلِ رُؤْيَةِ النَّاسِ، وَذٰلِكَ يَطُولُ

ریا کی حقیقت یہ ہے دنیا میں جو کچھ ہے اسے عبادت کے ذریعے طلب کرنا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں مقام ومرتبہ کی طلب کرنا۔ اس کا ابتدائی مرحلہ اچھی شہرت ہے اس کے ذریعہ جاہ وثنا چاہتا ہے۔ چھوٹے اور کھردرے کپڑوں کے ذریعہ ریا تاکہ اس کے ذریعے وہ دنیا میں زہد حاصل کرے۔ زبان سے ریا کہ دنیاداروں پر ناراضگی کا اظہار کرے اور جو وہ خیر وطاعت کو چھوڑتا ہے اس پر تاسف کا اظہار کرے اور وعظ کرے۔ نماز اور صدقہ کو ظاہر کرنا یا اچھے انداز میں نماز پڑھنا تاکہ لوگ دیکھیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمل صالح اگر فرض ہو تو اس کے اظہار سے انسان ریاکار نہیں کہلاتا، فرائض کے حق میں یہی ہے کہ ان کا اعلان اور تشہیر کی جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بھی

ہے جس میں آپ ﷺ نے ترغیب دی کہ فرائض کو پوشیدہ نہ رکھو، انہیں چھپاؤ نہیں کیونکہ یہ اسلام کی علامتیں ہیں، دین کے شعائر ہیں، اس لیے کہ ان کو چھوڑنے والا مذمت اور ناراضگی کا مستحق ہے، اس لیے تہمت کو اسی صورت میں ہٹایا جاسکتا ہے کہ ان کا اظہار کیا جائے، اگر عبادت نفلی ہے تو اس میں پوشیدہ اور مخفی رکھنا ہی بہتر ہے، کیونکہ نفلی عبادت کو چھوڑنے میں ملامت نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس میں تہمت لگائی جاسکتی ہے، اگر اس نیت کے ساتھ نفلی عبادت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، اسے دیکھ کر لوگ بھی ایسا کریں تو یہ اچھی بات ہے۔

ریاکاری یہ ہے کہ کوئی کام اس ارادے سے ظاہر کرے کہ بہت سی آنکھیں اسے دیکھیں، پھر وہ اس کے نیکوکار ہونے کی تعریف کریں، ایک آدمی کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے مسجد میں سجدہ شکر بہت لمبا کر دیا تو دیکھنے والے نے اسے کہا کہ تیرے لیے کیا ہی بہتر ہوتا کہ تو یہ سجدہ اپنے گھر میں ہی کر لیتا۔

امام رازی رحمہ اللہ منافق اور ریاکار کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

أَنَّ الْمُنَافِقَ هُوَ الْمُظْهِرُ لِلْإِيمَانِ الْمُبْطِنُ لِلْكُفْرِ، وَالْمُرَائِي الْمُظْهِرُ مَا لَيْسَ فِي قَلْبِهِ مِنْ زِيَادَةِ خُشُوعٍ لِيَعْتَقِدَ فِيهِ مَنْ يَرَاهُ أَنَّهُ مُتَدَيِّنٌ، أَوْ تَقُولُ: الْمُنَافِقُ لَا يُصَلِّي سِرًّا وَالْمُرَائِي تَكُونُ صَلَاتُهُ عِنْدَ النَّاسِ أَحْسَنَ

منافق ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے، مرائی (ریاکار) اس چیز کو ظاہر کرتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہوتی، وہ خشوع زیادہ کرتا ہے تاکہ اسے دیکھنے والا اس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ دیندار ہے، یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ منافق پوشیدہ طور پر نماز نہیں پڑھتا اور ریاکار لوگوں کے سامنے بڑی عمدہ نماز پڑھتا ہے۔ (کبیر)

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ: اور دوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں، امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں چند اقوال نقل فرمائے ہیں

① حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کے اموال کی زکوٰۃ

ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے، اس سے مراد منافق ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، ابو بکر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہا: منافق جب نماز پڑھتا ہے تو ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھتا ہے اگر نماز اس سے فوت ہو جاتی ہے تو اس پر کسی شرمندگی کا اظہار نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے وہ اسے روک لیتا ہے، زید بن اسلم نے کہا: اگر نماز بھی ان کے لیے مخفی ہوتی جس طرح زکوٰۃ ان کے لیے مخفی ہے تو وہ اسے نہ پڑھتے۔

② سعید بن مسیب اور ابن شہاب کہتے ہیں کہ ماعون سے مراد مال ہے، یہ قریش کی لغت ہے۔

③ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ یہ ایسا اسم ہے جو گھر کے تمام منافع کو جامع ہے جس طرح کلہاڑا، ہنڈیا، آگ اور اس جیسی چیزیں۔

④ زجاج، ابو عبید اور مبرد نے کہا: دور جاہلیت میں ماعون اسے کہتے جس میں کوئی منفعت ہوتی جیسے کلہاڑا، ہنڈیا، ڈول، پیالہ خواہ اس میں تھوڑی منفعت ہوتی یا زیادہ منفعت ہوتی، انہوں نے اس بارے میں اعشیٰ کے اشعار پڑھے۔ علماء نے کہا: اسلام میں ماعون سے مراد طاعت اور زکوٰۃ ہے اور ایک چرواہے کے اشعار پڑھے

أَخَلِيفَةُ الرَّحْمٰنِ إِنَّا مَعْشَرٌ ... حُنَفَاءُ نَسْجُدُ بُكْرَةً وَأَصِيلَا

عَرَبٌ نَرَى لِلّٰهِ مِنْ أَمْوَالِنَا ... حَقَّ الزَّكَاةِ مُنَزَّلًا تَنْزِيلَا

قَوْمٌ عَلَى الْإِسْلَامِ لَمَّا يَمْنَعُوا ... مَا عَوَّنُهُمْ وَيُضَيِّعُوا التَّهْلِيلَا

اے رحمن کے خلیفہ! ہم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے باطل کو چھوڑ کر حق کو اپنا لیا ہے، ہم صبح و شام سجدہ کرتے ہیں، ہم عرب ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اموال میں زکوٰۃ کا حق لازمی سمجھتے ہیں، ہم مسلمان ہیں، جب وہ زکوٰۃ و طاعات سے رکتے ہیں اور لا الہ اللہ کو ضائع کرتے ہیں۔ ان اشعار میں ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے۔

⑤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ماعون سے مراد ادھار چیز ہے۔

⑥ محمد بن کعب اور کلبی فرماتے ہیں کہ ہر نیکی مراد ہے جو لوگ باہم ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

⑦ اس سے مراد پانی اور گھاس ہے۔

⑧ فرا کہتے ہیں کہ ماعون سے مراد پانی ہے، میں نے ایک بدو کو کہتے ہوئے سنا وہ ماعون سے مراد پانی لے رہا تھا۔ اس بارے میں نے یہ مصرع سنایا، یَمَجُّ صَبِیرُہُ الْمَاعُونَ صَبًّا، اس کا بادل موسلا دھار پانی برسا رہا تھا۔

⑨ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ ماعون سے مراد حق ہے کہ اس نے حق کو روکا۔

⑩ طبری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ماعون اموال کے منافع میں سے تھوڑی سی چیز کو کہا جاتا ہے یہ معن سے ماخوذ ہے جس کا معنی قلیل ہے۔

قطرب نے کہا: ماعون کا اصل معنی قلت ہے معن سے مراد تھوڑی چیز ہے عرب کہتے ہیں: مَالَہُ سَعنَۃٌ وَّلَا مَعنَۃٌ، أَی شَیءٌ قَلِیلٌ نہ اس کے پاس زیادہ نہ کم۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ، صدقہ اور اس جیسی چیزوں کو ماعون قرار دیا کیونکہ یہ کثیر میں سے تھوڑی چیز ہوتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے، اس کا معنی ہے جس کا روکنا حلال نہیں ہوتا جس طرح پانی، نمک اور آگ، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ کون سی چیز ہے جس کا روکنا حلال نہیں؟ فرمایا: پانی، آگ اور نمک۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ تو پانی ہوا، یہ آگ اور نمک کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا،

یَا عَائِشَۃُ مَنْ أَعْطَی نَارًا فَکَأَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیعِ مَا طُبِخَ بِتِلْکَ النَّارِ، وَمَنْ أَعْطَی مِلْحًا فَکَأَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیعِ مَا طَیَّبَ بِہِ ذٰلِکَ الْمِلْحُ، وَمَنْ سَقَی شُرْبَۃً مِنَ الْمَاءِ حَیْثُ یُوجَدُ الْمَاءُ، فَکَأَنَّمَا أَعْتَقَ سِتِّینَ نَسَمَۃً. وَمَنْ سَقَی شُرْبَۃً مِنَ الْمَاءِ حَیْثُ لَا یُوجَدُ، فَکَأَنَّمَا أَحْیَا نَفْسًا، وَمَنْ أَحْیَاھَا فَکَأَنَّمَا أَحْیَا النَّاسَ جَمِیعًا (ابن ماجہ، تفسیر ثعلبی)

اے عائشہ! جس نے آگ دی گویا اس نے وہ تمام کھانا صدقہ کیا جو اس آگ کے ساتھ پکایا گیا، جس نے نمک دیا گویا اس نے وہ تمام کھانا صدقہ کیا جس کے ساتھ اس کھانے کو لذیذ بنایا گیا، جہاں پانی پایا

جاتا ہے وہاں اس نے ایک دفعہ پانی پلایا گویا اس نے ساٹھ غلام آزاد کیے اور جس نے وہاں پانی پلایا جہاں پانی نہیں ملتا تو گویا اس نے ایک نفس کو زندہ کیا اور جس نے ایک نفس کو زندگی دی (اس کو مرنے سے بچایا) تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔

ماوردی رحمہ اللہ نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد ایسی معرفت ہے جس کا کرنا آسان ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ذی شان بنا دیا، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، عکرمہ جو حضرت ابن عباس کے غلام تھے سے کہا گیا: جس نے اپنے سامان میں سے کوئی چیز دینے سے انکار کیا اس کے لیے ہلاکت ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں بلکہ جس نے تین چیزوں کو جمع کیا اس کے لیے ہلاکت ہے، نماز کو ترک کرنا، ریاکاری کرنا اور ضرورت کی چیزوں میں بخل کرنا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک منافقین کے بارے میں اس آیت کا ہونا زیادہ مناسب اور موزوں ہے کیونکہ انہوں نے تینوں اوصاف کو جمع کیا، نماز ترک کرنا، ریاکاری کرنا اور مال میں بخل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (النساء ۱۴۲) جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کے لیے دکھلاوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے مگر تھوڑا سا ذکر کرتے ہیں۔ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَٰرِهُونَ۔ (توبہ) وہ مال خرچ نہیں کرتے مگر ناپسند کرتے ہوئے۔

حو دمل لثلاثین حو دمل آج سورۃ الماعون کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے اور اسے ہمارے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

۳۰ جون ۲۰۲۰ء ۸ ذیقعد ۱۴۴۱ھ، بروز منگل پونے بارہ بجے شب

حروف بینی: ۲۸ نومبر ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ ساڑھے گیارہ بجے علی الصبح

☆☆☆☆

الکوثر

کوثر، نماز، قربانی اور دشمنِ رسول

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾ الکوثر

جواب ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی۔ اس لیے آپ اپنے پروردگار (کی خوشنودی) کے لیے نماز پڑھیں، اور قربانی کریں۔ یقین جانیے! آپ کا دشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے۔

سورۃ الکوثر اپنے حجم کے اعتبار سے قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت ہے، اس کی صرف تین ہی آیات ہیں، مگر معارف و خزائن کے بحر ذخار اس میں موجزن ہیں، علامہ رازی کہتے ہیں کہ اس میں اختصار کے باوجود بہت سے لطائف ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ سورت پہلے والی سورت کے مقابلہ میں ہے وہ اس لیے کہ پہلی سورت (الماعون) میں اللہ تعالیٰ نے منافق کے چار اوصاف بیان کیے ہیں، پہلا بخل ہے جس کا نتیجہ یہ کہ وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، دوسرا ترک نماز جیسے اللہ نے فرمایا کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں، تیسرا نماز میں دکھلاوا کرنا، جس کا اللہ نے ذکر فرمایا کہ وہ نماز میں دکھلاوا کرتے ہیں، چوتھا وہ زکوٰۃ سے روکتا ہے اللہ نے اس کا ذکر یوں فرمایا کہ وہ ماعون سے روکتا ہے۔

سورت الکوثر میں منافق کے ان چار اوصاف کے مقابلے میں چار صفات بیان کیں، بخل کے مقابلے میں اللہ نے نبی کریم ﷺ کو کوثر (خیر کثیر) عطا کرنے کا ذکر فرمایا، کہ آپ بہت زیادہ دیں اور بخل سے کام نہ لیں، نماز میں غفلت کے مقابلے میں فرمایا کہ آپ نماز قائم کیجیے، یعنی نماز میں ہمیشگی اختیار فرمائیے، ریاکاری کے مقابلے میں فرمایا کہ آپ اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے نماز پڑھیے، دکھلاوا کے لیے نماز نہ پڑھیے، یمنعون الماعون کے مقابلے میں فرمایا کہ آپ قربانی کیجیے، اس سے مقصود قربانی کے گوشت کو صدقہ کرنا ہے، تو یہاں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سورۃ الکوثر کی سورۃ

الماعون کے ساتھ کس قدر عجیب مناسبت ہے۔

سورۃ الکوثر کے خاتمہ پر فرمایا کہ آپ کا دشمن ہی دم بریدہ ہو گا، مقطوع النسل ہو گا، وہ منافق خائب وخاسر اور نامراد ہو گا جو اس طرح کے قبیح، شنیع اور برے افعال کا ارتکاب کرتا ہے، جو سورۃ الماعون میں بیان کیے گئے ہیں، ایسے امور انجام دینے والا جب عنقریب موت کے منہ میں جائے گا تو دنیا میں اس کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا، کوئی خیر اور بھلائی اس کی دنیا میں باقی نہیں رہے گی، مگر اللہ کے لاڈلے اور حبیب نبی کریم ﷺ کا ذکر جمیل دنیا میں جاری رہے گا، آپ ﷺ کے نام کا شہرہ ہو گا، آپ ﷺ کا نام چہار دانگ عالم میں گونجے گا، دنیا میں ذکر جمیل اور آخرت میں اجر جزیل نبی کریم ﷺ کو عطا کیا جائے گا۔

سورۃ الکوثر کے لطائف میں سے ایک یہ ہے کہ راہ سلوک پر چلنے والوں کے تین درجات ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور اونچا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے قلوب اور اپنی ارواح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نورِ جلال میں ڈوبے ہوئے ہیں، دوسرے وہ جو نیکیوں اور بدنی عبادات کے ساتھ مشغول ہیں، تیسرے وہ جو نفس کو محسوس ہونے والی لذتوں اور شہوات عاجلہ میں گھسنے سے روکتے ہیں۔

سورۃ الکوثر میں عطائے کوثر سے پہلے مقام کی طرف اشارہ کر دیا اور وہ آپ ﷺ کی روح مبارک ومقدس کا باقی تمام انسانی ارواح سے کم وکیف میں ممتاز ہونا ہے، کم کے تو بہت سے مقدمات ہیں، رہی کیف تو وہ نتائج کے لحاظ سے باقی تمام ارواح سے زیادہ جلدی نتائج کی طرف منتقل ہوتی ہے، فصل لربک میں دوسرے مقام اور درجہ کی طرف اشارہ ہے، اور وانحر (قربانی کیجیے) میں تیسرے مرتبہ اور مقام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ نفس کو لذات عاجلہ سے روکے رکھنا یہ قربانی اور ذبح کے قائم مقام ہے، پھر فرمایا کہ آپ ﷺ کا دشمن ہی نامراد، دم بریدہ، مقطوع النسل اور خائب وخاسر رہے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نفس آپ کو ان محسوسات اور شہوات عاجلہ کی طرف بلاتا ہے ان کا دائرہ فانی ہے، جب کہ آپ ﷺ کے پروردگار کے ہاں باقی رہنے والی نیکیاں اور بھلائیاں ہی بہتر ہیں، یہی سعادات روحانیہ اور معارف ربانیہ ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔

إِنَّآ أَعۡطَيۡنَاكَ الۡكَوۡثَرَ: بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت پہلے والی سورتوں کا تتمہ ہے اور بعد والی سورتوں کا دیباچہ اور پیش خیمہ ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الضحیٰ کے آغاز میں اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کی شان و منقبت بیان فرمائی ہے، آپ ﷺ کے تفصیلی احوال بیان فرمائے ہیں، سورت الضحیٰ کے شروع میں آپ ﷺ کی نبوت سے متعلق تین چیزیں بیان فرمائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا، دوسری یہ کہ آپ کے لیے آخرت دنیا سے بہتر ہے، یا بعد میں آنے والی چیز آپ کی پہلے والی چیز سے بہتر ہے، تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اتنا کچھ دے گا کہ آپ ﷺ خوش ہو جائیں گے۔

سورۃ الضحیٰ کے خاتمہ پر آپ ﷺ کے تین وہ احوال بیان فرمائے ہیں جن کا تعلق دنیا سے ہے، آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانہ مہیا کیا، آپ کو تلاش حق میں سرگرداں پایا تو راہ سجھائی، آپ کو عائل (کم مال والا) پایا تو مالدار کر دیا۔

سورۃ الم نشرح میں نبی کریم ﷺ کو تین چیزوں کے ساتھ مشرف فرمایا، ان میں پہلی یہ ہے کہ ہم نے آپ کا سینہ کھول دیا، دوسری یہ کہ ہم نے آپ کے بوجھ کو ہٹا دیا جس نے آپ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، تیسری یہ کہ ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

سورۃ التین میں تین چیزوں کے ساتھ آپ ﷺ کو مشرف فرمایا، ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کے شہر مکہ بلد الامین کی قسم کھائی، دوسری یہ کہ آپ ﷺ کی امت کو جہنم سے خلاصی دینے کی خبر دی، جہاں اہل ایمان کا استثناء کیا، تیسری آپ ﷺ کی امت کو ثواب پہنچنے کا ذکر کیا کہ وہ نہ ختم ہونے والا ہے۔

سورۃ اقرأ میں تین قسم کی بزرگیوں کا آپ ﷺ کو شرف بخشا، ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا آپ اپنے پروردگار کے نام مبارک کی برکت سے قرآن کریم کی تلاوت کیجیے، قرآن کریم پڑھیے، دوسری یہ کہ اللہ نے آپ ﷺ کے دشمن کو یہ کہہ کر مغلوب کر دیا کہ تو بھی اپنا لاء و لشکر بلا لے ہم زبانیہ فرشتوں کو مقابلے میں اتار دیں گے، تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا

خاص قرب عطا فرمایا، جس میں آپ کو حکم دیا گیا کہ سجدہ ریز ہو جایئے اور قرب پایئے۔

سورۃ القدر میں شب قدر کے ساتھ مشرف فرمایا جس میں فضیلت کی تین اقسام پائی جاتی ہیں، ان میں ایک شب قدر کا ہزار راتوں سے بہتر ہونا ہے، دوسرا اس شب میں فرشتوں اور جبریل امین کا آسمان سے زمین پر اترنا ہے، تیسرا طلوع فجر تک اس رات میں سلامتی کا اترنا ہے۔

سورۃ لم یکن میں آپ ﷺ کی امت کو تین قسم کی بزرگیوں کے ساتھ مشرف فرمایا، ان میں پہلی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت کو مخلوق میں خیر البریہ قرار دیا گیا، دوسرا آپ ﷺ کی امت کی جزا اور بدلہ ان کے رب کے پاس باغات کی شکل میں ہو گا، تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔

سورۃ زلزلت میں تین بزرگیوں کا ذکر ہے، پہلی یہ کہ بروز محشر زمین اپنی خبریں بیان کرے گی، یہ تقاضا ہو گا کہ اس دن زمین آپ ﷺ کی امت کی اطاعت وعبودیت اور بندگی کی گواہی دے، دوسرا لوگ ٹولیوں کی شکل میں آکر اپنے اعمال دیکھیں گے، یہ اس بات پر دلالت ہے کہ آپ ﷺ کی امت پر ان کی نیکیاں پیش کی جائیں گی جس سے انہیں فرحت وسرور ملے گا، تیسرا جو ایک چیونٹی جتنا نیک کام کرے گا وہ اسے وہاں دیکھ لے گا، اس میں کوئی شک وریب نہیں کہ اللہ کی معرفت یقیناً ہر عظیم میں سب سے بڑی ہو گی، یہ خیر الاعمال والے لوگ اس ثواب تک پہنچ جائیں گے۔

سورۃ العادیات میں آپ کو یہ شرف بخشا کہ اللہ نے آپ ﷺ کی امت کے مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم کھائی، ان گھوڑوں کے تین اوصاف بیان فرمائے، وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا (قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپ ہانپ کر دوڑتے ہیں)

فَالْمُورِيَاتِ قَدْحاً (پھر جو (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں اڑاتے ہیں)

فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحاً (پھر صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں)

سورۃ القارعہ میں آپ ﷺ کی امت کو تین چیزوں سے مشرف فرمایا، ان میں پہلی یہ ہے اس کا اعمالنامہ وزن دار ہو گا، دوسرا وہ خوشحال زندگی میں ہوں گے، تیسرا وہ اپنے دشمنوں کو دوزخ کی دھکتی آگ میں دیکھیں گے۔

سورۃ الھاکم میں یہ شرف اوراعزاز بخشا کہ آپ ﷺ کے دین سے منہ موڑنے والے، آپ ﷺ کی شریعت سے روگردانی کرنے والے تین طرح سے عذاب دیے جائیں گے، پہلا یہ کہ وہ دوزخ کو دیکھیں گے، دوسرا یہ کہ وہ عین الیقین سے اسے دیکھیں گے، تیسرا یہ کہ وہ نعمتوں کے بارے میں سوال کریں گے۔

سورۃ العصر میں آپ ﷺ کی امت کو تین چیزوں سے اعزاز بخشا، ان میں ایک الاالذین آمنوا ہے، دوسرا و عملوالصالحات ہے اور تیسرا مخلوق کو اعمال صالحہ کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ہے۔

سورۃ الھمزہ میں آپ ﷺ کو یہ شرف اوراعزاز بخشا کہ جو آپ ﷺ کی پس پشت غیبت کرے گا اورآپ ﷺ پر طنز کرے گا اس کے لیے عذاب کی تین قسمیں ہوں گی، پہلا یہ کہ وہ یقینی طور پر اپنی دنیا سے نفع نہیں اٹھاسکے گا، فرمان ہے کہ کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ رہے گا، دوسرا اسے جہنم میں پھینکا جائے گا، تیسرا اس پر دوزخ کے دروازے اس طرح بند کر دیے جائیں گے کہ اس کی باہر نکلنے کی امیدیں بھی دم توڑ جائیں گی۔

سورۃ الفیل میں آپ ﷺ کو یہ شرف اوراعزاز بخشا کہ آپ ﷺ کے دشمنوں کے مکروفریب کے تانے بانے تین وجوہ سے توڑڈالے، پہلا یہ کہ ان کی مکروہ تدبیروں کو توڑڈالا، دوسرا یہ کہ ان پر جھنڈ کے جھنڈ ابابیل پرندے بھیجے، تیسرا یہ کہ انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا کر رکھ دیا۔

سورۃ قریش میں یہ اعزاز بخشا کہ ان کے اسلاف کی مصلحتوں کا تین طرح سے خیال فرمایا، پہلا یہ کہ انہیں الفت کرنے والے بنایا، دوسرا یہ کہ انہیں بھوک میں کھانا کھلایا، تیسرا یہ کہ انہیں خوف سے محفوظ رکھا۔

سورۃ الماعون میں آپ کو یہ شرف بخشا کہ آپ ﷺ کے دین کو جھٹلانے والوں کی تین قسم کی مذموم صفات کو بیان کیا گیا، ایک ان کی کمینگی اور خست کہ وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اوردوسروں کو انہیں کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، دوسری ان کا خالق کی تعظیم کو ترک کرنا، کہ وہ نماز سے غافل

اور دکھلاوا کرتے ہیں، تیسری یہ کہ انہوں نے مخلوق کو نفع پہنچانے میں رکاوٹ ڈالی ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سورت میں آپ ﷺ کو عظیم الشان وجوہات کی بناء پر شرف اور اعزاز بخشا ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو کوثر عطا کی ہے، یعنی گزشتہ سورتوں میں جو اعزازات اور تمغے آپ ﷺ کے سینے پر سجائے گئے، ان میں سے ایک ایک اعزاز اور تمغہ دنیا کی ہفت اقلیم سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے آپ اپنے پروردگار کی بندگی اور عبودیت میں مشغول رہیے اور اللہ کے بندوں کی راہنمائی کرتے رہیے کہ ان کے لیے جو سب سے بہتر ہے وہ اس کی طرف متوجہ رہیں۔

رہی رب کی بندگی اور عبودیت یا تو وہ نفس سے ہوگی یا مال سے ہوگی، اگر نفس سے رب کی بندگی بجالانی ہے تو نماز پڑھتے رہیے اور مال سے رب کی بندگی کا فرض ادا کرنا ہے تو پھر راہ مولا میں قربانی دیتے رہیے۔ بندگانِ خدا کی رشد وہدایت اور ان کے لیے دین ودنیا میں سب سے بہترین چیز کی راہنمائی کرنا ہے تو پھر کفار سے کہہ دیجیے کہ ہم ان اصنام وبتوں کی پوجا پاٹ نہیں کریں گے جن کے سامنے تم جبین نیاز خم کرتے اور حاجات پوری کروانے کی کوشش کرتے ہو، پتا چلا کہ سورۃ الکوثر پہلے والی سورتوں کا تتمہ ہے اور بعد والی سورتوں کا دیباچہ اور پیش خیمہ ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں جس طرح سورۃ الکوثر کا ماقبل والی سورتوں کے ساتھ حسین ربط بتایا ہے اسی طرح انہوں نے سورۃ الکوثر کا اس کے بعد آنے والی سورتوں کے ساتھ حیرت انگیز ربط بیان فرمایا ہے، جس کی ایک ایک سطر آب زر سے رقم کی جانے کے لائق ہے۔

سورۃ الکوثر کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اِنَّا ذکر فرمایا ہے، اِنَّا جمع ہے اِنَّا سے کبھی کبھار جمع مراد لی جاتی ہے اور کبھی کبھار اس سے تعظیم مراد ہوتی ہے، یہاں اِنَّا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے، تو جب ہمارا معبود، ہمارا الٰہ ایک ہے تو جمع کو اس پر محمول نہیں کرسکتے، اس کو اس ذات واحد پر محمول کرنا ممکن ہی نہیں ہے، ہاں اگر اس سے مراد یہ ہو کہ اس عظیم الشان عطیہ کے ملنے میں ملائکہ، جبریل، میکائیل اور سابقہ انبیاء کی مساعی شامل ہیں تو پھر اس کا معنیٰ اپنی جگہ پر درست بیٹھتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ ﷺ کی بعثت کے لیے یوں دعا مانگی تھی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ (البقرۃ:۱۲۹) اے ہمارے پروردگار! ان میں انہی میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیج دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْنِي مِنْ أُمَّةِ أَحْمَدَ، اے میرے پروردگار! مجھے امت احمد میں کر دیجیے۔

بنی اسرائیل کے آخری تاجدار نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی بشارت سنائی تھی، جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصّٰفّٰ:۶) اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ: اے بنو اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا ایسا پیغمبر بن کر آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور اس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

اور اِنَّا کو اگر تعظیم پر محمول کریں تو پھر اس میں اس بات پر خبردار کرنا مقصود ہے کہ جو عطیہ رحمت کائنات ﷺ کو دیا گیا وہ عظیم ہے، کیونکہ عطیہ کرنے والی ذات زمین و آسمان کی زبردست ہستی ہے، جس کی طرف سے کوثر عطا کی گئی ہے، جس کو عطیہ کیا گیا ان کے لیے کاف ضمیر خطاب سے اشارہ کیا گیا ہے، اسی ھبہ اور عطیہ کو کوثر کہا گیا ہے، لفظ کوثر مبالغہ فی الکثرت کا فائدہ دیتا ہے، یہ لفظ عطیہ کرنے والے، جو کچھ عطیہ کیا گیا اور جسے عطیہ کیا گیا اس کی عظمت کا پتا دیتا ہے، تو یہ عطیہ کس قدر عظمت والا ہے، عطیہ کرنے والا کس عظیم شان کا مالک ہے اور جسے یہ عطا کیا گیا اس کی عظمت شان کا کیا کہنا۔

تحائف اور ہدایا اگرچہ مقدار میں تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں لیکن جب تحائف دینے والا اور ہدایا پیش کرنے والا عظیم ہو تو وہ تحائف اور ہدایا بھی نسبت کے سبب عظیم الشان ہی ہوا کرتے ہیں، جس طرح ایک بادشاہ جب اپنے غلاموں کی طرف علی سبیل الاکرام سیب پھینکے تو اسے بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس ہدیہ کی فی نفسہ کوئی لذت ہے بلکہ اس لیے اس میں لذت

دوبالا ہو جاتی ہے کہ دینے والا، ہدیہ کرنے والا، عطیہ عطا کرنے والا عظیم ہے، تو عطا کرنے والا جب عظمت والا ہوا تو اس کی عطا کی ہوئی چیز بھی عظمت والی ہو گی، اسی طرح یہاں کوثر کا عطا کیا جانا ہے اگرچہ کوثر فی نفسہ انتہائی کثرت میں ہو لیکن جب خلائق کے بادشاہ کی طرف سے دی گئی تو اس کی عظمت اور کمال کو مزید چار چاند لگ جاتے ہیں۔

اللہ نے یہاں فرمایا کہ ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی، اسے ایسے قرینے کے ساتھ جوڑ دیا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عطیہ آپ سے واپس نہیں لیا جائے گا، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ میں تو کسی اجنبی کے لیے موھوب چیز واپس لینا جائز ہے، لیکن جب اس نے اس چیز کا تھوڑا سا بھی معاوضہ لے لیا تو اب واپس نہیں لے سکتا، جیسے ایک شخص نے کسی انسان کو ایک ہزار دینار کے مساوی چیز ہبہ کر دی اور اس سے ایک فلس کے معاوضے کا مطالبہ کر دیا تو اب رجوع کا حق ختم ہو گیا، لیکن یہاں فرمایا کہ ہم نے آپ کو کوثر عطا کی، تو اللہ نے آپ سے نماز اور قربانی کا مطالبہ کر دیا، اس لیے واپسی کا اور رجوع کا حق ختم ہو گیا۔

اللہ نے یہاں اَعْطَيْنَاكَ فرمایا ہے، سَنُعْطِيكَ نہیں فرمایا، اَعْطَيْنَاكَ کا معنیٰ ہم نے آپ کو پہلے ہی عطا کر دیا، سَنُعْطِيكَ کا معنیٰ ہے ہم آپ کو آئندہ عطا کریں گے، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سے فوائد ہیں، وہ اس طرح کہ

① جسے ماضی میں بڑی نعمت مل چکی ہو وہ اس سے بہت افضل اور اعلیٰ ہے جسے مستقبل میں وہ نعمت حاصل ہو گی، اسی لیے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کب ملی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ (سنن ترمذی) مجھے اس وقت نبوت ملی جب حضرت آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔

② گویا اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت و نیک بختی کے اسباب مہیا کر دیے تھے، تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بعد

آپ ﷺ کو کیونکر فراموش کر سکتے تھے۔

③ اللہ جل شانہ نے پہلے آپ ﷺ کو کوثر عطا کرنے کا ذکر فرمایا، اس کے بعد آپ ﷺ کو نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا، اس سے پتا چلا کہ آپ ﷺ کو کوثر عطا کرنا محض اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ پر فضل واحسان ہے، آپ ﷺ کی عبادت اور ریاضت معاوضہ نہیں ہے۔

④ یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے کوثر آپ ﷺ کو عطا کی، یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے کوثر کسی نبی یا کسی رسول کو دی، اگر ایسے فرماتے تو یوں سمجھا جاتا کہ جو نبی ورسول ہو گا اسے کوثر ملے گی، پتا چلا کہ کوثر کا ملنا نبوت اور رسالت کی وجہ سے نہیں ہے، یہ کوثر صرف اور صرف رحمت کائنات مفخر موجودات کی وجہ سے عطا کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فرمایا اور آتَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ نہیں فرمایا، حالانکہ اعطاء اور ایتاء دونوں کا معنیٰ دینا اور نوازنا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں اعطینا ک فرمایا ہے، اعطاء کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے فضل واحسان سے دینا، اعطاء کا معنیٰ ہے کسی چیز کا کسی کو مالک بنا دینا، جب کہ آتینا ک سے یہ معنیٰ نہیں سمجھا جاتا، امام رازی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایتاء سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوثر عطا کرنا کوئی واجب تھا، جب کہ اعطاء کا مطلب یہ ہے کہ یہ خیرات کثیرہ، اسلام، قرآن، نبوت، ذکر جمیل دنیا اور آخرت میں یہ ہماری طرف سے محض فضل واحسان ہے، ان میں سے کوئی چیز علی سبیل الاستحقاق اور علی سبیل الوجوب نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر)

امام رازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دو وجوہ سے بشارت ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کریم علی سبیل التفضل پروان چڑھانے اور تربیت کرنا شروع کرتا ہے تو یہ بات ظاہر سی ہے کہ وہ اسے ختم نہیں کرتا، بلکہ روزانہ اس میں اضافہ کرتا ہے، دوسری یہ کہ جو چیز استحقاق کا سبب ہو گی وہ بقدر استحقاق ہی دی جائے گی، جب کہ بندے کا فعل متناہی ہے تو اس کے استحقاق کے سبب سے حاصل ہونے والی چیز بھی متناہی ہو گی، لیکن جب فضل واحسان اللہ کے کرم وفضل کا نتیجہ ہے تو اللہ کا کرم

متناہی نہیں ہے، جب کرم خداوندی متناہی نہیں ہے تو اس کا فضل بھی متناہی نہیں ہے، جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اعطیناک میں اللہ کی طرف سے یہ عطیہ احسان و فضل ہے استحقاق نہیں تھا تو یہ بات پتا چل گئی کہ یہ عطیہ ہمیشہ رہے گا، ہمیشہ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ (تفسیر الکبیر)

امام رازی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اگر اس پر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سبع المثانی عطا کرنے والی آیت میں آتیناک فرمایا تو اس کا کیا جواب ہو گا؟ تو خود ہی اس کا دو وجوہ سے جواب بھی دیا کہ اللہ نے یہاں اعطاء ذکر فرمایا ہے، اعطاء مالک بنانے کو واجب کرتا ہے، اور ملک اختصاص کا سبب ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام نے عرض کی هَبْ لِي مُلْكًا (ص: ۳۵) مجھے ملک عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ (ص: ۳۹) یہ ہماری عطاء ہے آپ کسی پر احسان کریں یا روکے رکھیں۔

اسی سبب سے جن لوگوں نے کوثر کو حوض پر محمول کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ امت آپ ﷺ کی مہمان ہو گی، جب کہ ایتاء میں ملکیت کے معنیٰ کا فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔

امام رازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اعطاء اس مقام پر ایتاء سے زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ اعطاء قلیل و کثیر میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَأَعْطَى قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ (النَّجْمِ: ۳۴) جب کہ ایتاء کا استعمال بہت بڑی چیز میں کیا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ (البقرۃ: ۲۵۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے فرمایا لَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا (سبا: ۱۰)

جب یہ بات ثابت ہو گئی تو پھر یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اللہ نے اعطیناک الکوثر فرمایا جس سے کئی وجوہ کی بناء پر حضرت نبی کریم ﷺ کے احوال کی تعظیم و تکریم کا فائدہ ملتا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جن بلند درجات اور اونچے مراتب کا ذخیرہ کر رکھا ہے اس کے مقابلے میں حوض کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ آپ کے بلند درجات اور مراتب کے مقابلے میں شے قلیل و حقیر ہے، تو یہ بات ایک ان عظیم اشیاء کی بشارت کو متضمن ہے جو اس حوض سے بھی عظمت والی ہیں۔

دوسری یہ کہ کوثر میں پانی کی طرف اشارہ ملتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ دنیا میں پانی کا مرتبہ کھانے سے کم ہے، جب پانی کی نعمتیں کوثر کا درجہ رکھتی ہیں تو پھر باقی نعمتوں کا کیا کہنا۔

گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ اعطیناک ہم نے آپ کو کوثر جیسا عطیہ کیا، جو آپ کی شان اور مرتبہ کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن جب ہدیہ کرنے والا عظیم ہوتا ہے تو اس کی نسبت سے اس کا ہدیہ بھی عظمت لیے ہوئے ہوتا ہے۔

کوثر کیا ہے؟ لغت میں فوعلٌ کے وزن پر کثرت کے معنیٰ میں ہے، بہت زیادہ، ایک دیہاتی عورت سے اس وقت پوچھا گیا جب اس کا بیٹا سفر سے واپس لوٹا کہ بِمَ آبَ اِبنُكَ ؟ تیرا بیٹا کیا چیز لے کر واپس آیا؟ تو اس دیہاتی عورت نے جواب دیا آبَ بِكَوثَرَ کہ وہ بہت کچھ لے کر واپس آیا ہے۔

الکوثر بڑی تعداد کو کہا جاتا ہے، بڑی بھلائی، خیر کثیر، سخی اور فیاض آدمی، کثرت سے ماخوذ ثلاثی مزید ملحق برباعی مجرد ہے، وہ تمام نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو دنیا میں عطا فرمائی ہیں اور وہ نعمتیں جو آخرت میں آپ ﷺ کو عطا کی جائیں گی۔ اسی طرح کوثر جنت کے ایک دریا کا نام ہے جس کی خاک خالص مشک، جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔

اسی طرح فیاض اور سخی کو کوثر کہا جاتا ہے، کمیت کا ایک شعر ہے

وَأَنْتَ كَثِيرٌ يَا ابْنَ مَرْوَانَ طَيِّبٌ ... وَكَانَ أَبُوكَ ابْنُ الْفَضَائِلِ كَوْثَرَا

لفظ "کوثر" کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا الکوثر جنت میں نہر ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے ہیں، اس میں موتی اور یاقوت جاری ہیں، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبو دار ہے، اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سفید ہے۔ (سنن ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا رَأَيْتُ نَهْرًا فِي الْجَنَّةِ حَافَتَاهُ قِبَابُ اللُّؤْلُؤِ الْمُجَوَّفِ فَضَرَبْتُ بِيَدِي إِلَى مَجْرَى الْمَاءِ فَإِذَا أَنَا بِمِسْكٍ أَذْفَرَ، فَقُلْتُ: مَا

هٰذَا؟ قِيلَ: اَلْكَوْثَرُ الَّذِي أَعْطَاكَ اللّٰهُ (تفسیر کبیر)

میں نے جنت میں ایک نہر دیکھی، جس کے دونوں کناروں پر مجوف موتیوں کے خیمے دیکھے ہیں، پھر میں نے اپنا ہاتھ پانی کے چلنے کی جگہ پر مارا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں مسک اَذفر کے پاس ہوں، میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ وہ کوثر ہے جو آپ ﷺ کو عطا کی گئی ہے۔

② کوثر سے مراد حوض ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، اچانک اونگھ آگئی، آپ ﷺ مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور فرمایا مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ ﷺ نے سورۃ الکوثر کی تلاوت فرمائی۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا چیز ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ نہر ہے جس کا میرے رب عزوجل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اس میں خیر کثیر ہے اور یہ وہ حوض ہے جس پر قیامت کے دن میری امت وارد ہوگی، اس کے برتن ستاروں کے عدد کے برابر ہیں، اس پر ان میں سے ایک بندہ وہاں سے نکالا جائے گا، میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ میرا امتی ہے، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آپ از خود نہیں جانتے کہ اس نے آپ کے بعد دین میں کیا نیا کام نکالا تھا۔ (صحیح مسلم)

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، کوثر سے مراد خیر کثیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر خیر کثیر آپ ﷺ کو عطا فرمادی اور اسلام، قرآن، نبوت اور دنیا و آخرت میں تعریف و تحسین، ثناء جمیل یہ سب چیزیں خیر کثیر ہیں، اسی طرح جنت کی تمام نعمتیں خیر کثیر ہیں۔ (بخاری شریف)

④ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد نبوت اور کتاب ہے۔

⑤ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد قرآن کریم ہے۔

⑥ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد اسلام ہے۔ اسلام ہی خیر کثیر ہے، اسی سے دنیا اور عقبیٰ کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں، اس کے فوت ہونے سے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ اسلام عبارت ہے معرفت سے یا اس سے جس میں معرفت کا ہونا

ضروری ہے، اللہ نے قرآن میں اسے حکمت سے تعبیر فرمایا کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی، جب اسلام خیر کثیر ہے تو وہ کوثر ہی ہے۔

⑦ حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد قرآن کریم کو آسان کرنا اور شرعی احکامات میں تخفیف کرنا ہے۔

⑧ حضرت ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی امت اور آپ کے پیروکاروں کی کثرت ہے۔

⑨ علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی بلندی ہے۔

⑩ کوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کا وہ نور ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے ماسوا سے الگ کر دیا تھا۔

⑪ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد شفاعت مصطفوی ہے۔

⑫ علامہ ثعلبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں، جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کو دولت ہدایت نصیب ہوئی۔

⑭ حضرت بلال بن یساف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا ہے، ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں۔

⑮ امام رازی رحمہ اللہ نے الکوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت اولاد بھی بیان کی ہے کیونکہ یہ سورت اس شخص کے قول کے رد میں نازل ہوئی جس نے آپ کے بیٹوں کے مرنے پر بے ہودہ گفتگو کی تھی، اللہ تعالیٰ یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آپ کی اولاد پھیلے گی۔

⑯ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے علماء کرام ہیں، ان کی مثال بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کی طرح ہے، یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ سے محبت رکھتے ہیں، آثارِ دین کی اِشاعت کرتے ہیں، اِعلام شریعت کو پھیلاتے ہیں، ان کی انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ مشابہت یوں ہے

کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام اصول معرفۃ اللہ پر متفق ہوتے ہیں، شریعت میں مختلف ہوتے ہیں مخلوق پر مہربانی کی وجہ سے، تاکہ ہر شخص اس چیز تک پہنچ جائے جو اس کے لیے بہتر ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی امت کے علماء کرام بھی ہیں، جو سارے کے سارے شرعی اصول پر متفق ہیں، لیکن فروعات شرعیہ میں مختلف ہیں، مخلوق پر مہربانی کی وجہ سے۔

پھر فضیلت کی ایک وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر نبی کو لایا جائے گا اور اس کی پیروی کرتے اس کے امتیوں کو، کسی نبی کو لایا جائے گا تو اس کے پیروکاروں میں ایک یا دو لوگ ہوں گے اور آپ ﷺ کی امت کے علماء میں سے ہر عالم کو لایا جائے گا تو اس کے پیروکار ہزاروں میں ہوں گے یہ سب لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس جمع ہوں گے، بعض علماء کرام کے پیروکاروں کی تعداد ہزاروں نبیوں کے پیروکاروں کے شمار سے زیادہ ہوگی۔ (تفسیر کبیر للرازی)

⑰ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد عمدہ اور اچھے اخلاق ہیں، عمدہ اخلاق سے فائدہ عام ہوتا ہے، عالم، جاہل، جانور اور اہل عقل سبھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جب کہ علم سے نفع اٹھانا خاص ہے اس سے صرف اہل عقل ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اخلاق حسن کا نفع عام ہے، اس لیے کوثر کو اخلاق حسن پر محمول کرنا ضروری ہے، نبی کریم ﷺ اجنبی لوگوں کے لیے بھی بمنزل والد کے تھے، ان کی مشکلات آسان کرتے تھے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے، آپ ﷺ کو قرآن کریم بھی خلق عظیم کا مالک قرار دیتا ہے، آپ ﷺ اخلاق حسنہ کے اس بلند مقام پر فائز تھے کہ جب ایک معرکہ میں آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوگئے تو آپ ﷺ نے بجائے انتقام اور اظہار جلال کے یہی دعا فرمائی کہ اے میرے پروردگار! میری قوم کو ہدایت دے انہیں پتا نہیں۔

⑱ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد مقامِ محمود ہے، جو کہ مقامِ شفاعت ہے، دنیا میں جب نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان آپ ﷺ کے بارے میں یہ تھا کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ (الأنفال: ۳۳) اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہیں دے گا درانحالیکہ آپ ان

میں ہوں۔ اور آخرت میں آپ ﷺ کا اپنا فرمان ہے شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي (ترمذی) قیامت میں میری امتیوں کے بڑے گناہوں بارے سفارش ہو گی۔

حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةً مُسْتَجَابَةً وَإِنِّي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ترمذی)

ہر نبی کو ایک مقبول دعا دی گئی ہے، میں نے قیامت کے دن اپنی امت کی سفارش کے لیے اپنی دعا چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔

⑲ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد یہی سورۃ الکوثر ہے، اس لیے کہ یہ سورت چھوٹی سی ہونے کے باوجود دنیا اور عقبیٰ کے منافع کے لحاظ سے کافی وافی ہے، اس لیے کہ یہ کئی وجوہ سے معجز چیزوں پر مشتمل ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ جب ہم کوثر کو پیروکاروں کی کثرت، یا اولاد کی کثرت یا نسل کے نہ ختم ہونے پر محمول کریں تو غیب سے متعلق خبر دینا ہے، تو یہ خبر دینا تو واقع کے مطابق ٹھہری، اس لیے یہ معجز ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ نے فرمایا آپ اپنے رب کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے، یہ فقر کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے تبھی تو قربانی پر قدرت حاصل ہوئی، اور ایسا ہوا بھی، یہ بھی غیب سے متعلق خبر دینا ہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ کا فرمان کہ آپ کا دشمن ہی دم بریدہ اور بے نسل رہے گا تو یہ بھی اسی طرح ہوا جس طرح اس نے خبر دی، یہ بھی معجز ہے۔

چوتھا یہ کہ سورۃ الکوثر کے چھوٹی سی سورت ہونے کے باوجود وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکے، تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ اعجاز کی وجہ قرآن کے کمال میں ہے، جو اس کے ساتھ ثابت ہوئی، جب وہ لوگ اس کے چھوٹی سی سورت ہونے کے باوجود مقابلہ کرنے سے عاجز رہے تو یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ بدرجہ اولیٰ پورے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔

جب ان وجوہات کی بناء پر اس میں وجوہ اعجاز ثابت ہو گئیں، تو نبوت ثابت ہو گئی، جب نبوت ثابت ہو گئی تو توحید ثابت ہو گئی، صانع کی معرفت ثابت ہو گئی، دین اور اسلام کی حقانیت ثابت ہو گئی، اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، جب یہ باتیں ثابت ہو گئیں تو دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں ثابت ہو گئیں، تو یہ سورت ایک مختصر، مضبوط، مکمل نکتہ کے قائم مقام ہو گئی جس سے تمام مقاصد ثابت ہو گئے، تو یہ سورت صورتاً تو چھوٹی ہے لیکن معنوی لحاظ سے بڑی ہے۔

پھر اس سورت کی کچھ ایسی خاصیات ہیں جو اس کے علاوہ کہیں اور نہیں پائی جاتیں، وہ یہ کہ یہ سورت صرف تین آیات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر آیت معجز ہے، ہر آیت الگ سے معجز ہے اور ان تینوں آیات کا مجموعہ معجز ہے، یہ ایسی خاصیت ہے جو باقی تمام سورتوں میں نہیں پائی جاتی، اس لیے یہ احتمال ہے کہ الکوثر سے مراد یہی سورۃ الکوثر ہی ہو۔

⑳ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد وہ تمام نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو عطا فرمائی ہیں، سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الکوثر کا لفظ کثرت کو شامل ہے، اس لیے کوثر کو بعض نعمتوں پر محمول کرنے کی بجائے کل نعمتوں پر محمول کرنا ہی بہتر اور ضروری ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل فرمایا تو انہیں کچھ لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو نہر جنت میں ہے وہی خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی ہے۔

ان سب اَقوال میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد جنت میں ایک نہر ہے یا حوض ہے جو میدانِ محشر میں قائم ہو گا، اس کے گرد آسمان کے ستاروں کی طرح برتن بکثرت ہوں گے، جو ایک مرتبہ آپ ﷺ کے دستِ مبارک سے حوضِ کوثر کا جام پیے گا اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔

حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ باہر نکلے تو آپ نے شہداء اُحد پر نماز

جنازہ پڑھی، پھر آپ منبر پر گئے، پھر فرمایا: میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور میں تمہارے حق میں گواہی دوں گا، اور بیشک اللہ کی قسم! میں اپنے حوض کو اب بھی ضرور دیکھ رہا ہوں اور بیشک مجھے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئی ہیں اور بیشک اللہ کی قسم! مجھے تم پر یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم (سب) مشرک ہو جاؤ گے لیکن مجھے تم سے یہ خطرہ ہے کہ تم دنیا میں رغبت کرو گے۔ (بخاری، سنن ترمذی، مسند حمد)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ نے کوثر سے ایک مراد نبوت لی ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ نبوت خیر کثیر ہے، کیونکہ وہ ربوبیت میں دوسرے مرتبے پر ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے فرمایا مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النِّسَاءِ: ۸۰) جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

یہ ایمان کا حصہ ہے، بلکہ اللہ کی معرفت میں ایک ٹہنی کی طرح ہے کیونکہ نبوت کی معرفت ضروری ہے، نبوت پیش لفظ ہے ذات اللہ، علم اللہ، قدرت اللہ اور حکمت اللہ کی معرفت کا، پھر جب نبوت کی معرفت حاصل ہو گئی تو اس وقت اس سے اللہ کی باقی صفات جیسے سمع، بصر، صفاتِ خیر اور صفات وجدانی کی معرفت بعض حضرات کے قول پر مستفاد ہو گی۔ (تفسیر کبیر للرازی)

کوثر کی مراد پر مختلف اقوال پیش کرنے کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی شان میں بہت ہی خوبصورت مواد پیش کیا ہے، فرماتے ہیں کہ پھر ہمارے رسول ﷺ کے لیے اس منقبت سے حظ وافر ہے، کیونکہ ان کا تذکرہ سارے انبیاء سے پہلے تھا جب کہ آپ ﷺ کی بعثت بعد میں ہوئی، پھر آپ ﷺ ثقلین کی جانب نبی بنا کر بھیجے گئے، آپ ﷺ ہی وہ ہستی ہوں گے جو انبیاء کرام سے پہلے اٹھائے جائیں گے، ان فضائل کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا، آپ ﷺ کے فضائل و مناقب اس کثرت سے ہیں کہ انہیں گنا اور شمار نہیں کیا جا سکتا۔ (تفسیر کبیر)

آدم علیہ السلام کو جو کتاب ملی وہ چند کلمات تھے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ (الْبَقَرَةِ: ۳۷) پس آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات پائے۔ ابراہیم علیہ السلام کی

کتاب کیا تھی؟ چند کلمات ہی تو تھے جیسے ارشاد ہے وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ (الْبَقَرَة: ۱۲۴) اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند کلمات کے ساتھ آزمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کیا تھی؟ وہ چند صحیفے تھے جیسے ارشاد ہے صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (الْأَعْلَى: ۱۹) تم نے حیات دنیا کو حیات آخرت پر ترجیح دی حالانکہ حیات آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے۔

اس کے برعکس نبی کریم ﷺ کی کتاب کو تمام کتابوں اور صحیفوں پر نگہبان کا خطاب دیا گیا ہے، ارشاد ہے وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (الْمَائِدَة: ۴۸) قرآن کریم ان پر نگہبان ہے۔

سیدنا آدم علیہ السلام نے چند بکھرے ہوئے ناموں کے ساتھ چیلنج کیا اور فرمایا کہ مجھے ان ناموں کے بارے میں اطلاع دو، جب کہ رحمت کائنات ﷺ کا چیلنج ایک منظم کلام میں تھا، جب آپ ﷺ نے فرمایا قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ (الْإِسْرَاء: ۸۸) فرما دیجیے! اگر انس و جن سب اکٹھے ہو جائیں۔

سیدنا نوح علیہ السلام کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ سفینہ نوح کو پانی پر کھڑا کر دیا گیا، جب نبی کریم ﷺ کو اس سے بڑھ کر اعزاز سے نوازا گیا، ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک پانی کے کنارے پر جلوہ افروز تھے، آپ ﷺ کے ہمراہ آپ کے چچا ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، عکرمہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو اس پتھر کو بلائیے، جو اس جانب ہے، وہ تیرتے ہوئے آئے اور ڈوبے بھی نہیں، اس پر آپ ﷺ نے پتھر کی طرف اشارہ کیا، آپ کے اشارے پر پتھر اپنی جگہ سے اکھڑا اور تیرنا شروع ہو گیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آ گیا، اس پتھر نے آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دی، آپ ﷺ نے اپنے چچازاد عکرمہ سے فرمایا کہ کیا تیرے لیے یہ کافی ہے؟ اس نے کہا کہ یہ اپنی جگہ واپس چلا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا تو وہ اپنی جگہ واپس لوٹ گیا۔ (کبیر)

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یہ اعزاز ملا کہ اللہ نے نارِ نمرود ان کے لیے گل و گلزار بنا دی تھی، جب کہ نبی کریم ﷺ کے حق میں اس سے بڑا اعزاز تھا، حضرت محمد بن حاطب کہتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا، میرے اوپر کھولتی ہوئی ہنڈیا گر پڑی، جس سے میری ساری چمڑی جل گئی، مجھے میری ماں

اٹھا کر رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچی، اور کہا یہ ابن حاطب ہے، جل گیا ہے، جیسے آپ دیکھ رہے ہیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنا تھوک مبارک میری چمڑی پر لگایا، اپنا دستِ مبارک جلی ہوئی جگہ پر پھیرا، اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے أَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ، فَصِرْتُ صَحِيحًا لَا بَأْسَ بِي، اے لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو دور فرما دیجیے، اس کے بعد میں تندرست ہو گیا اور مجھے کوئی تکلیف نہ رہی۔

موسیٰ علیہ السلام کو یہ اعزاز ملا کہ ان کے لیے زمین میں دریا دو لخت ہو گیا تھا، جب کہ نبی کریم ﷺ کو یہ مقام ملا کہ آسمان میں چاند دو لخت ہو گیا تھا، دیکھ لیجیے زمین اور آسمان میں کتنا فرق ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے پتھر سے پانی نکالا، جب کہ نبی کریم ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے ابل پڑے، موسیٰ علیہ السلام کو یہ اعزاز ملا کہ بادلوں سے ان پر سایہ کروایا، جب کہ حضرت نبی کریم ﷺ پر بادل خود سائبان بن گئے، موسیٰ کو یدِ بیضا سے نوازا جب کہ نبی کریم ﷺ کو اس سے بڑھ کر قرآن عظیم کا اعزاز بخشا جس نے شرق و غرب کو تاباں کر دیا، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو اژدھا میں بدل ڈالا، ادھر اپنے حبیب ﷺ کو یہ شان بخشی کہ آپ ﷺ کے چچا ابو جہل نے آپ ﷺ کو پتھر مارنا چاہا، جب اس نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے دونوں کاندھوں پر دو اژدھے اس کا انتظار کر رہے ہیں تو وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔

داؤد علیہ السلام کو یہ شان ملی کہ پہاڑ ان کے ہمراہ تسبیح خوان تھے، جب کہ پیارے نبی ﷺ کو یہ شان ملی کہ پتھر کنکر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں میں تسبیح خوانی کرتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ شان ملی کو لوہے کو ہاتھ لگاتے تو نرم ہو جاتا تھا، مگر یہاں رحمت کائنات ﷺ کی شان یہ تھی کہ خشک بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو دودھ جاری ہو گیا، داؤد علیہ السلام کو یہ شان ملی کہ پرندے ان کے قریب جمع ہو جاتے تھے، جب کہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کے پاس جنتی براق چل کر آگئی تھی۔

سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو یہ اعزاز ملا کہ وہ باذن اللہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، ہمارے آقا مدنی کریم ﷺ کو یہ شان ملی کہ جب یہودیوں نے آپ ﷺ کی مہمان نوازی کی تو زہریلی بکری

ضیافت میں تیار کی، جب آپ ﷺ نے لقمہ اپنے منہ میں رکھا تو لقمہ نے آپ کو اطلاع کر دی کہ مجھ میں زہر ملایا گیا ہے، عیسیٰ علیہ السلام مادرزاد اندھوں کو بینا کر دیا کرتے تھے، کوڑھ کے مریضوں کو ٹھیک کر دیا کرتے تھے، جب کہ ہمارے آقا علیہ السلام کی شان یہ تھی کہ معاذ بن عفراء کی بیوی آپ کے پاس آئی اسے برص کی بیماری تھی، اس نے نبی کریم ﷺ سے اس کی شکایت کی، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس پر ایک شاخ پھیری تو اللہ نے برص کو دور کر دیا۔ (تفسیر کبیر)

پھر وہ منظر بھی کیا عجیب تھا جب میدانِ اُحد میں ایک شخص کی آنکھ کا ڈھلا باہر آ گیا تو اسے حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا گیا، نبی کریم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس ڈھلے کو اپنی جگہ پر دوبارہ رکھ دیا تھا۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ وہ لوگوں کی گھروں میں چھپائی ہوئی چیزوں کی اطلاع رکھتے تھے، جب کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو اپنے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب اور ان کی اہلیہ ام الفضل کے اس چھپائے ہوئے خزانے کی اطلاع مدینہ میں مل گئی تھی جو دونوں بیوی میاں نے اپنی اولاد کے لیے مکہ میں گڑھا کھود کر دبایا تھا، ان دونوں کے علاوہ اس کو جاننے والا کوئی نہیں تھا، اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو مدینہ منورہ میں اس کی اطلاع کر دی، جس کے بارے زبانِ نبوت سے سن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کلمہ پڑھ لیا تھا۔

سیدنا سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لیے رب تعالیٰ نے سورج کو لوٹایا تھا، تو ہمارے نبی ﷺ کے لیے بھی اس وقت سورج کو لوٹا دیا تھا، جب آپ ﷺ اپنا سر مبارک آغوش علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں رکھ کر آرام فرما تھے، عصر کی نماز کا وقت نکل گیا، جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا، اللہ نے آفتاب کو ان کی خاطر لوٹایا، تو آپ نے عصر کی نماز ادا کی، امام رازی کہتے ہیں کہ دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے سورج کو لوٹایا کہ انہوں نے نماز عصر اپنے وقت پر ادا کی۔ (تفسیر کبیر، سورۃ الکوثر)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ شق القمر (چاند

کا دو ٹکڑے ہو جانا) اس سے بڑھ کر معجزہ تھا کیونکہ کسی متحرک جسم کا ساکن ہو جانا اتنا عجیب نہیں جتنا کہ ایک مضبوط جسم کے دو ٹکڑے ہو جانا عجیب ہے (حجۃ الاسلام بحوالہ حاشیہ ترجمان السنہ ج ۴)

استاذ المحدثین مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیر (حضرت مولانا بدر عالم صاحب) کے نزدیک حبس الشمس سے ردّ الشمس بڑھ کر ہے کیونکہ حبس الشمس ایک کرہ کا اپنے مدار پر توقف کا نام ہے اور ردّ الشمس میں حرکت معکوس ہے اور ظاہر ہے توقف کی نسبت معکوس حرکت زیادہ مشکل ہے۔ (حاشیہ ترجمان السنہ ج ۴)

اگر سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیاں سکھائی گئیں تو اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی تو ایسا کیا گیا، ایک روایت میں ہے کہ ایک پرندے کے بچے کو تکلیف پہنچائی گئی، تو پرندے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے پاس منڈلانا شروع کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کے بیٹے کو کس نے تکلیف پہنچائی ہے؟ ایک آدمی بولا کہ میں نے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے اس کا بچہ واپس کر دو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو یہ اعزاز بخشا کہ ہوا ایک مہینہ کی مسافت انہیں لے کر چلتی تھی جب کہ رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا کہ معراج کے سفر میں بیت المقدس کی مسافت ایک گھڑی میں طے کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یعفور نامی گدھا تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی طرف روانہ کرتے تھے جسے بلانا مقصود ہوتا تھا، وہ اسے لے کر آتا تھا۔

اگر جنات سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تابعدار، اطاعت گزار اور فرمانبردار تھے تو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف بھی جنات کو ملا۔

ایک دیہاتی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گوہ لے کر آیا اور کہنے لگا کہ میں اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاؤں گا جب تک یہ گوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتی، یہ سنتے ہی گوہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعتراف کیا۔

جس ستون کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے، جب منبر تیار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ستون سے ٹیک لگانا چھوڑ دیا تھا، اس جدائی اور فراق پر وہ ستون رونے لگ گیا تھا۔ غارِ ثور میں

جب ہجرت کی رات سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایڑی پر ناگ نے ڈسا تو سانپ کہنے لگا کہ میں کئی سالوں سے اس کے دیدار کا مشتاق ہوں تو نے اس سے میرے لیے آڑ کیوں کی؟ (تفسیر کبیر)

کئی بار ایسا ہوا کہ کھانا تھوڑے لوگوں کے لیے تیار کیا گیا، مگر مہمانوں کی کثرت ہو گئی، رحمتِ دو عالم ﷺ کی برکت سے تھوڑے لوگوں کے لیے تیار کیا گیا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

یوں آپ ﷺ کو عطا کیے گئے معجزات کی ایک بہت بڑی تعداد ہے، ان معجزات کو اکابرین امت اور اساطین علم نے اپنے اپنے علمی ذوق کے مطابق احاطہ تحریر میں بند کیا ہے، یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ لوگوں میں سے آپ ﷺ کو مقدم فرمایا اور ارشاد فرمایا

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ (الْأَحْزَابِ:۷) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے انبیاء کرام سے عہد و پیمان لیا، آپ سے اور نوح سے۔

جب آپ ﷺ کو ملنے والی رسالت اور نبوت کا یہ عالم ہے تو پھر یہ بات بجا ہے کہ آپ ﷺ کو ملنے والی اس عظیم الشان چیز کو کوثر کا نام دیا جائے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ: آپ ﷺ اپنے رب کی رضا کے لیے نماز پڑھیے، اور قربانی کیجیے۔ جب آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو خیر کثیر عطا فرما دی تو عبادت کی طرف زیادہ توجہ کیجئے، نمازیں پڑھتے رہا کریں، فرائض بھی اور نوافل بھی اور جانوروں کی قربانی کرتے رہیں ان کے ذبح کے وقت اپنے رب کا نام لیں۔

پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو کوثر یعنی دنیا و آخرت میں خیر کثیر عطاء فرمانے کی خوش خبری دی اب اس آیت میں اس کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور دو کاموں میں مشغول ہونے کی خاص تلقین فرمائی، ایک نماز، دوسری قربانی، نماز بدنی اور جسمانی عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے اور قربانی مالی عبادتوں میں سے ہے اور اس بنا پر خاص امتیاز اور اہمیت رکھتی ہے کہ اللہ کے نام پر قربانی کرنا بت پرستی کے خلاف ایک جہاد ہے مشرکین بتوں کے نام سے قربانی کرتے تھے اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے نبی ﷺ اور آپ کے توسط سے آپ کی امت کو حکم دیا کہ اللہ کے نام سے قربانی کیا کریں۔

لفظ نحر عربی زبان میں اونٹوں کو ذبح کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا، اہل عرب کے نزدیک اونٹ بڑا قیمتی مال سمجھا جاتا تھا اس آیت میں اونٹ ذبح کرنے کا حکم دیا ہے، گائے اور بکری کی قربانی بھی مشروع ہے جو احادیث شریفہ سے ثابت ہے، ایام حج میں منیٰ میں اور پورے عالم میں ذی الحجہ کی ۱۲،۱۱،۱۰ تاریخوں میں اللہ کی رضا کے لیے قربانیاں کی جاتی ہیں، چونکہ لفظ لربک بھی ساتھ ہی لایا گیا ہے اس لیے مطلق ذبح کرنا مراد نہیں ہے، قربانی وہی ہے جس سے اللہ کی رضا مقصود ہو۔ (انوارالبیان)

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ: بے شک آپ سے بغض رکھنے والا ہی ابتر ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ عاص بن وائل (جو کہ معظمہ میں رسول اللہ ﷺ کا ایک بڑا دشمن تھا) جب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرتا تھا تو کہتا تھا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑو ان کی آل و اولاد تو ہے نہیں موت کے بعد ان کا ذکر و فکر ختم ہو جائے گا اس پر سورۃ الکوثر نازل ہوئی اس میں بتادیا کہ آپ کا ذکر اللہ تعالیٰ بہت بڑھائے گا، جو شخص آپ سے دشمنی کرنے والا ہے وہی بے نام و نشان رہ جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کعب بن اشرف (جو مدینہ منورہ کے رہنے والے یہودیوں میں ایک مالدار شخص تھا) ایک مرتبہ مکہ معظمہ پہنچا اس سے قریش مکہ نے کہا کہ تو سردار آدمی ہے تو اس نو عمر لڑکے کو دیکھ، بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے ہم لوگ حجاج کی خدمت کرتے ہیں انہیں پانی پلاتے ہیں کعبہ شریف کے متولی ہیں (کیا ہم اس سے بہتر نہیں ہیں ؟) اس پر کعب بن اشرف نے کہا کہ تم لوگ اس سے بہتر ہو، اس پر آیت کریمہ **إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ** نازل ہوئی۔ (البزار، ابن کثیر)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے کہ یہ سورت ابو لہب کے بارے میں نازل ہوئی، جب رسول اللہ ﷺ کے ایک صاحبزادہ کی وفات ہو گئی تو ابو لہب مشرکین کے پاس گیا اور کہا کہ ان کی نسل ختم ہو گئی، اب ان کا ذکر و فکر کچھ نہیں ہو گا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

آپ ﷺ کے دشمنوں نے یہ خیال کیا کہ آل اولاد ہی سے انسان کا ذکر اور چرچا باقی رہتا ہے،

رسول اللہ ﷺ کی نرینہ اولاد میں سے کوئی باقی نہیں لہٰذا ان کا ذکر تھوڑے ہی دن رہے گا یہ ان لوگوں کی جہالت اور حماقت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کا ذکر خوب بلند کیا، آسمانوں میں بھی بلایا، فرشتوں میں متعارف کرایا، پوری دنیا میں آپ پر ایمان لانے والے پیدا فرمائے۔ سلام بھیجنا مشروع فرمایا، آپ پر کتاب نازل فرمائی، کروڑوں افراد کو پورے عالم میں آپ کی امت اجابت میں شامل فرمایا، ہر وقت لاکھوں کی تعداد میں آپ پر امت کا صلاۃ وسلام پہنچتا ہے اور دشمنان اسلام بھی آپ کا ذکر خیر کرتے ہیں۔

حضور سرور عالم ﷺ کی نسل (جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہے) لاکھوں کی تعداد میں گزر چکی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں اب بھی موجود ہے اور آپ پر ایمان لانے والے کروڑوں گزر چکے ہیں اور کروڑوں موجود ہیں، جن لوگوں نے آپ سے دشمنی رکھی اور یوں کہا کہ ان کا ذکر فکر کچھ نہ رہے گا خود یہ دشمن بے نام ونشان ہوگئے آج ان کا نام لیوا کوئی نہیں ہے۔ دنیا سے خود بھی گئے نسل بھی ختم ہوگئی۔ (انوار البیان)

حو دہل لہ حو دہل آج سورۃ الکوثر کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے، اسے ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۷ جولائی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت ڈیڑھ بجے شب

حروف بنی: ۲۸ نومبر ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ بوقت ساڑھے سات بعد العشاء

☆☆☆☆

الکافرون

کفار کی فرمائش پر دندان شکن جواب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ{۱}لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ {۲}وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ{۳}وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ{۴}وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ {۵}لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ{۶} الکافرون.

جواب ترجمہ: (اے نبی ﷺ! آپ فرما دیجیے کہ اے کافرو! میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

اس سورت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ان کافروں نے حضور ﷺ سے کہا تھا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں تو اگلے سال ہم بھی اللہ کی عبادت کریں گے اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی برحق ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے دین سے اپنی پوری بیزاری کا اعلان فرما دیں کہ میں تمہارے ان بتوں کو اور جن جن کو تم اللہ کا شریک مان رہے ہو ہرگز نہ پوجوں گا گو تم بھی میرے معبود برحق اللہ وحدہ لاشریک لہ کو نہ پوجو۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے سبب نزول کے بارے روایت کیا گیا کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبد المطلب، امیہ بن خلف نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ ہم ایک مدت تک آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور آپ ﷺ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں گے یوں ہمارے اور تمہارے درمیان صلح ہو جائے گی، ہمارے درمیان پائی جانے والی عداوت ختم

ہو جائے گی، اگر آپ کا معاملہ درست ہے تو ہم اس سے حصہ اٹھائیں گے اور اگر ہمارا معاملہ درست ہے تو آپ اس میں سے حصہ اٹھائیں گے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ہمارے کچھ معبودوں کو ہاتھ لگاتے یا چومتے ہیں تو ہم آپ ﷺ کی تصدیق کریں گے، اس پر جبریل امین یہ سورت لے کر نازل ہوئے، اس پر کافر مایوس ہو گئے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اذیت دی، آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اذیت دی۔ (تفسیر قرطبی)

یہاں پر ما، من کے معنیٰ میں ہے پھر دوبارہ یہی فرمایا کہ میں تم جیسی عبادت نہ کروں گا تمہارے مذہب پر میں کاربند نہیں ہو سکتا نہ میں تمہارے پیچھے لگ سکتا ہوں بلکہ میں تو صرف اپنے رب کی عبادت کروں گا اور وہ بھی اس طریقے پر جو اسے پسند ہو اور جیسے وہ چاہے اسی لیے فرمایا کہ نہ تم میرے رب کے احکام کے آگے سر جھکاؤ گے نہ اس کی عبادت اس کے فرمان کے مطابق بجالاؤ گے بلکہ تم نے تو اپنی طرف سے طریقے مقرر کر لیے ہیں جیسے اور جگہ ہے

إِنْ يَّتَّبِعُونَ إِلا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَّبِّهِمُ الْهُدَى ، یہ لوگ صرف وہم و گمان اور خواہش نفسانی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔ (سورۃ النجم ۲۳)

حضرت نبی کریم ﷺ نے ہر طرح اپنا دامن ان سے چھڑا لیا اور صاف طور پر ان کے معبودوں سے اور ان کی عبادت کے طریقوں سے علیحدگی اور ناپسندیدگی کا اعلان فرما دیا۔

ظاہر ہے کہ ہر عابد کا معبود ہو گا اور طریقہ عبادت ہو گا، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت صرف اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور طریقہ عبادت ان کا وہ ہے جو سرور کائنات ﷺ نے تعلیم فرمایا ہے اسی لیے کلمہ اخلاص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا راستہ وہی ہے جس کے بتانے والے محمد ﷺ ہیں، جو اللہ کے پیغمبر ہیں اور مشرکین کے معبود بھی اللہ کے سوا

غیر ہیں اور طریقہ عبادت بھی اللہ کا بتلایا ہوا نہیں اسی لیے فرمایا کہ تمہارا دین تمہارے لیے میرا میرے لیے ہے جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ (یُونُس:۴۱) یعنی اگر یہ آپ ﷺ کو جھٹلائیں تو آپ ﷺ کہہ دیں کہ میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم میرے اعمال سے الگ ہو اور میں تمہارے کاموں سے بیزار ہوں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ (الْقَصَصِ: ۵۵) ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال ہیں۔

بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں ہے تمہارے لیے تمہارا دین ہے یعنی کفر اور میرے لیے میرا دین ہے یعنی اسلام۔ یہ لفظ اصل میں دینی تھا لیکن چونکہ اور آیتوں کا وقف نون پر ہے اس لیے اس میں بھی "یا" کو حذف کر دیا جیسے فَهُوَ يَهْدِيْنَ میں اور يَسْقِيْنَ میں بعض مفسرین نے کہا ہے مطلب یہ ہے کہ میں اب تو تمہارے

معبودوں کی پرستش کرتا نہیں اور آگے کے لیے بھی تمہیں ناامید کر دیتا ہوں کہ عمر بھر میں کبھی بھی یہ کفر مجھ سے نہ ہو سکے گا اسی طرح نہ تم اب میرے اللہ کو پوجتے ہو نہ آئندہ اس کی عبادت کرو گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کا ایمان نہ لانا اللہ کو معلوم تھا جیسے قرآن میں ہے وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا (الْمَائِدَةِ: ۶۴) یعنی تیری طرف جو اترتا ہے اس سے ان میں سے اکثر تو سرکشی اور کفر میں بڑھ جاتے ہیں۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض عربی دان حضرات سے نقل کیا ہے کہ دو مرتبہ اس جملے کا لانا صرف تاکید کے لیے ہے جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے مقام پر تاکیدی الفاظ آئے ہیں لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ

الْيَقِيْنِ، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں جملوں کو دو مرتبہ لانے کی حکمت میں یہ تین قول ہوئے ایک تو یہ کہ پہلے جملے سے مراد معبود، دوسرے سے مراد طریق عبادت، دوسرے یہ کہ پہلے جملے سے مراد حال دوسرے سے مراد استقبال یعنی آئندہ، تیسرے یہ کہ پہلے جملے کی تاکید دوسرے جملے سے ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں ایک چوتھی توجیہ بھی ہے جسے حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی بعض تصنیفات میں قوت دیتے ہیں وہ یہ کہ پہلے تو جملہ فعلیہ ہے اور دوبارہ جملہ اسمیہ ہے تو مراد یہ ہوئی کہ نہ تو میں غیر اللہ کی عبادت کرتا ہوں نہ مجھ سے کبھی بھی کوئی امید رکھ سکتا ہے یعنی واقعہ کی بھی نفی ہے اور شرعی طور پر ممکن ہونے کا بھی انکار ہے یہ قول بھی اچھا ہے واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت امام ابو عبد اللہ شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سارے کا سارا کفر ایک ہی ملت ہے اس لیے یہودی نصرانی کا اور نصرانی یہودی کا وارث ہو سکتا ہے جبکہ ان دونوں میں نسب یا سبب ورثے کا پایا جائے اس لیے کہ اسلام کے سوا کفر کی جتنی راہیں ہیں وہ سب باطل ہونے میں ایک ہی ہیں۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کا مذہب اس کے برخلاف ہے کہ نہ یہودی نصرانی کا وارث ہو سکتا ہے نہ نصرانی یہودی کا کیونکہ حدیث ہے لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتَّى دو مختلف مذہب والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ (مسند احمد، ابن کثیر)

سورت کے فضائل اور خواص

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لئے دو سورتیں بہتر ہیں سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص۔ (رواہ ابن ہاشم مظہری)

متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور بعد مغرب کی سنتوں میں بکثرت یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی دعا بتا دیجئے جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں، آپ نے قل یا ایھا

الکفرون پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے برأت ہے (رواہ الترمذی وابوداؤد)

اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب سفر میں جاؤ تو وہاں تم اپنے سب رفقاء سے زیادہ خوشحال بامراد رہو اور تمہارا سامان زیادہ ہو جائے، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بیشک میں ایسا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر قرآن کی پانچ سورتیں سورۃ کافرون، سورۃ نصر، سورۃ اخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ ناس پڑھا کرو اور ہر سورۃ کو بسم اللہ سے شروع کرو اور بسم اللہ ہی پر ختم کرو۔

حضرت جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے بالمقابل قلیل الزاد خستہ حال ہوتا تھا۔ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا۔ (مظہری بحوالہ ابویعلیٰ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے پانی اور نمک منگایا اور یہ پانی کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور قل یاایھا الکافرون قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔ (مظہری)

حضرت حارث بن جبلہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یَا رَسُولَ اللّٰہِ، عَلِّمْنِی شَیْئًا أَقُولُہُ عِنْدَ مَنَامِی. قَالَ: إِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ مِنَ اللَّیْلِ فَاقْرَأْ: قُلْ یَا أَیُّهَا الْكَافِرُونَ فَإِنَّهَا بَرَاءَةٌ مِنَ الشِّرْكِ، یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیجیے جو میں نیند کے وقت پڑھا کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو رات کو اپنی خواب گاہ میں جائے تو قل یاایھا الکافرون پڑھ لیا کر، کیونکہ یہ سورت شرک سے برأت ہے۔ (ابن کثیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ کار یہ تھا کہ جب رات کو بستر پر جاتے تو سورۃ الکافروں سے لے کر آخر تک پڑھا کرتے تھے۔ (ابن کثیر)۔

(۷ جولائی ۲۰۲۰ء بروز منگل، ۱۱ بجے شب)

☆☆☆☆

النصر

فتح مکہ کے ثمرات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ {۱} وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا {۲} فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا {۳} النصر.

جواب ترجمہ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں، یقین جانیں وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

فتح مکہ سے قبل لوگ تھوڑے تھوڑے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ نے رحمت کائنات ﷺ کی قیادت باسعادت میں دس ہزار قدسی انسانوں کے ہاتھوں ایک قطرہ خون بہائے بغیر مکہ کو فتح فرمادیا تو اب لوگ جوق در جوق، فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، سورۃ اذا جاء نصر اللہ کے نزول کے بعد رحمت دوعالم ﷺ نے اہل اسلام کو اپنی رحلت کی اطلاع فرمادی تھی۔

شیخ محمد ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس سورت کے نزول کے بعد اپنی رحلت کی اطلاع دینے پر تین توجیہات پیش کیں ① نبی کریم ﷺ نے جب دیکھا کہ لوگ جوق در جوق، فوج در فوج، قبیلہ در قبیلہ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اس سے آپ ﷺ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ کی رحلت کا وقت قریب آچکا ہے، آپ ﷺ کو جس چیز کا حکم دیا گیا تھا وہ مکمل ہو چکا ہے، آپ ﷺ تبلیغ اور دعوت سے فارغ ہو گئے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی پوری ہونے کی کچھ نشانیاں رسول کریم ﷺ کو بتادی تھیں، ان نشانیوں سے آپ ﷺ نے جان لیا تھا کہ اب میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔

③ لوگوں کے فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے سے جب تبلیغ اسلام میں مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ رہی تو آپ ﷺ نے جان لیا کہ اب میری زندگی پوری ہوگئی ہے۔ (تاویلات اہل السنۃ، تفسیر ماتریدی ج ۱۰ ص ۶۳۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں نُعِيَتْ إِلَيَّ نَفْسِي بِأَنَّهُ مَقْبُوضٌ فِي تِلْكَ السَّنَةِ، مجھے اپنی وفات کی خبر دی گئی ہے گویا اس سال میری روح قبض کرلی جائے گی۔ (احمد)

اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، إِنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ أَرْبَعِينَ سَنَةً فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ، وَهٰذِهِ لِي عِشْرُونَ سَنَةً وَأَنَا مَيِّتٌ فِي هٰذِهِ السَّنَةِ، فَبَكَتْ فَاطِمَةُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْتِ أَوَّلُ أَهْلِ بَيْتِي لُحُوقًا بِي فَتَبَسَّمَتْ (تفسیر ابن ابی حاتم)

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے اپنی امت میں چالیس سال گزارے اور میرے بیس سال پورے ہو چکے ہیں اور میں اس سال میں فوت ہو جاؤں گا، پس حضرت سیدہ فاطمہ رونے لگیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے اہل بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے ملو گی، پھر آپ مسکرانے لگیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے ہمراہ مجھ سے سوال کیا، میں نے کہا، یہ نبی ﷺ کی رحلت کی اطلاع ہے، پھر سورۃ النصر کی تلاوت فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ تو نے سچ کہا۔ (معجم کبیر)

معجم کبیر طبرانی کی ہی دوسری روایت میں ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی اجل ہے، جس کی اللہ عز و جل نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی تھی اور بتایا تھا یہ آپ کی وفات کی علامت ہے، سو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (المعجم الکبیر، بخاری)

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے

حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى (الضُّحَى: ۵) اور عنقریب آپ ﷺ کا پروردگار آپ ﷺ کو اس قدر دے گا کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں گے۔

سورۃ الکوثر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ بے شک ہم نے آپ ﷺ کو کوثر عطا کی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس انداز میں آپ ﷺ کے ساتھ وعدہ کیا ہے تو یقینی بات ہے کہ ان چیزوں میں روز بروز اضافہ تو ہونا ہی تھا، گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے یہ فرمایا کہ اے محمد ﷺ آپ کا دل کیوں تنگ ہوا؟ آپ ﷺ کے سر پر جب ابھی تاج رسالت نہیں رکھا گیا تھا اس وقت میں نے آپ ﷺ کو ضائع نہیں ہونے دیا، بلکہ آپ ﷺ کی ابابیل پرندوں کے ذریعے مدد اور نصرت فرمائی، جب زمانہ رسالت کا ابتدائی دور تھا تو کیا میں نے پرندوں کو ملائکہ کا روپ دے کر پانچ ہزار کے ذریعے آپ ﷺ کی مدد نہیں کی تھی؟ اب اس نصرت اور مدد میں اضافہ کر رہا ہوں، میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں اپنی ذات کے لحاظ سے آپ کا مددگار ہوں، تبھی تو کہا جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔

رحمت کائنات ﷺ نے اللہ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! آپ نے نعمت تمام کر دی جب آپ نے میری جائے پیدائش، میری رہائش و مسکن کو فتح کر دیا، عرض کیا پروردگار! جب لوگ یہاں سے نکل جائیں تو پھر اس میں لذت کیا ہے؟ اس پر فرمایا کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوں گے، پھر گویا یوں فرمایا کہ اے محمد! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ اعزازات آپ نے کس سبب سے پائے؟

یہ اعزازات آپ ﷺ نے اس لیے پائے کہ آپ نے کافروں کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، اس میں تین باتیں ہیں، ایک یہ کہ آپ نے اپنی زبان سے میری مدد کی تو اس کی جزا اذا جاء نصر اللہ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مکہ نے لشکر توحید کے ساتھ آپ کے دل کو فتح کر لیا، تو ہم نے آپ کو مکہ کی فتح عطا کی، والفتح سے یہاں یہی مراد ہے، تیسری بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اعضاء و جوارح کی رعیت کو میری اطاعت و بندگی

میں داخل کیا تو میں نے بھی اسی طرح اپنے بندوں کو تیری اطاعت میں داخل کیا، یہی مراد ہے یدخلون فی دین اللہ افواجا میں۔

جب آپ ﷺ نے ان تین باتوں کی خلعت اختیار کرلی تو میری جناب میں تین قسم کی بندگیاں بھیجیے، باہمی ہدیہ دیا کرو اس سے محبت پیدا ہوتی ہے، میں نے آپ کی مدد کی اس لیے آپ تسبیح کیجیے، آپ نے مکہ فتح کرلیا اس لیے حمد کیجیے، اگر اہل مکہ مسلمان ہو جائیں تو استغفار کیجیے، اللہ نے اپنی مدد کے مقابلے میں اپنی تسبیح رکھ دی، اس لیے کہ تسبیح میں اللہ کی پاکی بیان کی جاتی ہے، اسے محدثات کی مشابہت سے پاک کرنا ہے مطلب یہ ہے کہ آپ مشاہدہ کریں گے کہ اس ذات نے آپ کی مدد کی ہے اور اس گمان سے اجتناب کیجیے کہ اس نے آپ کی نصرت اس لیے کی کہ اس میں آپ کا استحقاق تھا، بلکہ یہ خیال کیجیے کہ مخلوق کے استحقاق میں سے کوئی چیز اس پر لازم ہو وہ منزہ ہے، پھر فتح مکہ کے مقابل حمد ہے کیونکہ نعمت کے مقابلے میں حمد ہی ہوتی ہے، پھر لوگوں کے فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے کے مقابل استغفار ہے، قرآن کریم کی سورت محمد آیت ۱۹ میں فرمان ربانی سے یہی مراد ہے

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (مُحَمَّدٍ: ۱۹) اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کیجیے، ایمان والے مردوں اور عورتوں کے لیے بھی بخشش طلب کیجیے۔

مطلب یہ کہ بہت زیادہ پیروکاروں اور اطاعت گزاروں کی وجہ سے قلب انسانی لذت جاہ میں مشغول ہو جاتا ہے، اس لیے اس قدر معمولی سی مشغولیت پر بھی استغفار کیجیے، ان لوگوں کے لیے بھی استغفار کیجیے، اس لیے کہ جب بھی ان لوگوں کی تعداد بڑھے گی تو گناہ بھی بڑھیں گے، تو اس میں ان لوگوں کو آپ کی طرف سے استغفار و بخشش طلب کرنے کی بہت زیادہ ضرورت پڑے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے کافروں کو سخت لہجہ میں مخاطب کیا اور یوں فرمایا کہ اے کافرو! کفر سے برأت کا اظہار کیا تو یوں لگا جیسے بعض لوگ اس سختی کی وجہ سے ڈر گئے اور آپ کے پیروکاروں کی تعداد تھوڑی رہ جائے گی، اس پر فرمایا کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے

میرا دین، اس پر کہا گیا کہ اے محمد! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میں تجھے مدد کی طرف لے کر نہیں جاؤں گا بلکہ مدد کو تمہارے پاس لاؤں گا، اذاجاء نصر اللہاس کی ایک نظیر حدیث میں بھی بیان کی گئی ہے، جہاں آپ ﷺ نے فرمایا کہ

میرے لیے زمین سمیٹ دی گئی ہے، مطلب یہ کہ آپ زمین کی طرف نہیں جائیں گے بلکہ زمین آپ کی طرف آئے گی، اگر آپ ٹھہرنے سے اکتا گئے ہیں اور کوچ کا ارادہ کر لیا ہے تو آپ جیسی ہستی کا سفر اور کوچ تو قاب قوسین تک ہوتا ہے، جس کا تذکرہ سورۃ الاسراء کی پہلی آیت میں موجود ہے، کہ پاک ذات اپنے خاص بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔

پھر اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ دوں گا، میں آپ کی امت کے فقرأ کو آپ کی امت کے امیروں پر ترجیح دوں گا، پھر امیروں کو قربانیاں کرنے کا حکم دوں گا تاکہ وہ اپنی قربانیوں کو سواریاں بنائیں، جب فقیر سواریوں کے بغیر باقی رہ جائیں گے تو میں جنت کو ان کی طرف لے کر آؤں گا، جیسے سورۃ الشعراء ۹۰ میں فرمان الٰہی ہے کہ جنت اہل تقویٰ کے قریب کر دی جائے گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ اے محمد! دنیا کا میلا پن صاف نہیں ہو گا، نہ ہی اس کی مشقتیں اور نہ ہی اس کی نعمتیں ہمیشہ رہیں گی، اس لیے آپ کو ثرکی وجہ سے خوش ہو جایئے، بے وقوفوں کی بے وقوفی کے باعث مشقت برداشت کیجیے، جب انہوں نے آپ سے کہا کہ ہمارے معبودوں کی پوجا کرو تاکہ ہم تمہارے معبود کی پوجا کریں، جب آپ ﷺ نے ان سے برأت کا اظہار فرمایا اور آپ کا دل تنگ ان کی طرف سے تنگ ہوا تو اللہ نے آپ ﷺ کو خوشخبری سنادی کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح۔

جب آپ ﷺ خوش ہو گئے تو کوچ کوچ کی آوازیں آنے لگیں، کیونکہ مشن کی تکمیل کے بعد رختِ سفر باندھنا ہی پڑتا ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ سے بخشش طلب کرے، موسم ربیع کی بھوک سے غم گین ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے بعد موسم خریف کی وسعت بھی آنے

والی ہے، اسی طرح موسم خریف کی مالداری کے باعث فخر وغرور بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد موسم شتاء کی شدت بھی تو آنے والی ہے، اسی لیے مشن مکمل کرنے کے بعد واپسی کی راہ ہی لینا ہوتی ہے۔

سورۃ الکافرون کی آخری آیت میں تھا کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین تو بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوئے کہ میرے پروردگار! اس پر میری جزا کیا ہے؟ تو اللہ نے فرمایا میری مدد اور نصرت ہی اس کی جزا اور صلہ ہے اور جب پوچھا کہ میرے چچا کی کیا سزا ہے جس نے مجھے بت پرستی کی دعوت دی تھی تو اس کے بارے میں بارگاہ الٰہی سے جواب آیا کہ اس کے مقدر میں ہلاکت، تباہی اور بربادی ہے، جس کا ساتھ ہی بعد والی سورت میں تذکرہ ہے۔

پانچویں بات یہ ہے سورۃ الکافرون میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا بلکہ لفظ "ما "استعمال کیا گیا، گویا کہ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا نام اس لیے ذکر نہیں کروں گا کہ کہیں یہ لوگ اس کی تخفیف کر کے اپنی سزا میں اضافہ نہ کروالیں جب کہ سورۃ النصر میں اللہ کے بڑے نام کا ذکر ہے کیونکہ یہ دوستوں پر اتاری گئی ہے، تاکہ اس کی تلاوت کے ساتھ ان کے ثواب میں اضافہ ہو، گویا اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ میرا نام کافروں کے ساتھ ذکر نہ کر کہ کہیں وہ اس کی توہین نہ کر دیں، ہاں میرا نام میرے ولیوں میں ذکر کر کہ وہ اس کی عزت اور احترام بجالائیں۔

چھٹی بات یہ ہے، اہل نحو کہتے ہیں کہ " إِذَا " سبح کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر عبارت کی یوں ہو گی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ، جب اللہ کی مدد آجائے تو اس کے بعد اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے، گویا کہ اللہ یہ فرمارہے ہیں کہ میں نے وقت کو ظرف بنادیا ہے جب آپ اس کا ارادہ کریں گے تو وہی نصرت، فتح اور کامیابی ہو گی، اور میں نے اس ظرف کو ان چیزوں سے بھر دیا ہے، اس ظرف کو میں نے آپ کی طرف بھیجا ہے آپ اسے میری طرف خالی نہ لوٹائیے، بلکہ اسے عبودیت وبندگی سے بھر دیجیے تاکہ تَهَادُوْا تَحَابُّوْا (ایک دوسرے کو ہدیہ دو تاکہ محبت پیدا ہو) کا

معنیٰ ثابت ہو جائے۔

گویا کہ نبی کریم ﷺ نے عرض کیا کہ میں آپ کے بھیجے ہوئے ظرف کو کس چیز کے ساتھ بھروں میں تو فقیر آدمی ہوں، تو اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو پھر بھی زبان میں تسبیح، تحمید اور استغفار کی تحریک کیجیے، ان تسبیحات سے زبان ہلایئے، جب نبی کریم ﷺ نے ایسا کیا تو پھر تَهَادُوْا تَحَابُّوْا کا معنیٰ متحقق ہو گیا تو یقیناً محبت حاصل ہو گئی، اس لیے حضرت محمد ﷺ اللہ کے حبیب ہیں۔ (کبیر)

ساتویں بات یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ جب آپ کے پاس نصرت اور فتح آجائے اور لوگ آپ کے دین میں داخل ہو جائیں تو پھر بھی آپ تسبیح، تحمید اور استغفار میں مشغول رہیے، کیونکہ جب تم شکر گزار رہو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا (ابراہیم ۷) تو آپ کی ان نیکیوں میں مشغولی دنیا اور آخرت میں آپ کے درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے، یوں آپ برابر ترقی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ میرے فرمان کے مطابق وعدہ انا اعطینا ک الکوثر پورا ہو جائے گا۔

آٹھویں بات یہ ہے کہ ایمان دو چیزوں سے مکمل ہوتا ہے، نفی، اثبات اور برأت وولایت کے ساتھ، نفی اور برأت کا ذکر لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں ہے اور اثبات وولایت کا ذکر إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ میں ہے۔ تفسیر کبیر)

نصرت اور فتح: سورۃ النصر میں نصر اللہ اور فتح دو چیزوں کا ذکر ہے، امام رازی رحمۃ اللہ نے ان کا مفہوم واضح کرنے کے لیے سوال وجواب کا طریقہ اختیار فرمایا ہے، ان دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نصر (نصرت) اس مدد اور اعانت کو کہا جاتا ہے جو مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے کی جائے، اور فتح اس مطلوب کا حاصل ہونا ہے جو متعلق تھا، ظاہر ہے کہ نصرت فتح کے لیے سبب کی طرح ہوئی، اسی لیے سورۃ کی ابتدا نصر سے کی اور فتح کا اس پر عطف کیا۔

دوسرا یہ کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یوں کہا جائے نصرت دین کا کمال ہے اور فتح دنیوی اقبال وبلندی کا نام ہے جو تمام نعمت ہے، اس کی نظیر سورۃ المائدہ میں ہے، جیسے ارشاد ہے اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ

دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (الْمَائِدَة: ۳) آج ہم نے آپ کے لیے آپ کا دین مکمل کر دیا اور آپ پر اپنی نعمت تام کر دی۔

تیسرا یہ کہ نصرت دنیوی آرزوؤں کی کامیابی ہے، جب کہ فتح جنت مل جانے پر کامیابی کا نام ہے جیسے قرآن میں جنت کے بارے میں ہے وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا (الزُّمَر: ۷۳) اور اس کے دروازے کھول دیے گئے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب سے ظاہر قول اس میں یہ ہے کہ نصر و نصرت قریش یا سارے عرب پر غالب ہونا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

فتح الفتوح: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے اور یہ وہ فتح ہے جسے فتح الفتوح کہا جاتا ہے۔ سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں، اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آ گیا، دفعتہ وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے اعلانیہ ان کو مدد دی تھی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنو بکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضروری ہے لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا، غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتہً یہ صدا بلند ہوئی

لَا هُمَّ إِنِّي نَاشِدٌ مُحَمَّدًا ... حِلْفَ أَبِينَا وَأَبِيهِ الْأَتْلَدَا

فَانْصُرْ رَسُولَ اللهِ نَصْرًا أَعْتَدَا ... وَادْعُ عِبَادَ اللهِ يَأْتُوا مَدَدَا

اے خدا! میں محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا، اے پیغمبر خدا! ہماری اعانت کر اور اللہ کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لیے حاضر ہوں گے۔ (تاریخ طبری ۳ص ۴۵)

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا پیشرو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے، آنحضرت ﷺ نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا، تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

① مقتولوں کا خون بہا دیا جائے ② قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔ ③ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرط بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی، انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرالائیں۔

ابوسفیان نے مدینہ آکر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابو بکر و عمر کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، امام حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا، جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل بالآخر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایماء سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا کہ یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک معزز صحابی تھے، انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ (اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب رضی اللہ عنہ کے اِفشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے تاب ہوگئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو ان کی گردن اڑادوں؟ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی، ارشاد ہوا عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ ممکن ہے کہ اللہ نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مؤاخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے عزیز واقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا اس لیے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو کوکبۂ نبوی نہایت عظمت وشان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے، مر الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لیے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمہ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا، حضرت عمر جذبہ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آکر عرض کیا کہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا، حضرت عباس نے کہا، عمر! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے، حضرت عمر نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں

آپ جس دن اسلام لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعویدار تھی، اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال اور آنحضرت ﷺ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے

رسول اللہ ﷺ: کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان: کوئی اور اللہ ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔

رسول اللہ ﷺ: کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟

ابوسفیان: اس میں تو ذرا شبہ ہے

بہر حال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مؤرخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے، چنانچہ غزوہ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑی کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں، کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں، سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، سعد بن ہذیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو جاتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون لشکر ہے؟ حضرت

عباس رضی اللہ عنہما نے نام بتایا، دفعتہً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لیے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے، یَا أَبَا سُفْیَانَ، الْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ، الْیَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْکَعْبَةُ (بخاری) آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا، حضرت زبیر بن العوام علمبردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے؟ ارشاد ہوا کہ عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے، یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے، مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے، حضرت خالد کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کو امن دیا جائے گا، تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالد کی فوج پر تیر برسائے چنانچہ تین صاحب (یعنی حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت حبیش بن اشعر اور حضرت سلمہ بن المیلا) نے شہادت پائی، حضرت خالد نے مجبور ہو کر حملہ کیا، یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، آنحضرت ﷺ نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو خالد سے باز پرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا، ابو طالب (آنحضرت ﷺ کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے اس لیے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں؟ اس لیے مقام خیف میں ٹھہروں گا یہاں قریش نے ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا۔

اللہ کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا اس کے آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے، آنحضرت ﷺ ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ) اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیے جائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جاکر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹادیں، حرم ان آلائشوں سے پاک ہوچکا تو آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا، آپ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی، بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز ادا نہیں کی۔ (سیرت النبی جلد اول)

خطبہ فتح: شاہنشاہیٔ اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبہ سلطنت یعنی بارگاہ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ ﷺ نے ادا کی، جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا،

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، أَلَا كُلُّ مَأْثُرَةٍ أَوْ دَمٍ أَوْ مَالٍ يُدَّعَى فَهُوَ مَوْضُوعٌ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ إِلَّا سِدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ، أَلَا وَقَتِيلُ الْخَطَأِ شِبْهِ الْعَمْدِ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا فَفِيهِ الدِّيَةُ مُغَلَّظَةً مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ، أَرْبَعُونَ مِنْهَا فِي بُطُونِهَا أَوْلَادُهَا، يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ إِنَّ اللهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْآبَاءِ، النَّاسُ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ (سیرت النبی)

ایک اللہ کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اس نے اپنے بندہ کی مدد کی، اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر تمام انتقامات خون بہائے قدیم، تمام خون بہا، سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں، اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹادیا، تمام لوگ آدم کی نسل

سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔ پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى، وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ (ابن ہشام) إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الخَمْرِ (بخاری)

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ، لیکن اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، اللہ دانا اور واقف کار ہے، اللہ نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب: علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عرب کا دستور تھا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پاجاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہو تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے، اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی اباً عن جد چلا آتا تھا، یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی، اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لیے آیا تھا، اور اس بنا پر آپ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور نیز تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرق مراتب قائم کیے گئے تھے، جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔

اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا مساوات عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب و عجم، شریف و رذیل، شاہ و گدا، سب برابر ہیں، ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا

ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

خطبہ کے بعد آپ ﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بھی بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر جو ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے۔

ارشاد ہوا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ، تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔ کفار مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ ﷺ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے ان کی آتش غیرت پھر مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا اللہ نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا، ایک اور سردار قریش نے کہا اب جینا بے کار ہے۔

مقام صفا میں آپ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ تھا کہ

ان سے ارکان اسلام اور محاسن اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت ﷺ دست مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے، آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی، یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی، حضرت حمزہ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی، وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے) باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں رسول اللہ ﷺ: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔

ہند: یہ اقرار آپ ﷺ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔

رسول اللہ ﷺ: چوری نہ کرنا

ہند: میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟

رسول اللہ ﷺ: اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہند: رَبَّيْنَا هُمْ صِغَاراً وَقَتَلْتُم كِبَاراً فَأَنْتَ وَهُم أَعْلَمُ ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگ بدر میں آپ نے ان کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ رئیس عرب مکہ سے جلا وطن ہو جاتا ہے، آپ نے علامت امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے، حنین کے معرکہ تک اسلام نہیں لائے (بعد کو مسلمان ہو گئے)

عبداللہ بن زبعری عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت ﷺ کی ہجو میں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گیا لیکن پھر آکر اسلام لائے۔

ابو جہل کا بیٹا عکرمہ یمن چلا گیا لیکن اس کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت ﷺ سے امان لے لی اور جا کر یمن سے لائیں، یہ واقعہ ابو جہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہ کہتے ہیں۔ (سیرت النبی ج اول)

اِشتہاریانِ قتل: علامہ شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس اشخاص کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبد اللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کیے گئے، لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپ کہ ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جرم میں قتل کی گئی کہ وہ آپ ﷺ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔ (سیرت النبی جلد اول)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں واقعہ فتح مکہ نقل کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ مفسرین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک اس سورت میں فتح مکہ ہی مراد ہے، کیونکہ یہاں فتح مکہ کے ساتھ نصرت کا بھی ذکر آیا ہے، حالانکہ بدر میں بھی نصرت ہوئی مگر وہاں فتح کا ذکر نہیں ہے، جب کہ بنو نضیر کی جلا وطنی میں فتح کا ذکر ہے مگر نصرت کا وہاں ذکر نہیں ہے، جب کہ فتح مکہ میں فتح اور نصرت دونوں کا اکٹھا ذکر ہے۔

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا: اور آپ لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ مفسر قرآن امام قرطبی علیہ السلام اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہاں الناس کا مصداق عربوں کو لیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اور آپ لوگوں کو دیکھیں یعنی عربوں کو کہ حضور علیہ السلام کی بعثت پہلے انہیں کی طرف تھی اور جب وہ دین میں داخل ہو گئے تو دوسرے لوگ جہاد، دلائل کی قوت اور نفس و شیطان کے مکر دور کرنے کے ساتھ اس دین میں داخل ہوں گے ورنہ ان کا داخل ہونا ناقص رہے گا۔ (تفسیر عزیزی)

یہاں الناس کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سارے لوگ ہی دین اسلام میں داخل ہو جائیں

گے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، سارے لوگ دین اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی ہوں گے، اس اشکال کا جواب امام رازی نے بہت احسن پیرائے میں دیا ہے کہ مقصود انسانیت اور عقل ہے جو کہ دین اور اطاعت کا نام ہے، جیسے اللہ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ ہم نے جن وانسان کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، تو جو شخص دین سے منہ پھیرے گا، روگردانی اور اعراض کرے گا وہ کفر پر رہ جائے گا، تو جو کفر پر رہے گا وہ گویا کہ الناس میں داخل وشامل ہی نہیں، یہی معنیٰ یہاں مراد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کے بارے میں سورۃ الاعراف ۱۷۹ میں فرمایا کہ یہ تو جانور ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں، اور جب لوگوں کو دعوت ایمان دی جاتی تھی تو واضح طور پر کہا جاتا تھا کہ تم لوگ ایمان لاؤ جیسے الناس یعنی لوگ ایمان لائے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ یہاں الناس سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب باب علم علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لخت جگر نے یوں دیا کہ نَحْنُ النَّاسُ، وَأَشْيَاعُنَا أَشْبَاهُ النَّاسِ، وَأَعْدَاؤُنَا النَّسْنَاسُ لوگ ہم ہیں اور ہمارے جیسے لوگوں کے مشابہ جو ہیں وہ لوگ ہیں اور ہمارے دشمن نسناس (بندر، ذلیل، کمینے، گھٹیا، ایک جانور جس کی ایک آنکھ ہوتی ہے) ہیں۔

یہی جملہ اپنے فرزند، دلبند، ارجمند حسن کی زبان سے سن کر باب العلم مولا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ لیا اور فرمایا کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اس نے اپنا پیغام کہاں رکھنا ہوتا ہے۔ (تفسیر الکبیر)

اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ یہ لوگ تو بڑی کوتاہیوں کے بعد بڑی مدت بعد اسلام میں داخل ہوئے تو وہ اس عظیم تعریف وستائش کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب امام رازی رحمہ اللہ یوں دیتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اور بڑی مہربانی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جب بندہ لمبی عمر میں کفر ومعصیت کے بعد ایمان قبول کرتا ہے تو اللہ اس کے ایمان کو قبول فرمالیتے ہیں اور یوں اس کی مدح وستائش کرتے ہیں، جیسے روایت ہے کہ فرشتے اس جیسے انسان کے لیے یوں کہتے ہیں أَتَيْتَ وَإِنْ كُنْتَ قَدْ أَبَيْتَ، تو آہی گیا ہے اگرچہ تو انکار کیا کرتا تھا۔

اورآنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لَلّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ أَحَدِكُمْ مِنَ الضَّالِّ الْوَاجِدِ، وَالظَّمْآنِ الْوَارِدِ البتہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کی توبہ کے ساتھ اس شخص سے بھی بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں جو اپنی گم شدہ چیز کو پالیتا ہے اور گھاٹ پر آنے والے پیاسے سے بھی زیادہ۔

گویارب العالمین یوں فرمارہے ہیں کہ میں نے اس کی ستر سال تک پرورش کی ہے، اگر یہ اسی حالت کفر میں مر جائے گا تو میں اسے لازماً دوزخ میں لے جاؤں گا، تو اس کو دوزخ میں ڈالنے کی صورت میں میرے وہ ستر سالہ احسانات جو اس پر کیے تھے وہ ضائع ہو جائیں گے تو جب بھی مدت کفر اور مدت عصیان بڑھے گی توں ہی توبہ زیادہ قبول ہو گی۔ (الکبیر

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں افواجاً سے مراد جماعتیں ہیں یعنی ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت، اس کی وجہ یہ بنی کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو عربوں نے کہا جب حضرت محمد ﷺ نے اہل حرم پر فتح حاصل کرلی ہے تو تمہارے اندر ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت وطاقت نہیں تو وہ جماعت در جماعت اسلام قبول کرنے لگے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں امت سے مراد چالیس آدمی ہیں، حضرت عکرمہ اور مقاتل فرماتے ہیں کہ یہاں الناس سے مراد اہل یمن ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یمن سے سات سو افراد مسلمان اور اطاعت شعار بن کر آئے تھے، ان میں سے بعض اذانیں دے رہے تھے، بعض قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور بعض کلمہ لا الہ الا اللہ کا ورد کر رہے تھے، نبی کریم ﷺ یہ منظر دیکھ کر خوش ہوئے اور حضرت عمر اور ابن عباس رونے لگے، عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اذا جآء نصر اللہ والفتح کی تلاوت کی اور فرمایا وَجَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ رَقِيقَةٌ أَفْئِدَتُهُمْ، لَيِّنَةٌ طِبَاعُهُمْ، سَخِيَّةٌ قُلُوبُهُمْ، عَظِيمَةٌ خَشْيَتُهُمْ، فَدَخَلُوا فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا یمن والے آگئے ہیں، ان کے دل نرم ہیں، ان کی طبیعتیں ملائم ہیں، دلوں کے سخی ہیں، خوف وخشیت میں زیادہ ہیں، وہ جماعت در جماعت اللہ کے دین میں داخل ہوں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ، هُمْ

أَضْعَفُ قُلُوبًا، وَأَرَقُّ أَفْئِدَةً الْفِقْهُ يَمَانٍ، وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ (صحیح مسلم) تمہارے پاس یمن والے آئے ہیں، وہ دلوں کے کمزور اور رقیق ہیں، فقہ یمانی ہے اور حکمت بھی یمانی ہے۔ ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وَأَجِدُ نَفَسَ رَبِّكُمْ مِنْ قِبَلِ الْيَمَنِ (مسند احمد، الاحاد والمثانی) اس ارشاد کے دو معانی ہو سکتے ہیں ① نفس سے مراد کشادگی ہے کیونکہ وہ جماعت در جماعت اسلام میں داخل ہوں گے۔ ② اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے اہل یمن کے ذریعے مصیبت کو دور کر دیا وہ انصار ہیں۔

علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا إِنَّ النَّاسَ دَخَلُوا فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا، وَسَيَخْرُجُونَ مِنْهُ أَفْوَاجًا، لوگ اللہ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہوئے، یہ عنقریب جماعت در جماعت نکلیں گے۔

دین اسلام: یہاں دین اللہ فرمایا کہ اللہ کا دین، اسلام کی عظمت کو چار چاند لگانے کے لیے یہ الفاظ کس قدر جاندار اور شاندار ہیں، دین کی اضافت اور نسبت اللہ کی طرف ہوئی ہے، نسبت واضافت سے ہی کسی چیز کی حیثیت بدلتی ہے، جب دین کی اضافت اللہ کی طرف ہو گئی تو یہ دین سارے ادیانِ عالم سے ممتاز ہو گیا، اس کو ممتاز کرنے والی چیز اللہ کی نسبت ہے۔

دین اللہ ہی کے بارے میں دوسرے مقام پر اللہ نے گواہی دے دی کہ اللہ کے نزدیک سچا اور کھرا دین دینِ اسلام ہی ہے جیسے ارشاد ہے إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ (آلِ عمرٰن: ۱۹) بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اسی دین اللہ، دین اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آلِ عمرٰن: ۸۵) جو شخص دین اسلام کے علاوہ کسی دین کو تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

دین اسلام کے مختلف نام: اگر قرآنی تعلیمات وارشادات پر غور کیا جائے، گہری نظر ڈالی جائے، باریک بینی سے قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو اسی دین اللہ، دین اسلام کے مختلف نام قرآن کریم

میں استعمال کیے گئے ہیں، ناموں کی کثرت اس چیز کی عظمت ورفعت پر دلالت کرتی ہے۔

اسی دین اللہ کو قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ (الذّٰرِيَات: ۳۵، ۳۶) سو ان میں جتنے ایمان والے تھے انہیں ہم نے نکال دیا، سو اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

ایک مقام پر دین اسلام کو صراط اللہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا، ارشاد ہے صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (الشُّورٰی: ۵۳) یہ اللہ کا راستہ ہے وہ ذات کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ اسی دین اللہ اور دین اسلام کو دوسرے مقام پر کلمۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے کلمۃ اللہ ہی بلند رہے گا۔ اسی دین اللہ اور دین اسلام کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے لِيُطْفِؤُا نُورَ اللّٰهِ (الصّٰفّ: ۸) یہ کافر لوگ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔

اسی دین اللہ، دین اسلام کو ھدیٰ (ہدایت) سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ (الأنعام: ۸۸) اللہ اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

یہی وہ دین اللہ ہے، یہی وہ دین اسلام ہے جسے قرآن کریم میں مضبوط عروہ (کڑا) قرار دیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَإِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (لُقْمَان: ۲۲) اور جو شخص اپنی ذات کو اللہ کا فرمانبردار بنا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے مضبوط کڑے کو اچھی طرح سے پکڑ لیا، اور اللہ ہی کی طرف کاموں کا انجام ہے۔

اسی دین اللہ اور دین اسلام کو حبل اللہ سے تعبیر کیا گیا، کہ یہ اللہ کی رسی ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ (آلِ عِمْرَان: ۱۰۳) اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اسی دین اللہ اور دین اسلام کو صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی دین اللہ کو دوسرے مقام پر فطرۃ اللہ کہا گیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دین اللہ کہتے ہوئے اپنا اسم اعظم اللہ استعمال فرمایا ہے، کوئی دوسرا اصفاتی نام استعمال نہیں کیا ہے، نہ دین الرب کہا، نہ دین الرحمان کہا، نہ دین الرحیم کہا، نہ دین الرشید کہا، نہ دین

الجبار کہا، نہ دین القہار کہا، نہ دین الرزاق فرمایا، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، مشہور ننانوے نام ہیں، ان میں سے کوئی بھی یہاں استعمال نہیں فرمایا، حالانکہ مختلف مقامات پر جگہ جگہ قرآن کریم میں اللہ کے صفاتی نام موجود ہیں، مگر یہاں صرف دین اللہ فرمایا، اللہ اس ذات عالی، واجب الوجود کا ذاتی نام ہے، جس کے بارے میں ادلہ موجود ہیں کہ یہ اسم اعظم ہے۔

دین اللہ میں اللہ نے اپنا ذاتی نام اس لیے استعمال فرمایا کہ یہ تمام ناموں میں بڑا نام ہے، اس کی دلالت اللہ کی ذات اور صفات پر ہے، گویا کہ وہ ذات یہ فرمارہی ہے کہ یہ دین اللہ کا ہے اس کا قبول کرنا ضروری ہے۔

اگر دین اللہ کی بجائے دین الرب فرماتے تو اس سے یہ بات سمجھی جاتی کہ اس دین کو قبول کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس ذات نے تمہاری پرورش کی ہے، اس پرورش کے نتیجے میں اس دین کو قبول کرنا لازم ہے، اس نے چونکہ تم پر احسان کیا ہے تو اس وقت تمہاری اطاعت و فرمانبردای نفع حاصل کرنے کے لیے علت و سبب ہو گی، تو اس صورت میں اخلاص حاصل نہ ہوتا، گویا کہ وہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اخلاص سے خدمت کرو، محض اس لیے کہ میں ہی معبود ہوں، کسی منفعت کی خاطر خدمت نہ کرو جو تمہاری طرف لوٹے گی۔

فوج: بڑی جماعت کو کہا جاتا ہے، پورے کے پورے قبیلے داخل ہوں گے، اگرچہ پہلے ایک ایک دو دو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، مگر فتح مکہ کے بعد دین اسلام کی کرنیں دور دور تک پھیلیں، اطراف واکناف میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا، کچھ عرصہ بعد رحمت کائنات ﷺ خلد بریں کی طرف روانہ ہوئے، ان کے خلفائے راشدین نے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہو کر اسلامی فتوحات کے لیے پیش قدمی کی، دور دور تک اسلام پھیلا، مختلف علاقے اسلام کے زیر نگیں آئے، پہلے گنے چنے لوگ مسلمان تھے، پھر درجنوں لوگ مسلمان ہوئے، پھر سینکڑوں لوگ دائرہ اسلام میں آئے، حجۃ الوداع کے موقع پر کوئی سوا لاکھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پرچم تلے عرفات کے میدان میں جبل رحمت کے

دامن میں موجود تھے، پھر اسلام کی شان وشوکت بڑھی، آج ڈیڑھ ارب کے قریب مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور دنیا کے مختلف ممالک میں مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا: سو آپ اپنے رب کی تسبیح بیان کیجئے جس کے ساتھ حمد بھی ہو اور اس سے مغفرت طلب کیجئے بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو یہاں پر تین احکامات دیے، ایک یہ کہ آپ ﷺ تسبیح کریں، دوسرا اپنے پروردگار کی حمد کریں، تیسرا اپنے پروردگار سے بخشش طلب کریں۔

سبح یہ باب تفعیل امر کا صیغہ ہے، تسبیح کا معنیٰ سبحان اللہ کہنا، اللہ کی پاکی بیان کرنا، اس کا اصل سَبَحَ سے ہے، سَبَحَ کا معنیٰ ہے تیرنا، تیرنے والا پانی میں اس طرح تیرتا ہے جس طرح ہوا میں پرندہ اڑتا ہے، وہ اپنے کو ڈوبنے سے بچاتا ہے کہ کہیں وہ ہلاکت کے منہ میں نہ چلا جائے، وہ اپنے کو بچاتا ہے کہ کہیں پانی کی تہہ میں نہ اتر جائے، یہاں تشدید تبعید کے لیے ہے، کہ آپ اللہ کی تسبیح بیان کیجیے یعنی جو باتیں اس کی شایان شان نہیں ہیں وہ اس سے دور کیجیے، جو چیزیں اس کے لیے جائز نہیں ہیں انہیں اس سے دور رکھیے۔

نفی اور اثبات کسی بھی صورت میں جو چیزیں اس کی شایان شان نہیں ہیں ان سے اس کی پاکی بیان کیجیے، کیونکہ جس طرح مچھلی نجاست وگندگی قبول نہیں کرتی اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ ایسی باتیں اور ایسی چیزیں قبول نہیں کرتے جو ان کی شان کے مناسب نہ ہوں، تو لفظ سبحان وتسبیح ذات وصفات اور افعال میں اس کی پاکی بیان کرنے میں مفید ہے۔

ارباب تفسیر نے تسبیح سے مراد نماز ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ نماز کے لیے آیا ہے، جیسے ارشاد ہے فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ (الرُّوم: ۱۷) لہٰذا اللہ کی تسبیح کرو اس وقت بھی جب تمہارے پاس شام آتی ہے، اور اس وقت بھی جب تم پر صبح طلوع ہوتی ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ (طٰہٰ: ۱۳۰) اور سورج کے نکلنے اور سورج چھپنے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح میں مشغول رہیے۔

چونکہ یہ سورت اخیر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے اور آپ ﷺ اپنی مرض الوفات میں جو سب سے زیادہ تاکیدی باتیں ارشاد فرمارہے تھے ان میں ایک نماز کا ذکر تھا اور دوسرا اپنے ماتحتوں کا خیال رکھنے کی تلقین تھی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز شکرانہ ہے، آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن آٹھ رکعتیں شکرانہ ادا کیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد چاشت کی نماز ہے، بعض کہتے ہیں آپ ﷺ نے جو آٹھ رکعتیں پڑھیں ان میں چار تو چاشت کی تھیں اور چار شکرانہ کی، یہاں نماز کے لیے تسبیح کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ نماز اور تسبیح دونوں ہی چیزیں لازم وملزوم ہیں، اس میں بندگانِ خدا کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں اللہ کی ذات وصفات اور افعال میں پاکی بیان کریں۔

حضرت نبی کریم ﷺ تاج نبوت سر پر سجانے کے بعد مکہ میں آزمائشوں سے دوچار رہے، سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، آپ کی برادری، خاندان اور اہل علاقہ نے آپ ﷺ کے لیے سخت پریشان کن حالات پیدا کر رکھے تھے، مکہ والوں کی طرف سے کی جانے والی سازشیں اور اسلام اور پیغمبر اسلام کو پہنچائے جانے والے نقصان کی وجہ سے آپ ﷺ کے قلب اطہر پر سخت بوجھ تھا، کہ حق وصداقت کا پھریرا اور پرچم لہرانے کے باوجود فتح ونصرت کب آئے گی، پیغام رسالت سچا ہے تو پھر یہ کفار اس طرح کیوں مسلط ہیں اور پریشانیاں کیوں کھڑی کر رہے ہیں۔

انسانی دل ودماغ میں کہیں اگر کوئی اس طرح کا خیال جنم لے رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے تسبیح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ قلب نبوی پر گزرنے والے اس طرح کے خیال کی وجہ سے معذرت ہو جائے۔

جہاں تک لفظ سبح اور تسبیح کا مفہوم اور مطلب ہے کہ تنزیہ اور پاکی بیان کرنا تو اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ حالات جیسے کیسے بھی آئیں، اللہ کی پاکی بیان کرنا چاہیے کیونکہ نبی کریم ﷺ جو دعوت دے رہے ہیں، جو پیغام عام کر رہے ہیں یہ سب مشیت ایزدی کا تقاضا ہے، اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں ہے کہ اس نے یوں کرنا ہی کرنا ہے۔

پھر جب انسان اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور پاکی بیان کرنے سے فارغ ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار کی حمد وثناء میں مشغول ہو جائے، یہ مشغولیت رب تعالیٰ کے احسانات اور کرم فرمائیوں کے شکرانے میں ہو گی، پھر اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کے ازالہ کے لیے توبہ اور استغفار کی ضرورت ہے کہ اپنی بخشش کی طرف توجہ دی جائے۔

یہاں تسبیح، تحمید اور استغفار کی طرف راہنمائی اس لیے کی گئی تاکہ انسان ملائکہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرے، کیونکہ ملائکہ کے بارے میں قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیرے لیے پاکی اختیار کرتے ہیں، تو یہاں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم اشارہ ہے ملائکہ کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے کا، کیونکہ فرشتے کہتے ہیں ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

واستغفرہ میں یہاں فرشتوں کے اس قول کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کا اشارہ ہے جس میں فرشتوں نے کہا کہ ہم تیری رضاجوئی کے لیے اپنے کو پاک کرتے ہیں تو یہاں استغفار کا حکم دیا جارہا ہے جو فرشتوں والے قول کے معنیٰ میں ہی ہے، مطلب اور مفہوم اس کا یہی ہے کہ اپنے کو پاک صاف کرنا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں نے اپنے لیے دعویٰ کیا کہ وہ میری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں، ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنی طرف سے کیا، رہے آپ تو آپ میری حمد کے ساتھ تسبیح بیان کریں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ آپ کی طرف سے استغفار کرنا یہ اطاعت اور نیکی آپ کی طرف سے ہے بلکہ اس بات کا خیال لازمی رکھیں کہ یہ استغفار میری توفیق اور میرے احسان کی وجہ سے کررہے ہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یوں کہا جائے کہ فرشتوں نے جیسے اپنے حق میں کہا کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیرے لیے تقدیس اختیار کرتے ہیں تو اللہ نے فرشتوں کے حق میں یہ بات کہی کہ وہ اہل ایمان کے لیے بھی استغفار کرتے ہیں (غافر ۷) تو اے محمد ﷺ آپ ان لوگوں کے لیے استغفار کریں جو فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے، جس طرح ملائکہ اہل ایمان کے لیے استغفار

کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں کو بخش دیجیے جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے کی پیروی کی۔ (غافر)

تسبیح کا ایک معنیٰ تطہیر بھی ہے یعنی پاک کرنا، تو یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ کعبہ کو بتوں سے پاک کیجیے اور انہیں توڑ ڈالیے، اور اس کے بعد آپ کے لیے مناسب یہی ہے کہ اپنے اس اقدام پر اپنے رب کی حمد استغفار اور اس کی قوت و اعانت کے ذریعے کریں، جب آپ ایسا کر لیں تو یہ مناسب نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے نیکی خیال کریں بلکہ ضروری ہے اپنی کوتاہی کا اظہار کریں اور اللہ کی اطاعت میں کوتاہی و تقصیر کے اعتراف کے ساتھ استغفار کیجیے۔

رحمت کائنات ﷺ کا اس سورت کے نزول کے بعد اکثر و بیشتر معمول یہ تھا کہ وہ سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ کلمات کو پڑھتے رہتے تھے، رکوع میں بہت زیادہ تسبیح کرتے تھے، اللہ کی تعریف کرتے تھے، اللہ سے بخشش طلب کرتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر عمر میں تو نبی کریم ﷺ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ پڑھا کرتے تھے، میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ بہت زیادہ پڑھتے ہیں اس کی وجہ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے یہی حکم دیا گیا ہے، پھر آپ ﷺ نے سورۃ النصر کی یہ ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب سے یہ سورۃ نازل ہوئی آپ ﷺ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ کلمات کو بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ میں ہر روز سو بار استغفار کرتا ہوں۔

علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ ﷺ ساٹھ دن تک حیات رہے اور پابندی سے تسبیح اور استغفار کرتے رہے، حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آپ ﷺ اسی دن تک زندہ رہے پھر آیت الکلالہ نازل ہوئی، اس کے بعد آپ پچاس دن تک زندہ رہے، پھر سورۃ توبہ کی آیت ۱۲۸ نازل ہوئی، پھر اس کے بعد پینتیس دن زندہ رہے پھر سورۃ البقرہ کی

آیت ۲۸۱ نازل ہوئی اس کے بعد آپ گیارہ دن زندہ رہے، دوسری روایت میں ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ سات دن تک اس دنیا میں بقید حیات رہے۔

إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا: وہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ ہمیشہ توبہ قبول کرنے والا ہے، وہ کسی کسب و حادثہ کی صورت میں تواب نہیں ہوا، پھر تواب کا لفظ تکثیر پر دلالت کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کے بعد پھر توبہ کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے، ایک بار توبہ کے بعد پھر گناہ ہو جائے، پھر کوئی نافرمانی کا کام ہو جائے پھر دوبارہ سے توبہ کرے، سہ بارہ توبہ کرے، اس سے زیادہ بار توبہ کرے تو وہ ایسا تواب ہے جو توبہ قبول کرتا ہے۔

تواب کا ایک معنٰی بار بار لوٹانے والا، کہ وہ بندوں کو معاصی، گناہوں اور نافرمانیوں سے بار بار لوٹاتا اور دھکیلتا ہے کہ جاؤ جا کر توبہ کرو، وہ انہیں بار بار توبہ کی توفیق عطا کرتا ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

اہل سنت والجماعت کے نزدیک تمام انبیاء کرام معصوم ہیں، ان سے ماں کے پیٹ سے لے کر قبر کے پیٹ میں جانے تک کوئی چھوٹا بڑا گناہ نہیں ہوتا، عصمت ایک ایسی خصلت ہے جو معصوم کو گناہ کرنے پر قدرت کے باوجود گناہ سے روکتی ہے، معصوم گناہ چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اقوال ہوں یا افعال، عبادات ہوں یا عادات، معاملات و مقامات ہوں یا اخلاق و احوال، ان سب کو اللہ اپنی قدرت کاملہ سے نفس و شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ فرماتا ہے خواہ وہ خطاء و نسیان کی صورت سے ہی کیوں نہ ہو اور حفاظت و نگرانی کرنے والے اپنے فرشتے ان کے ساتھ رکھتا ہے تاکہ غبار بشریت بھی ان کے دامن پاک پر ذرا سا دھبہ نہ لگا سکے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہر وقت بارگاہِ خداوندی میں مقیم رہتے ہیں، کسی وقت حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلال ان کی نظروں سے

او جھل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہوتے ہیں اوراولیاء اللہ بارگاہ خداوندی میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقیم نہیں، اس لیے اولیاء معاصی سے محفوظ تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں ہوتے۔

عصمت اور حفاظت میں فرق یہ ہے کہ اولیاء بسااوقات مباحات اور جائز امور کو محض حظ نفس اور طبعی میلان اور خواہش کے لیے کر گزرتے ہیں مگر حضرات انبیاء کسی وقت بھی طبعی میلان اور حظ نفس کے لیے مباح اور جائز امر کا ارتکاب نہیں فرماتے، ہاں جب کسی شئے کی عنداللہ اباحت اور اس کا خدا کے نزدیک جائز ہونا بتلانا مقصود ہوتا ہے تب اس مباح کو استعمال فرماتے ہیں تاکہ امت کو نبی کے کرنے سے اس فعل سے اس کا مباح اور جائز ہونا معلوم ہو جائے۔ (معارف القران ج، اول)

امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اَلْاَنْبِیَاءُ عَلَیْھِم الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کُلُّھم مُنَزَّھُوْنَ عَنِ الصَّغَائِرِ وَالْکَبَائِرِ وَ الْکُفْرِ وَالْقَبَائِحِ (الفقہ الاکبر ص ۲) سارے انبیاء علیہم السلام صغیرہ، کبیرہ گناہوں اور کفر اور بے ہودہ کاموں سے پاک ہیں۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلْاِجْمَاعُ عَلَی الْعِصْمَۃِ عَنِ الْکَبَائِرِ بِلاَ قَیْدِ عَمَدًا وَسَھْوًا (النبراس شرح شرح العقائد: ص ۲۸۳) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کبیرہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، وہ عمداً کرتے ہیں نہ سہواً، اسی پر اجماع ہے۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اَلاَنبیَاءُ مَعصُومُونَ عَن الخَطَاءِ وَالغَلَطِ فِی اِجتِھَادِھِم (قرطبی) انبیاء اپنے اجتہاد میں خطاء اور غلطی سے معصوم ہوتے ہیں۔

علامہ ملا علی قاری الہروی رحمہ اللہ بعض محققین سے نقل فرماتے ہیں وَإِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ عَلَى التَّأَسِّي بِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَقْوَالِهِ وَأَفْعَالِهِ وَسَائِرِ أَحْوَالِهِ حَتَّى فِي كُلِّ حَالَاتِهِ مِنْ غَيْرِ بَحْثٍ وَلَا تَفَكُّرٍ بَلْ بِمُجَرَّدِ عِلْمِهِمْ أَوْ ظَنِّهِمْ ذَلِكَ عَنْهُ دَلِيلٌ قَاطِعٌ عَلَى إِجْمَاعِهِمْ عَلَى عِصْمَتِهِ وَتَنَزُّهِهِ عَنْ أَنْ يَجْرِيَ عَلَى ظَاهِرِهِ أَوْ بَاطِنِهِ شَيْءٌ لَا يُتَأَسَّى بِهِ فِيهِ مِمَّا لَمْ يَقُمْ دَلِيلٌ عَلَى اخْتِصَاصِهِ بِهِ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۷)

صحابہ کرام کا آپ ﷺ کے اقول، افعال اور تمام احوال میں بغیر کسی بحث و تفکر کے محض یہ جانتے ہوئے کہ یہ عمل آپ ﷺ نے کیا ہے آپ کی اتباع پر متفق ہو جانا واضح دلیل ہے کہ صحابہ کا آپ کی عصمت پر اجماع ہے اور اس پر بھی کہ آپ ﷺ سے ظاہراً و باطناً ایسی کوئی چیز صادر نہیں ہو سکتی جس کی اتباع نہ کی جا سکتی ہو جب تک اس پر کوئی دلیل نہ مل جائے کہ یہ چیز آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں۔ (معارف القرآن: ج ا ص ۱۹۵)

قاضی عیاض مالکی اور محقق فقہاء و متکلمین کا موقف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس طرح کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں اسی طرح صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہیں۔

جب تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور نبی کریم ﷺ صغائر اور کبائر سے معصوم اور بخشے بخشائے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں باقی مقامات پر اور سورۃ النصر میں اس مقام پر استغفار کرنے کا حکم کیوں دیا؟ استغفار اور توبہ تو گناہوں پر کی جاتی ہے، جب کہ انبیاء علیہم السلام اور خاتم الانبیاء سب معصوم ہیں، اس پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین نے اپنی اپنی تفسیر میں علی حسب العلم جوابات دیے ہیں

① نبی کریم ﷺ کا استغفار آپ کی تسبیح کرنے کے قائم مقام ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے کہا اللہ تعالیٰ غفار ہے۔

② آپ نے استغفار اس لئے کیا کہ آپ کی امت آپ کی اقتداء کرے، کیونکہ کوئی مکلف اس خطرے سے خالی نہیں ہے کہ اس سے عبادت میں کوئی تقصیر ہو گئی ہو اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ آپ معصوم تھے اور عبادت میں بہت کوشش کرتے تھے، اس کے باوجود جب آپ ﷺ استغفار سے مستغنی نہیں ہیں تو کوئی دوسرا استغفار کرنے سے کیسے مستغنی ہو سکتا ہے۔

③ آپ ﷺ ترک افضل کی وجہ سے استغفار کرتے تھے۔

④ بندہ جو عبادت بھی کرتا ہے، جب اس عبادت کا مقابلہ اپنے رب کی نعمتوں سے کرتا ہے تو اپنی عبادت کو اس کی نعمتوں کے شکر کے مقابل میں بہت کم پاتا ہے تو اس تقصیر شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے۔

⑤ جب سالک ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اپنی پہلی عبادت کو قاصر پاتا ہے، لہٰذا اس قصور پر استغفار کرتا ہے اور اللہ کی طرف سیر کے مراتب غیر متناہی ہیں، اس لیے استغفار کے مراتب بھی غیر متناہی ہیں۔

⑥ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ آپ اپنی امت کے لیے استغفار کیجیے اور جب آپ کی امت دن بہ دن زیادہ ہو رہی ہے تو آپ کے استغفار کی بھی زیادہ ضرورت ہے، سو آپ زیادہ سے زیادہ استغفار کیجیے۔ (تفسیر کبیر)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں نبی ﷺ کے استغفار کرنے کی حسب ذیل وجوہ ہیں

① نبی کریم ﷺ دائماً ترقی کرتے رہتے تھے، جب آپ ترقی کر کے اگلے مرتبہ پر پہنچتے تو پہلے مرتبہ پر استغفار کرتے۔

② آپ ﷺ اپنے بلند مرتبہ کے اعتبار سے جس کام کو اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتے، اس پر استغفار کرتے۔

③ استغفار کا تعلق ان امور سے ہے جو آپ ﷺ سے سہواً صادر ہوئے خواہ اعلان نبوت سے پہلے۔

④ کوئی شخص بھی کماحقہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہیں کر سکتا، اس کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت ہوتی ہے وہ اتنے ہی حقوق ادا کر سکتا ہے اور عارف کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اس سے کہیں زیادہ ہیں، جتنے وہ ادا کر رہا ہے تو اس کو اپنے عمل سے حیا آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے میں تقصیر کر رہا ہے، سو اس کو جتنی زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا اتنا زیادہ خوف ہوتا ہے اور اس کو اپنے عمل سے اتنی زیادہ حیا آتی ہے اور وہ اتنا زیادہ استغفار کرتا ہے۔

⑤ یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اس لیے استغفار کرتے ہوں کہ آپ ﷺ کو اللہ سبحانہ کی عظمت اور جلال کی سب سے زیادہ معرفت ہے اور آپ ﷺ کو یہ علم ہو کہ ہر چند کہ آپ کی عبادت تمام عابدین کی عبادت سے زیادہ ہے لیکن اللہ عزوجل کی کبریائی اور اس کی عظمت اور جلال کے مقابل میں پھر بھی کم ہے اور اس کمی پر آپ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوں۔ (روح المعانی)

حودہل لفتح و دہل آج سورۃ النصر کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول و منظور فرما کر ہمارے لیے اسے دارین کی سعادت کا ذریعہ بنائے، صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۱۱ جولائی ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ بوقت گیارہ بجے شب

حروف بنی: ۲۹ نومبر ۲۰۲۰ء بروز اتوار بعد العشاء

☆☆☆☆

السورۃ

ابولہب، اُم جمیل اور ان کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ {۱} مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ {۲} سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ {۳} وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ {۴} فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ {۵} المسد.

جواب ترجمہ: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔ اس کی دولت اور اس نے جو کمائی کی تھی وہ اس کے کچھ کام نہیں آئی۔ یہ عنقریب شعلہ مارتی ہوئی بڑی آگ میں داخل ہو گا۔ اور اس کی بیوی بھی، بری عورت جو لکڑیاں لادنے والی ہے۔ اس کے گلے میں رسی ہے کھجور کی چھال کی۔

اس سورت میں نبی کریم، رحمت للعالمین ﷺ کے سگے چچا ابولہب کی تباہی، بربادی، ہلاکت، خسران اور خذلان کو بیان کیا جارہا ہے، ایسے الفاظ اس سورت میں اس بدبخت انسان کے لیے استعمال کیے گئے ہیں جو کسی اور سخت ترین کافر کے لیے قرآن کریم میں استعمال نہیں کیے گئے۔

بخاری اور مسلم میں اس سورت کا شان نزول یوں بیان کیا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ پر آیت وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ نازل ہوئی تو آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنے قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی، بعض روایات میں ہے کہ یاصباحاہ کہہ کر یا بنی عبد مناف اور یا بنی عبد المطلب وغیرہ ناموں کے ساتھ آواز دی (اس طرح آواز دینا عرب میں خطرہ کی علامت سمجھا جاتا تھا، (معارف القرآن)

سب قریش جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن (تم پر چڑھ آیا ہے اور) صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے کیا آپ لوگ میری تصدیق کرو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا ہاں ضرور تصدیق کریں گے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک عذاب شدید سے (جو شرک و کفر پر اللہ کی طرف سے مقرر ہے) یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ،

أَلِهَذَا جَمَعْتَنَا ؟ ہلاکت ہو تیرے لئے کیا تو نے ہمیں اس کے لئے جمع کیا تھا اور آپ کو مارنے کیلئے ایک پتھر اٹھالیا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (معارف القرآن)

اس سورت کا پہلا لفظ ہی سخت پیغام دیتا ہے، لفظ تبت میں بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ تبت یہ تباب سے ہے، تباب کا معنیٰ ہلاک ہونا ہے، اسی سے لفظ تابہ بھی ہے جس کا معنیٰ بڑھاپے سے ہلاک ہونے والی، سورۃ غافر میں اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ فرعونی داؤ پیچ اور مکر وفریب کے لیے استعمال فرمایا ہے کہ فرعون کے مکر وفریب سب تباہی وبربادی کا سامان ہے۔

رحمتِ دوعالم ﷺ کے زمانہ اقدس میں جب ایک دیہاتی نے رمضان المبارک کے دن میں اپنی گھر والی سے ہمبستری کرلی تھی تو اپنے لیے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا تھا، نبی کریم ﷺ کو اس بات کا پتا چلا تو آپ ﷺ نے اس دیہاتی کے اپنے لیے لفظ ہلاکت استعمال کرنے پر نکیر نہیں فرمائی تھی، جو اس بات پر دلالت تھی کہ وہ دیہاتی اپنے کہی گئی بات میں سچا تھا۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک والی بات نہیں ہے کہ انسانی عمل یا تو ایمان میں داخل ہوگا یا داخل ہوگا مگر اس کے اجزا کمزور ترین ہوں گے، پھر جب ایک انسان کو عمل چھوڑنے کی وجہ سے ہلاکت ملی تو ابولہب ایسا انسان تھا جس نے اعتقاد، قول اور عمل تینوں کو چھوڑ دیا، اعتقاد باطل، قول باطل اور اس کا عمل بھی باطل تو اس کے بارے میں یہ کیوں نہیں سمجھا جاسکتا ہے کہ اسے ہلاکت نہیں مل سکتی، ابولہب کا اعتقاد، قول اور عمل سب باطل تھے اسی لیے اللہ نے اس کے لیے تبت کا لفظ استعمال فرمایا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ تَبَّتْ بمعنیٰ خَسِرَتْ ہے، تباب کا معنیٰ ایسی تباہی اور ایسی بربادی جو انسان کو ہلاکت کی طرف لے جائے، سورۃ ہود میں اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ہلاکت وتباہی ہی زیادہ ہوئی ہے، تَتْبِیْب تَخْسِیْر کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ تَبَّتْ کا معنیٰ خَابَتْ ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

نے ابولہب کے لیے تَبَّتْ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا ہے کیونکہ وہ لوگوں کو نبی کریم ﷺ سے دور کرتا تھا، وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ یہ جادوگر ہیں، یہ ساحر ہیں، یہ سن کر لوگ نبی کریم ﷺ سے دور بھاگتے تھے، لوگ آپ ﷺ سے ملاقات کے بغیر ہی واپس لوٹ جاتے تھے۔

چونکہ لوگ اسے بڑا سمجھتے تھے اور یہ اپنے قبیلے کا بڑا آدمی تھا، اس لیے یہ اپنے منہ سے جو بات کہتا تھا اسے لوگ جھوٹ نہیں سمجھتے تھے، اسے لوگ اپنے باپ کا درجہ دیتے تھے، جب یہ سورۃ اللہب نازل ہوئی اور ابولہب کے کانوں کی دہلیز سے اس کے الفاظ ٹکرائے تو اسے غصہ آگیا، اس کے بعد اس نے سخت ترین عداوت اور دشمنی کا اظہار کیا، جب اس نے اپنی خباثت اور عداوت کا کھل کر اظہار کیا تو لوگوں میں اس کے بارے میں اب وہ بات نہیں رہی، اب اس کی بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا تھا، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کرتا تھا اس پر کوئی کان نہیں دھرتا تھا، گویا کہ اس کی مساعی اور کوششیں تباہی کی طرف جانے لگیں، اس کے باطل اور بے ہودہ مقاصد خاک میں ملنے لگے۔

یہاں تَبَّتْ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کا ذکر فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابولہب کے پاس جو لوگ آتے تھے یہ اپنی ران پر ہاتھ مار مار کر کہتا تھا کہ سیدھے واپس لوٹ جاؤ، نعوذ باللہ یہ شخص جسے تم ملنے آئے ہو، یا ملنا چاہتے ہو یہ تو پاگل اور مجنون ہے اور یہ انسانی عادت میں سے ہے کہ جب کوئی انسان کسی جگہ سے واپس جاتا ہے تو اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس جگہ سے اسے واپس کرتا ہے۔

مفسر قرآن حضرت عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تَبَّتْ کا معنیٰ غَلَبَت ہے، کیونکہ وہ کم نصیب یہ سمجھتا تھا کہ اس کا ہاتھ بلند ہے، وہ نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کو مکہ سے نکال باہر کرے گا، ان کی تذلیل کرے گا اور یوں وہ ان پر غالب آجائے گا۔

حضرت ابن وثاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تَبَّتْ يَدَىٰ (اس کے ہاتھ ہلاک ہو جائیں) کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ ہر خیر، ہر بھلائی اور ہر اچھائی سے خالی ہو جائیں۔

ہاتھ کی تباہی اور بربادی کا یہاں خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی ناپاک ہاتھوں سے پتھر اٹھا کر نبی کریم ﷺ کی طرف پھینکا تھا، حضرت طارق المحاربی کہتے ہیں کہ میں

نے نبی کریم ﷺ کو بازار ذوالمجاز میں دیکھا، آپ ﷺ لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے کہتے جارہے تھے کہ قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا تم لا الہ الا اللہ کہو تو کامیاب ہو جاؤ گے۔

اس دوران ایک شخص آپ ﷺ کی پیچھے تھا جو آپ ﷺ کی طرف پتھر پھینک رہا تھا، جس نے آپ ﷺ کی ایڑی کو لہولہان کر دیا تھا، اور زبان سے یہ کہتا جاتا تھا کہ اس کی بات نہ ماننا یہ بہت بڑا جھوٹا ہے، میں نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ محمد ﷺ ہیں اور یہ اِن کا چچا ابولہب ہے۔ (تفسیر مفاتیح الغیب للرازی)

دوسرا یہاں یَدَین سے مراد اس کے کرتوت ہیں، جس طرح قرآن کریم کی سورۃ الحج ۱۰ میں انسانی کرتوت جو اس نے آگے بھیجے ان پر یَدَاكَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح سورۃ یاسین ۷۱ میں اپنے کرتوتوں پر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، تَبَّ کا لفظ اس پر تاکید ہے۔ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں کی تباہی، بربادی اور ہلاکت سے مراد اس کی دنیا و دین کی تباہی، اس کی اُولی اور عقبیٰ کی تباہی، بربادی اور ہلاکت مراد ہے، دو ہاتھوں کا اس لیے ذکر ہے کہ ایک ہاتھ سے وہ منافع سمیٹتا ہے جب کہ دوسرے ہاتھ سے وہ مضرات، نقصانات کو دور کرتا ہے، داہنا ہاتھ ہتھیار اور دوسرا ہاتھ بطور ڈھال استعمال کرتا ہے۔

ابولہب: نبی کریم ﷺ کا حقیقی چچا ابولہب کے نام سے مشہور ہوا، ابولہب اس کی کنیت ہے اور اس کا نام عبد العزیٰ بن عبد المطلب ہے، اس کی ماں خزاعیہ ہے، ابولہب کنیت کی وجہ یہ ہے کہ یا تو اس کا بیٹا لہب تھا، یا اس کے رخسار بہت سرخ تھے، جس وجہ سے اسے ابولہب کہا گیا۔

الفاکہی نے کہا ہے کہ اس کی کنیت ابولہب اس وجہ سے تھی کہ لہب کا معنی ہے شعلہ اور اس کا چہرہ اس کے حسن کی وجہ سے شعلے کی طرح بھڑکتا تھا، نیز اس کا مآل یہ تھا کہ یہ دوزخ کے شعلوں میں جھونکا جائے گا، اس لئے قرآن مجید نے اس کی کنیت کا ذکر کیا ہے، اس کا نام ذکر نہیں کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی کنیت کے بجائے اپنے نام کے ساتھ زیادہ مشہور تھا، نیز قرآن مجید نے اس کا نام اس لئے ذکر نہیں کیا کہ اس کا اسم عبد العزیٰ تھا اور عزیٰ عربوں کا مشہور بت تھا، جس کی

پوجا کی جاتی تھی اور عبد العزیٰ کا معنی ہوا عزیٰ کا بندہ، اور قرآن میں اللہ کے سوا کس اور کی بندگی کا ذکر مناسب نہیں تھا۔

ابولہب تمام لوگوں سے زیادہ رسول کریم ﷺ سے عداوت رکھتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اعلانِ نبوت سے پہلے ابولہب اور ابوطالب آپس میں لڑ پڑے اور ابولہب، ابوطالب کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا، اچانک رسول اللہ ﷺ آگئے تو آپ نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس کو زمین پر دے مارا، اس نے کہا، ہم دونوں تمہارے چچا ہیں، پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میرے دل میں تمہاری محبت کبھی بھی نہیں رہی، ابولہب یہ سن کر غضب ناک ہوا اور ہمیشہ آپ سے عداوت رکھتا رہا، غزوہ بدر میں ابولہب نہیں گیا تھا, جب اس کو قریش کی عبرتناک شکست کا پتا چلا تو یہ غم سے مر گیا۔ (فتح الباری)

حضرت رحمت کائنات ﷺ نے دن کے اُجالے میں اپنے چچا ابولہب کو دعوت دی اس نے دعوت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، نبی کریم ﷺ نے حضرت نوح علیہ السلام کے طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے شب کے اندھیرے میں اسے دعوت دینے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے، جب ابولہب کے پاس پہنچے تو اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ کیا آپ معذرت خواہی کے لیے آئے ہیں؟ چنانچہ نبی کریم ﷺ اپنے چچا ابولہب کے سامنے ایک ضرورت مند انسان کی مانند بیٹھ گئے پھر ابولہب کو دین اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی اور اسے فرمایا کہ اگر آپ کو شرم میری دعوت قبول کرنے سے مانع ہے تو میری دعوت ابھی قبول کر لیجیے اور خاموشی اختیار کر لیجیے۔

یہ سن کر ابولہب نے کہا کہ میں اس وقت تک آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاؤں گا جب تک یہ بکری کا بچہ آپ پر ایمان نہیں لاتا، آپ ﷺ نے بکری کے بچے سے پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ بکری کے بچے نے کہا کہ اللہ کے رسول ہیں اور اس کی زبان پر آپ ﷺ کی تعریف وستائش کے کلمات مچلنے لگے، بکری کے بچے کی زبان سے یہ کچھ سنتے ہوئے ابولہب پر حسد کی آگ نے حملہ کیا۔

اس نے بکری کے بچے کی اگلی ٹانگوں کو پکڑ کر چیر دیا، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یہ جملہ بولا کہ تیری ہلاکت، تیرے اندر بھی جادو نے اثر کر دیا ہے؟ بکری کے بچے نے کہا بلکہ بربادی، تباہی اور ہلاکت تو تیرے لیے ہے، امام رازی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس کے موافق یہ سورت نازل ہوئی اور ابولہب کے ہاتھوں کی بربادی کا ذکر اس لیے کیا گیا کیونکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے بکری کے بچے کو چیرا تھا۔

تَبَّتْ کے بعد دوبارہ یہاں تَبَّ ذکر کرنے کے بارے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلے والا لفظ مخرج دعا ہے، جیسے سورۃ عبس میں فرمایا گیا کہ انسان ہلاک ہو جائے کس چیز کا وہ انکار کرتا ہے، اور دوسری بار جو تَبَّ فرمایا وہ مخرج خبر ہے گویا جو بددعا ابولہب کے لیے کی گئی وہ پوری ہو گئی، اور مقصد حاصل ہو گیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں قَدْ تَبَّ جو آیا ہے اس کے مطابق یہ مفہوم بالکل ٹھیک ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں تَبَّتْ اور تَبَّ میں خبر دینا مراد ہے، لیکن پہلے والی خبر سے اس کے عمل کی بربادی کی خبر دینا ہے اور دوسری سے اس کی جان کی ہلاکت کی خبر دینا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی جان اور اپنے عمل کی مصلحت کے لیے کوشاں رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی کہ وہ ان دونوں میں محروم ہو گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ سے مراد یہ ہے کہ ابولہب کا مال برباد ہو گیا اور تَبَّ سے مراد یہ ہے کہ وہ خود تباہ و برباد اور ہلاک ہو گیا، جیسے سورۃ زمر میں فرمان ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ سے خود ابولہب کی ہلاکت و تباہی مراد ہے جب کہ تَبَّ سے اس کے بیٹے عتیبہ کی تباہی، بربادی اور ہلاکت مراد ہے جیسے روایت میں ہے کہ عتیبہ بن ابولہب قریش مکہ کے ہمراہ ملک شام کی سمت روانہ ہوا، جب ان لوگوں نے واپسی کی راہ لی تو ابولہب کے بیٹے نے انہیں پیام دیا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میری طرف سے یہ پیغام دے دینا کہ میں نے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى کا انکار کر دیا ہے، یہ بھی مروی ہے کہ اس بدبخت انسان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کچھ

کہا اور آپ ﷺ کے منہ پر تھوکا یہ اپنے باپ ابولہب کی طرح آپ ﷺ کی دشمنی میں پیش پیش تھا، اس پر نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان سے یہ الفاظ بد دعا جاری فرمائے اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْہِ کَلْبًا مِّنْ کِلَابِکَ اے میرے اللہ! اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا مسلط فرمادے۔ ان الفاظ نے عتیبہ کے دل پر رعب و دبدبہ طاری کر دیا تھا، ان الفاظ کی سماعت کے بعد عتیبہ بہت زیادہ احتیاط کرتا تھا، اسی بد دعا کا اثر تھا کہ ایک سفر میں اس پر شیر نے حملہ کیا، اسے چیر پھاڑ کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔

معجم کبیر طبرانی میں ہے کہ عتیبہ نے نبی ﷺ سے کہا، میں آپ کے دین سے کفر کرتا ہوں اور آپ کی بیٹی کو چھوڑتا ہوں، نہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے نہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، پھر وہ آپ پر حملہ آور ہوا اور آپ کی قمیص پھاڑ دی، وہ اس وقت تجارت کی غرض سے شام کی طرف جارہا تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اس کے اوپر اپنے کتے کو مسلط کر دے، وہ قریش کے تاجروں کے ساتھ روانہ ہوا حتیٰ کہ وہ سب رات کو شام میں ایک جگہ ٹھہرے، اس جگہ کا نام زرقاء تھا، اس رات ان کے پاس شیر آیا اور ان کے درمیان چکر لگاتا رہا، عتیبہ نے کہا: ہائے میری ماں کا عذاب! اللہ کی قسم! یہ مجھے پھاڑ کھائے گا، جیسا کہ محمد ﷺ نے دعا کی تھی، پھر لوگوں کے درمیان سے شیر اس کے پاس آیا اس کے سر کو پکڑ کر اس کو جیسا کہ محمد ﷺ نے دعا کی تھی، پھر لوگوں کے درمیان سے شیر اس کے پاس آیا، اس کے سر کو پکڑ کر اس کو مار ڈالا۔

بہت سی تفسیروں میں یہ بات عتبہ کے بارے میں لکھی ہوئی ہے جب کہ حیات الصحابہ مؤلفہ مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ اور معجم کبیر طبرانی میں عتیبہ کے بارے میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اسے شیر نے چیر پھاڑ کر کھایا تھا۔

علامہ محمود آلوسی نے فرمایا ہے کہ ابولہب کے تین بیٹے تھے، عتیبہ، عتبہ اور معتب، عتبہ اور معتب فتح مکہ کے دن اسلام لے آئے تھے، نبی ﷺ نے ان کے اسلام کو مخفی رکھا اور ان کے حق میں دعا کی اور یہ دونوں جنگ حنین اور جنگ طائف میں حاضر ہوئے۔ (روح المعانی)

اگر یہ کہا جائے کہ یہ سورت اس واقعہ سے پہلے اتری تھی اور تَبَّ جو خبر دی گئی یہ تو ماضی کی بات تھی، اس پر اس کا حمل کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے تو امام رازی کہتے ہیں کہ اللہ کے علم میں تھا کہ ایسا ہونے والا ہے یا ایسا ہو گا۔ (الکبیر للرازی)

پانچویں بات یہ ہے کہ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ اس حیثیت میں فرمایا گیا کہ اس بدبخت نے اپنے رب کا حق نہیں پہچانا اور تَبَّ اس حیثیت میں فرمایا کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کا حق نہیں پہچانا تھا۔

اس آیت میں جس تباہی اور بربادی کی پیشین گوئی کی گئی وہ اللہ نے پوری فرمائی، ابولہب عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا، علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ ابو رافع بیان کرتے ہیں: جنگ بدر کے بعد ابولہب سات دن زندہ رہا، حضرت ام الفضل نے خیمہ کی چوب اس کے سر پر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا، اس کے بعد وہ عدسہ کی بیماری میں مبتلا ہوا، اس بیماری میں طاعون کی طرح گلٹی سی نکلتی ہے اور یہ ایک قسم کا پھوڑا ہوتا ہے، اسی بیماری میں وہ مر گیا، اس کے جسم سے سخت بدبو آ رہی تھی۔

تین دن تک اس کی لاش پڑی رہی، لوگ اس بیماری سے طاعون کی طرح بھاگتے تھے حتٰی کہ قریش کے ایک شخص نے اس کے بیٹوں سے کہا، تم کو حیاء نہیں آتی، تمہارے گھر سے کہیں ہمیں بھی یہ بیماری نہ لگ جائے، اس نے کہا، تم اس کو دفن کرو، میں بھی تمہاری مدد کروں گا، ابو رافع نے کہا، پس اللہ کی قسم! انہوں نے اسے غسل نہیں دیا اور مکہ کی ایک بلند پہاڑی سے اس کو ایک دیوار کے ساتھ پھینک دیا اور اس کے اوپر پتھر پھینک دیے (البدایہ والنہایہ)

بعض تفاسیر میں یوں بھی لکھا ہے کہ بیٹوں نے چند حبشیوں کو مزدوری دے کر اس کی لاش اٹھوائی، انہی مزدوروں نے اسے دفن کیا، تدفین کے لیے ایک گڑھا کھودا گیا، لکڑیوں سے لاش کو دھکیلا گیا اور اوپر سے مٹی اور پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا گیا۔

یہاں مفسر قرآن امام رازی رحمہ اللہ نے چند ممکنہ سوالات کے جوابات دیے ہیں کہ جب ابولہب کا کوئی بیٹا لہب نام کا نہیں تھا تو یہاں اس کی کنیت کیوں ذکر کی ہے؟ اسی طرح کنیت باب تعظیم سے ہے جب کہ ابولہب قابل تعظیم نہیں تھا پھر ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کا امام خود ہی جواب دیتے ہیں کہ کنیت

کبھی نام بھی ہوتا ہے، اس کی تائید ان لوگوں کی قرأت سے ہوتی ہے جنہوں نے تَبَّتْ يَدَا أَبُو لَهَبٍ پڑھا ہے، جس طرح علی بن ابو طالب، معاویہ بن ابو سفیان یہ نام ہیں کنیت نہیں ہیں، باقی رہی بات یہ کہ کنیت تعظیم کے لیے ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ابو لہب کنیت نہیں نام ہے تو پھر اِفادہ تعظیم سے باہر ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اس نامراد کا اصل نام عبد العزیٰ تھا تو اس نام سے عدول کرتے ہوئے اسے ابو لہب کے نام سے ذکر کیا گیا، تیسری بات یہ ہے جب یہ بندہ دوزخیوں میں سے تھا اور اس کا انجام کار دوزخ تھا، مآل کار دوزخ تھا جو کہ شعلوں والی ہے تو اس نسبت سے اسے ابو لہب کہا گیا، پھر یہ اس لائق بھی تھا کہ اسے اسی نام سے ذکر کیا جاتا، جیسے شریر ترین انسان کو ابو الشر کہا جاتا ہے، بہترین انسان کو ابو الخیر کہا جاتا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اس کی ابو لہب کنیت رکھنے کی وجہ اس کا شعلہ مارتا چہرہ تھا، یہ خوبصورت تھا، مگر اس کی خوبصورتی کے لیے لفظ ضیاء یا نور استعمال کرنے کی بجائے اس کی حقارت ظاہر کرنے کے لیے ابو لہب کہا گیا، کیونکہ لفظ ضیاء اور نور میں تعظیم پائی جاتی ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نبی الرحمت ہیں، آپ ﷺ عظیم الشان اخلاق کے مالک تھے، تو آپ ﷺ کے لیے یہ بات کیونکر مناسب تھی کہ اپنے چچا کے ساتھ اس طرح کا سخت رویہ روا رکھتے؟ جب کہ نوح علیہ السلام کافروں پر انتہائی درجے میں سخت ہونے کے باوجود اپنے کافر بیٹے کو پیار بھرے لہجے میں پیارے بیٹے! کہہ کر مخاطب ہوئے، یہ فرمایا کہ میرا بیٹا میری اہل میں سے ہے، ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو شفقت بھرے انداز میں مخاطب ہوئے، جب کہ ان کا والد انہیں سخت انداز میں مخاطب ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے سلامتی کے الفاظ استعمال فرمائے، انہیں ان کی بخشش مانگنے کی اطلاع دی، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف روانہ کیا گیا تو انہیں سمجھا کر بھیجا گیا کہ اس سے نرم خوئی سے بات کرنا، باوجودیکہ فرعون کا جرم ابو لہب کے

جرم سے کہیں بڑھ کر تھا، جب کہ نبی کریم ﷺ کی شریعت میں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر حد رجم قائم کی جائے گی، میدانِ جنگ میں اگر بیٹے کے سامنے کافر باپ بھی آجائے تو وہ اسے قتل نہیں کرے گا بلکہ اس سے پہلو تہی کرے گا تاکہ اسے کوئی اور قتل کرے۔

تو اس سوال کا کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے ابولہب چونکہ لوگوں کو نبی کریم ﷺ سے دور بھگاتا تھا، وہ لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کو مجنون اور ساحر کہہ کر نفرت بٹھاتا تھا، وہ چونکہ باپ کی طرح تھا اس لیے لوگ اس کی بات کو غلط نہیں سمجھتے تھے تو اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہوگئی جو ادائے پیغام رسالت میں رکاوٹ ہو، اس وجہ سے نبی کریم ﷺ کو زیادہ جلال آجاتا تھا، اور ابولہب سخت دشمنی کا اظہار کرتا تھا اسی عداوت و دشمنی کے سبب ابولہب کی یہ پوزیشن ہوگئی تھی کہ لوگ اسے جھوٹا خیال کرتے تھے اور اس کے بعد اس کی کسی بات پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کی بات مانتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر نبی کریم ﷺ دین کے معاملے میں کسی سے مداہنت کرتے، چشم پوشی کرتے تو یہ مداہنت اور مسامحت اپنے چچا کے ساتھ کرتے جو باپ کی جگہ تھا، جب چچا کے ساتھ دینی معاملہ میں مداہنت اور چشم پوشی نہیں کی تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ دین سے متعلق کسی قسم کی چشم پوشی اور مداہنت کسی اور سے بھی نہیں کرسکتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ چچا کو چاہیے تھا کہ وہ چچا ہونے کے ناطے آپ ﷺ کے ساتھ شفقت، پیار اور محبت والا رویہ اختیار کرتا، مگر چچا بجائے الفت، محبت اور رأفت کے دشمن بن گیا، اس کے دل ودماغ پر بھتیجے کی دشمنی چھائی ہوئی تھی تو معاملہ الٹ گیا جب معاملہ الٹ گیا، تو یقیناً وہ سخت رویہ کا مستحق تھا۔

گزشتہ سورت میں کافروں کو کہلوایا گیا تھا، قل کا استعمال کیا گیا، یہاں چچا کو اس طرح کے انداز میں خطاب نہیں کروایا گیا، ایک تو چچا کا پاس اور خیال رکھتے ہوئے دوسرا یہ تنبیہ کردی گئی کہ جو

لوگ بے وقوفوں سے ماتھا نہیں لگاتے ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے، اللہ ان کی مدد کرتا ہے اللہ ان کا معین ہوتا ہے۔

مَا أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ: نہ اس کے مال نے اسے فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے۔ یہاں اگر استفہام انکاری کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور نفی کا بھی، اگر استفہام انکاری کا احتمال ہو تو پھر اس آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس سے بلاؤں اور آزمائشوں کو ہٹانے کے لیے اس کا مال اور اس کی کمائی کیا تاثیر رکھتی ہے، کیونکہ قارون سے زیادہ دولت کسی کے پاس نہیں، تو کیا اس کی دولت نے اس سے موت کو دور کر دیا تھا؟ سلیمان علیہ السلام سے بڑا ملک کسی کے پاس نہیں تو کیا ان کی سلطنت عظیمہ نے ان سے موت کو ٹال دیا تھا؟ نفی کے احتمال پر آیت میں خبر دینے کا معنیٰ پایا جاتا ہے کہ مال اور کمائی اس میں اسے نفع نہیں دے گی۔

ابو لہب کا کبر و غرور اور نخوت اسے حق بات قبول کرنے سے مانع تھی، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شدید بغض اور عناد رکھتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ میرا بھتیجا کہتا ہے اگر وہ سچ اور حق ہے تو پھر میں اپنا مال، اور اپنی اولاد اسے دے کر اپنی جان بچالوں گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اس کا مال اور اس کی کمائی اسے کچھ بھی کام نہیں آئے گی، جب رب تعالیٰ نے اسے گرفتار بلا کیا تو اسے اس کا مال بچا سکا اور نہ ہی اس کی اولاد اسے کام آسکی۔

اس آیت کی روشنی میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ابو لہب کو اس کا مال کام آیا اور نہ اسے اس کی کمائی کام آئی، رأس المال کام آیا اور نہ ہی اس کا منافع کام آیا، بعض کہتے ہیں مال سے مویشی اور ماکسب سے مراد ان مویشیوں کی نسل ہے، کیونکہ وہ مال مویشیوں والا آدمی تھا، بعض کہتے ہیں مال سے یہاں وہ مال مراد ہے جو والدین سے وراثت میں پایا اور کسب سے مراد وہ ہے جو خود کمایا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ماکسب سے مراد جو اس کی اولاد نے کمایا۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے اس کے مال نے نفع نہیں دیا اور جو کچھ اس نے کمایا سے

مراد یہ ہے کہ اس کو اسے مال اور اس کے خبیث عمل نے یعنی نبی کریم ﷺ کی عداوت و دشمنی نے اسے کوئی فائدہ نہیں دیا۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ: وہ عنقریب سخت شعلوں والی آگ میں جائے گا۔ وہ انسان کس قدر بدنصیب ہوتا ہے جس کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں ہی تباہی اور بربادی کی نذر ہو جائیں، ابولہب بھی انہی ازلی بدبختوں میں سے ایک تھا جس کا ماضی بھی تباہ، حال بھی برباد اور مستقبل بھی برباد۔

اللہ نے اس کی ماضی کو تباب فرمایا، کہ تباہ و برباد، اس نے ماضی میں جو کچھ کمایا، مال ہتھیایا وہ اس کے کام نہ آیا، حال کا جو منظر تھا وہ جبل ابو قبیس کے دامن میں رہنے والوں نے اپنی چشم وا سے دیکھا تھا، جو کچھ اس کی جان نکلنے کے بعد اس کے ساتھ ہوا وہ بھی دیکھنے والوں نے عبرت کی نگاہوں سے ملاحظہ کیا تھا، اس کے جسم سے اٹھنے والے تعفن اور سرانڈ کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جو وہاں موجود تھا، اور اس پیش نظر آیت میں اس کے مستقبل اور مآل کار کے بارے میں اطلاع دی جا رہی ہے کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا ہو گا؟ وہ دہکتی آگ کے لپکتے شعلوں میں جلے سڑے گا۔

ان تین آیات میں جس طرح ابولہب بارے خبریں دی گئی ہیں اسی طرح ہوا، اس کے تباب، خسران، خذلان اور تباہی کی اطلاع دی گئی تو ایسا ہی ہوا، دوسری خبر یہ دی گئی کہ ابولہب کا مال اور اس کی کمائی اسے کام نہیں آئے گی تو ایسا ہی ہوا، نہ مال کام آیا اور نہ ہی اولاد کام آئی۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے ایک غلام تھے جن کا نام ابو رافع تھا، ان کا بیان ہے کہ جب اسلام ہمارے گھر میں داخل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے، ان کی بیوی ام الفضل مسلمان ہو گئیں، میں بھی مسلمان ہو گیا، مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنی قوم سے ڈرتے ہوئے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

ابو رافع کہتے ہیں کہ ابولہب میدان بدر میں شریک نہیں ہوا تھا، اس نے اپنی جگہ عاص بن ہشام کو روانہ کیا تھا، اس کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس نے اپنی نمائندگی کے لیے کسی اور شخص کو بدر میں بھیجا ہو، جب میدان بدر سے واقعہ کی خبریں آئیں تو ہم نے اپنی جانوں میں قوت محسوس کی،

میں کمزور آدمی تھا، میں حجرہ زمزم کے پاس بیٹھا تھا، میرے پاس ام الفضل بھی بیٹھی ہوئی تھیں، ہم بدر سے آنے والی خبر کی خوشی منا رہے تھے، اتنے میں ابولہب اپنے پاؤں گھسیٹتا ہوا آدھمکا، چنانچہ وہ حجرہ کے کنارے بیٹھ گیا۔

میری پشت اس کی پشت کی طرف تھی، وہ بیٹھا ہی ہوا تھا کہ لوگوں نے کہا کہ یہ ابوسفیان بن حرث بن عبد المطلب ہے، ابولہب نے اس سے پوچھا کہ اے میرے بھتیجے! کیسی خبر ہے؟ اس نے کہا کہ ہم لوگوں نے اپنے کاندھے ان کے سپرد کیے کہ وہ جس طرح چاہیں ہمیں قتل کریں، اللہ کی قسم! باوجود یکہ ہم نے لوگوں میں غور کیا ہمیں ایسے مردوں سے پالا پڑا جو سفید رنگت والے اور سفید وسیاہ رنگت والے گھوڑوں پر آسمان وزمین کے درمیان دکھائی دے رہے تھے۔

ابورافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ کی قسم! وہ اللہ کے فرشتے تھے، یہ سن کر ابولہب نے مجھے پکڑا اور مجھے زمین پر پٹخ دیا، پھر میرے اوپر چڑھ بیٹھا اور مجھے اس کے باوجود مارا کہ میں ایک کمزور سا آدمی تھا، یہ منظر دیکھ کر ام فضل اٹھیں اور ایک لاٹھی لے کر اس کے سر پر ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا، اور کہنے لگیں کہ تو اسے کمزور سمجھتا ہے کہ اس کا آقا یہاں موجود نہیں ہے، اللہ کی قسم! ہم تو بہت پہلے کے ایمان لائے ہوئے ہیں، اس نے جو کہا سچ کہا ہے، یہ سن کر اور ڈنڈا کھا کر ذلیل ہو کر وہاں سے چلتا بنا۔

واقعہ بدر کے بعد وہ سات راتیں بھی زندہ نہیں رہا، اللہ نے اس پر عدسہ (رسولی گلٹی جس سے آدمی مر جاتا ہے) کی بیماری مسلط کر دی، جس نے اسے ہلاک کر ڈالا، اس کے بیٹوں نے اسے دو تین دن تک دفنایا نہیں، اس عرصہ میں اس کے گھر میں تعفن اور بدبو پھیل گئی، قریش عدسہ سے بچتے اور بھاگتے تھے، جس طرح لوگ طاعون سے بچتے ہیں، وہ کہتے تھے کہ ہم اس زخم سے خوف زدہ ہیں، پھر ان لوگوں نے اسے دفنایا، پہلے ہم لکھ آئے ہیں کہ دفنایا نہیں بلکہ ایک پہاڑی سے لڑھکایا، بعض اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ اس کو ایک ایسی بیماری لگ گئی جو انسان کے تمام اعضا کو سڑا دیتی ہے۔ اس کو عربوں میں عدسہ کی بیماری کہتے تھے، اس کے عدسہ کی گلٹی نکلی، اس کے بدن سے ایسی بدبو اور سڑانڈ

آتی تھی کہ اس کے بیٹے یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی اس کے قریب کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔

اس کو اس کے گھر والوں نے علیحدہ ایک کمرے میں ڈال دیا، تین دن تک کوئی اس کے پاس نہیں گیا، اس عرصے میں وہ مر گیا جب تین دن کے بعد اس کی لاش سے زبردست بدبو پیدا ہوئی تو حبشی بدوؤں کو بلا کر اس کی لاش کو اٹھویا گیا اور کسی نامعلوم صحرا میں پھینکوا دیا گیا، قرآنی آیت میں جو فرمایا گیا کہ اسے اس کا مال اور اس کی کمائی کام نہ آئی یہی مفہوم ہے۔

ابولہب کے بارے تیسری خبر یہ دی گئی کہ وہ دوزخیوں میں سے ہے، یہ بات بھی پوری ہوئی کیونکہ وہ حالت کفر پر مرا تھا۔

وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: اور اس کی بیوی بھی ایندھن اٹھانے والی۔ اروٰی عرف ام جمیل ابولہب کی بیوی تھی، جو حضرت ابوسفیان بن حرب کی بہن تھی، حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھی، یہ نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں انتہاؤں کو چھو رہی تھی، یہی ام جمیل اذیت ناک جنگلی کانٹوں کے گٹھے اکٹھے کرتی اور رات کی تاریکی میں نبی کریم ﷺ کی گزرگاہوں میں بکھیر دیتی تھی۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ابولہب کو رسول ﷺ سے سخت غیظ اور دشمنی تھی اس کی بیوی بھی اس دشمنی اور رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی میں اس کی مدد کرتی تھی، قرآن کریم کی اس آیت نے بتلایا کہ یہ بدبخت بھی اپنے شوہر کے ساتھ جہنم کی آگ میں جائے گی اس کے ساتھ اس کا ایک حال یہ بتلایا کہ وہ حمالۃ الحطب ہے، جس کے لفظی معنٰی ہیں سوختہ کی لکڑیاں لادنے والی، یعنی آگ لگانیوالی، عرب کے محاورات میں چغل خوری کرنے والے کو حمال الحطب کہا جاتا تھا کہ جیسے کوئی سوختہ کی لکڑیاں جمع کر کے آگ لگانے کا سامان کرتا ہے چغل خوری کا عمل بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی چغل خوری کے ذریعہ افراد اور خاندانوں میں آگ بھڑکا دیتا ہے یہ عورت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی ایذا رسائی کے لئے چغل خوری کا کام بھی کرتی تھی۔ (معارف القرآن)

اس آیت میں ابولہب کی بیوی کو حمالۃ الحطب کہنے کی تفسیر بعض مفسرین کرام نے یہی کی ہے کہ

یہ چغل خوری کرنے والی تھی اور بعض مفسرین نے اس کو اپنے حقیقی معنیٰ میں رکھا ہے جس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ یہ عورت جنگل سے خاردار لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور رسول اللہ ﷺ کے راستے میں بچھا دیتی تھی تاکہ آپ کو تکلیف پہنچے اس کی اس ذلیل و خسیس حرکت کو قرآن نے حمالۃ الحطب سے تعبیر فرمایا ہے (قرطبی، ابن کثیر، معارف القرآن)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ حال جہنم میں ہو گا کہ اپنے شوہر پر جہنم کے درختوں زقوم وغیرہ کی لکڑیاں لا کر ڈالے گی تاکہ اس کی آگ بھڑک جائے جس طرح دنیا میں وہ اس کے کفر و ظلم کو بڑھاتی تھی آخرت میں اس کے عذاب کو بڑھائے گی۔ (ابن کثیر، معارف القرآن)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس اشکال کا جواب دیتے ہیں کہ وہ تو بڑی عزت دار اور مالدار خاتون تھی وہ گٹھے اٹھانے والی کیسے ہو سکتی تھی؟ فرمایا کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے مال و دولت کی کثرت کے باوجود خسیس عورت تھی، یا پھر آپ ﷺ کی شدید اور سخت دشمنی کی وجہ سے خود ہی کانٹے اور لکڑیوں کے گٹھے اٹھاتی ہو تاکہ انہیں آپ ﷺ کے راستوں میں بکھیرے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کو فقر کی وجہ سے عار دلاتی تھی، تو اس کے جواب میں اسے عار دلائی گئی کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے اٹھایا کرتی تھی۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ام جمیل بڑے جوش و خروش سے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھا کر لائی، پھر مسجد میں داخل ہو گئی اور رسول کریم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ کے پاس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ام جمیل اپنے منہ سے یوں کہہ رہی تھی مُذَمَّمًا قَلَيْنَا ... وَدِينَهُ أَبَيْنَا وَحُكْمَهُ عَصَيْنَا ہم مذمم کے منکر ہیں، اس کے دین کے دشمن ہیں اور اس کے نافرمان ہیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ آ رہی ہے مجھے خوف ہے کہ وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ لے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ پائے گی، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا اجب

تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ایمان نہ لانے والوں کے درمیان پوشیدہ پردے ڈال دیتے ہیں۔ (سورۃ الاسراء:۴۵)

ام جمیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تو نہ دیکھ سکی، مگر ابو بکر صدیق کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگی کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں رب کعبہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری ہجو نہیں کی، یہ سن کر وہ پلٹ گئی اور یہ کہہ رہی تھی کہ قریش یہ جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔

ایک مرتبہ یہ اپنی لمبی چادر اوڑھے طواف کر رہی تھی پیر چادر میں الجھ گیا اور پھسل پڑی تو کہنے لگی مذمم غارت ہو۔ ام حکیم بنت عبد المطلب نے کہا میں تو پاک دامن عورت ہوں اپنی زبان نہیں بگاڑوں گی، ہم سارے ایک ہی دادا کی اولاد میں سے ہیں اور قریش ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں صرف وَامْرَأَتُهُ کہہ دیتے، اس کا وصف حمالۃ الحطب کیوں بیان کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابولہب کی ام جمیل کے علاوہ دو بیویاں اور تھیں، اللہ تعالیٰ نے ام جمیل کا وصف حمالۃ الحطب بیان کر کے کسی گمان کرنے والے کو بدگمانی سے بچایا، جب وَامْرَأَتُهُ کہتے تو یہ سمجھا جاتا کہ ابولہب کی جو بھی بیوی ہے وہ اسی میں شامل ہے، حالانکہ اس سے مراد صرف یہی ام جمیل ہی ہے دوسری مراد نہیں ہیں۔

فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ: اس کے گلے میں رسی ہے کھجور کی چھال کی۔ اس آیت میں جید کا لفظ ہے، اس کا معنیٰ ہے: گردن اور اس آیت میں مسد کا لفظ ہے، اس کا معنیٰ کھجور کی چھال کی بٹی ہوئی رسی ہے۔

علامہ واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درخت کی چھال سے جو بہت عمدہ طریقہ سے رسی بٹی جائے، اس کو مسد کہتے ہیں، یہ وہ مضبوط رسی تھی، جس سے وہ اپنی لکڑیوں کا گٹھا باندھتی تھی، قیامت کے دن اسی یا اس جیسی رسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہو گا، اس آیت سے مقصود اس کو اور اس کے خاوند کو ایذاء پہنچانا ہے۔ اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہنم کی آگ میں وہ ایسی حالت میں ہو گی کہ اس کی پیٹھ پر درخت زقوم کی کانٹے دار لکڑیوں کا گٹھا ہو گا اور اس کی گردن میں آگ کی زنجیروں کا پھندا ہو گا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ درخت کی چھال سے بٹی ہوئی رسی کا پھندا دوزخ کی آگ میں کیسے باقی رہے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح دوزخ کی آگ میں اس کی کھال، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گی، اسی طرح وہ رسی بھی ہمیشہ رہے گی اور جس طرح اس کو جلنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اسی طرح وہ رسی بھی بار بار بنتی رہے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بٹی ہوئی رسی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوہے کی زنجیر ہو۔ (تفسیر کبیر)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مَسَد سے مراد ہے، لوہے کے تاروں سے مضبوط بٹی ہوئی وہ زنجیر جو ستّر ہاتھ لمبی ہو گی اور منہ میں ڈال کر سرینوں سے کھینچی جائے گی اور جو حصہ باقی رہ جائے گا وہ اس کی گردن میں لپیٹ دیا جائے گا۔ (مظہری)

شعبی رحمہ اللہ اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد رسی ہے جو کھجور کے ریشوں سے بٹی ہوئی تھی اور امّ جمیل اس میں لکڑیاں باندھتی تھی، ایک روز لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر ایک پتھر پر آرام لینے بیٹھ گئی، پیچھے سے ایک فرشتہ نے آکر رسی کھینچ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ (مظہری)

حو دہل لہ فی حو دہل سورۃ المسد کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اس فقیرانہ اور متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول و منظور فرمائے اور اسے میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ و مشائخ کے لیے، میرے مخلصین معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۲۰ جولائی ۲۰۲۰ء ۲۸ ذیقعد ۱۴۴۱ھ بروز پیر، بوقت پونے ایک بجے شب

حروف بنی: ۲۹ نومبر ۲۰۲۰ء بروز اتوار، دس بجے شب

☆☆☆☆

الاخلاص

اللہ کی وحدانیت، صمدیت، اُلوہیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ{۱} اَللّٰهُ الصَّمَدُ {۲} لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ{۳} وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ {۴} الإخلاص

جواب ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

آیات کے لحاظ سے یہ سورت چھوٹی ہے مگر مطالب، مفاہیم اور مضامین کے لحاظ بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کے فضائل رحمت دوعالم ﷺ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا

مَنْ قَرَأَ سُورَةَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، فَكَأَنَّمَا قَرَأَ ثُلُثَ الْقُرْآنِ وَأُعْطِيَ مِنَ الْأَجْرِ عَشْرَ حَسَنَاتٍ بِعَدَدِ مَنْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ وَآمَنَ بِاللّٰهِ (تفسیر کبیر) جس نے سورت قل ھو اللہ احد کی تلاوت کی اس نے گویا کہ تہائی قرآن کریم کی تلاوت کی، اسے اس شخص کی دس نیکیوں کی تعداد کے برابر اجر دیا جائے گا جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے بعد اللہ پر ایمان لایا۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا مَنْ قَرَأَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ مَرَّةً وَاحِدَةً أُعْطِيَ مِنَ الْأَجْرِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَأُعْطِيَ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ مِائَةِ شهيدا (کبیر) جس نے قل ھو اللہ احد کی ایک بار تلاوت کی اسے اس شخص کی طرح اجر دیا جائے گا جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، اور اسے سو شہیدوں کی مانند اجر دیا جائے گا۔

مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ اتنے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، تو جبریل نے کہا، هٰذَا أَبُو ذَرٍّ قد أقبل، فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: أَوَ تعرفُونَهُ؟ قَالَ: هُوَ أَشْهَرُ عِنْدَنَا مِنْهُ عِنْدَكُمْ، فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ

وَالسَّلَامُ: بِمَاذَا نَالَ هَذِهِ الْفَضِيلَةَ؟ قَالَ لِصِغَرِهِ فِي نَفْسِهِ وَكَثْرَةِ قِرَاءَتِهِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (کبیر) یہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے پوچھا کہ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟ جبریل نے فرمایا کہ آپ لوگوں کے ہاں ان کی جو شہرت ہے اس سے کہیں زیادہ ان کی شہرت ہمارے ہاں ہے، آپ علیہ السلام نے پوچھا، وہ کس وجہ سے یہ فضیلت رکھتے ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتے ہیں اور دوسرا اس وجہ سے کہ یہ کثرت سے قل ھو اللہ احد کی تلاوت کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

كُنَّا فِي تَبُوكَ فَطَلَعَتِ الشَّمْسُ مَالَهَا شُعَاعٌ وَضِيَاءٌ وَمَا رَأَيْنَاهَا عَلَى تِلْكَ الْحَالَةِ قَطُّ قَبْلَ ذَلِكَ فَعَجِبَ كُلُّنَا، فَنَزَلَ جِبْرِيلُ وَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ أَنْ يَنْزِلَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ فَيُصَلُّوا عَلَى مُعَاوِيَةَ بْنِ مُعَاوِيَةَ، فَهَلْ لَكَ أَنْ تُصَلِّيَ عَلَيْهِ ثُمَّ ضَرَبَ بِجَنَاحِهِ الْأَرْضَ فَأَزَالَ الْجِبَالَ وَصَارَ الرَّسُولُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَأَنَّهُ مُشْرِفٌ عَلَيْهِ فَصَلَّى هُوَ وَأَصْحَابُهُ عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: بِمَ بَلَغَ مَا بَلَغَ؟ فَقَالَ جِبْرِيلُ: كَانَ يُحِبُّ سُورَةَ الْإِخْلَاصِ

ہم تبوک میں تھے، اس دوران سورج طلوع ہوا جس کی کوئی شعاع اور روشنی نہیں تھی (یعنی روشنی مدہم تھی) اور ہم نے اس سے پہلے سورج کو اس حالت میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا، ہم میں سے ہر شخص حیران تھا، اتنے میں جبریل امین تشریف لائے، اور فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ستر ہزار فرشتے اتریں اور معاویہ بن معاویہ کی نماز جنازہ ادا کریں۔

پھر جبریل امین نے کہا کہ کیا آپ کی بھی خواہش ہے کہ آپ ان کی نماز جنازہ پڑھیں؟ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہو گا) پھر جبریل امین نے اپنا پر زمین پر مارا، پہاڑوں کو آگے سے ہٹا دیا، (بعض روایتوں میں ہے کہ پہاڑوں کو نیچے کر دیا) تو ایسے ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ رہے ہیں،

چنانچہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کا جنازہ پڑھا، پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا یہ (معاویہ بن معاویہ) جس مرتبہ پر پہنچے ہیں کس وجہ سے پہنچے ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا کہ یہ سورۃ الاخلاص کے ساتھ محبت رکھتے تھے، یہ مقام اس وجہ سے انہیں ملا ہے۔ (کبیر)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد میں داخل ہوئے تو ایک شخص کو دعا کرتے ہوئے اور یوں کہتے ہوئے سنا، وہ کہہ رہا تھا

أَسْأَلُكَ يَا اللهُ يَا أَحَدُ يَا صَمَدُ يَا مَنْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ، فَقَالَ: غَفَرَ لَكَ غَفَرَ لَكَ غَفَرَ لَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (تفسیر کبیر) میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اے اللہ! اے یکتا! اے بے نیاز! اے وہ ذات جس کی نہ اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ جس کا کوئی ہمسر ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے تجھے معاف کر دیا ہے، اس نے تجھے معاف کر دیا ہے، اس نے تجھے معاف کر دیا، تین بار فرمایا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے فقر وفاقہ کی شکایت کرنے لگا تو نبی کریم ﷺ نے اسے فقر وفاقہ ختم کرنے کا طریقہ یوں بتایا اور اس سے فرمایا کہ إِذَا دَخَلْتَ بَيْتَكَ فَسَلِّمْ إِنْ كَانَ فِيهِ أَحَدٌ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ أَحَدٌ فَسَلِّمْ عَلَى نَفْسِكَ، وَاقْرَأْ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ مَرَّةً وَاحِدَةً فَفَعَلَ الرَّجُلُ فَأَدَرَّ اللهُ عَلَيْهِ رِزْقًا حَتَّى أَفَاضَ عَلَى جِيرَانِهِ، جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کر، اگر گھر میں کوئی موجود ہو اور اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو پھر اپنے اوپر سلام کر، اور ایک بار قل ھو اللہ احد پڑھ، اس شخص نے نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بہت رزق عطا فرمایا یہاں تک کہ اس نے اپنے پڑوسیوں کو بھی اس کا فیضان پہنچایا۔ (تفسیر کبیر للرازی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اپنی تمام نماز میں قل ھو اللہ احد کی تلاوت کرتا تھا، نبی کریم ﷺ نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي أُحِبُّهَا، فَقَالَ:

حُبُّكَ إِيَّاهَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ. یارسول اللہ! میں سورۃ الاخلاص کی تلاوت کو پسند کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی پسندیدگی تجھے جنت میں داخل کردے گی۔ (تفسیر کبیر)

شان نزول: سورۃ الاخلاص کے شان نزول سے متعلق حضرات اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ مشرکین کے سوال کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے عامر بن طفیل کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا، اورانہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ آپ نے ہمارا شیرازہ بکھیر دیا ہے، آپ نے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے، آپ نے اپنے آباؤاجداد کے دین کی مخالفت کی ہے اگر آپ فقیر ہیں تو ہم آپ کو مالدار کیے دیتے ہیں، اگر آپ پاگل و مجنون ہیں تو ہم آپ کے لیے دوادارو کا اہتمام کرتے ہیں، اگر آپ کسی عورت کے خواہش مند ہیں تو ہم اس کے ساتھ آپ کا نکاح کروادیتے ہیں۔

یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا، میں فقیر ہوں، نہ ہی مجنون اور نہ ہی مجھے کسی عورت کی طلب ہے، میں اللہ کا رسول ہوں، میں تمہیں بتوں کی پوجا پاٹ سے ہٹا کر اللہ کی عبادت وبندگی کی دعوت دیتا ہوں۔

مشرکین مکہ نے اس کو دوبارہ بھیجا، اورانہوں نے کہا کہ ان سے کہیے آپ اپنے معبود کی جنس ہمیں بتائیں کہ وہ سونے کا ہے یا چاندی کا؟ اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی، اس پر مشرکین مکہ نے کہا کہ تین سو ساٹھ بت ہماری ضروریات پوری نہیں کرسکتے تو ایک معبود مخلوق کی حاجات وضروریات کیسے پوری کرسکے گا؟ اس پر سورت الصافات کی آیت ایک تا چار نازل ہوئیں، پھر مشرکین نے کہا کہ تمہارا معبود کیا کیا کام کرتا ہے، اس کے افعال بارے بتائیں تو اس پر سورۃ الاعراف کی آیت چون ۵۴ نازل ہوئی۔

ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کا شان نزول یہودیوں کا سوال بنا، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہودی کعب بن اشرف کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہنے

لگے، اے محمد! (ﷺ) اللہ نے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے، بھلا یہ بتائیں کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

اس پر نبی کریم ﷺ کو غصہ آگیا تو جبریل امین نازل ہوئے اور آپ ﷺ کو تسلی دی اور فرمایا اے محمد! (ﷺ) اپنے بازو بچھا دیجیے، اس پر قل ھو اللہ احد نازل ہوئی، جب نبی کریم ﷺ نے سورۃ الاخلاص ان پر تلاوت کی تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنے رب کے بارے میں بتایئے کہ اس کے مونڈھے کیسے ہیں؟ اس کے بازو کیسے ہیں؟ اس پر نبی کریم ﷺ پہلے سے بھی زیادہ غصہ میں آگئے، پھر آپ ﷺ کے پاس جبریل تشریف لائے اور فرمایا کہ انہوں نے اللہ کی اس طرح قدر نہیں کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق تھا۔ (تفسیر کبیر للرازی)

ایک روایت میں ہے کہ سورۃ الاخلاص کے نزول کا سبب عیسائیوں کا سوال بنا، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نجران (کے عیسائیوں) کا ایک وفد آیا اور انہوں نے پوچھا کہ ہمیں اپنے رب کے بارے میں بتائیں کہ کیا وہ زبرجد کا ہے؟ یاقوت کا ہے؟ سونے کا ہے؟ یا چاندی کا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا میرا رب ان میں سے کسی چیز کا نہیں ہے، کیونکہ وہ اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے، اس پر یہ سورۃ الاخلاص نازل ہوئی، انہوں نے کہا کہ وہ بھی اکیلا ہے اور آپ بھی اکیلے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی مثل کوئی بھی نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ کی اور صفات بیان کریں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ الصمد (بے نیاز) ہے، انہوں نے پوچھا کہ یہ الصمد کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے صمد کی تعریف یہ بیان فرمائی کہ صمد وہ ہے جس کی طرف مخلوق اپنی حاجات لے کر جائے، انہوں نے کہا ہمیں اور بتائیں، اس پر لم یلد ولم یولد نازل ہوئی کہ وہ کسی کی اولاد نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے جس طرح حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئی یا جس طرح ان کے بیٹے حضرت عیسی علیہ السلام پیدا ہوئے اور نہ ہی اس کا ہمسر اور برابر اس کی مخلوق میں سے کوئی ہے۔

سورۃ الاخلاص کے نام

کثرت اسامی (ناموں کا بہت زیادہ ہونا) زیادہ فضیلت پر دلالت کرتے ہیں، اس سورۃ کے بہت

سے اور بھی نام ہیں، اسے سورۃ التفرید کہا جاتا ہے، تفرید فرد سے ہے، اس کا معنیٰ ایسی سورت جو اللہ تعالیٰ کو ایک بتاتی ہے کہ اللہ یکتا اور یگانہ ہے، دوسرا نام سورۃ التجرید ہے۔

تیسرا نام سورۃ التوحید ہے، چوتھا نام سورۃ الاخلاص ہے، جو شخص اس سورت میں بیان کی گئی اللہ کی صفات پر ایمان رکھے گا وہ مخلص بندہ ہو گا، وہ اللہ کے دین کے ساتھ مخلص ہو گا، جو شخص دین کے ساتھ مخلص ہو کر مرے گا وہ دوزخ کی آگ سے خلاصی اور رستگاری پالے گا، اسی طرح اس سے پہلے والی سورت میں ابولہب کی مذمت کی گئی ہے، تو سورۃ الاخلاص پڑھنے والے بندے کی جزا یہ ہے کہ وہ اور ابولہب اکٹھے نہیں کیے جائیں گے۔

اس سورۃ کا پانچواں نام سورۃ النجات ہے، کیونکہ یہ آپ کو دنیا میں تشبیہ اور کفر سے نجات دیتی ہے اور آخرت میں دوزخ سے نجات دے گی، اس سورۃ کا چھٹا نام سورۃ الولایۃ ہے، کیونکہ اس سورۃ کو جو شخص پڑھے گا، اس کی تلاوت کرے گا وہ اولیاء اللہ میں سے ہو جائے گا، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کی اس سورت کے تقاضا پر معرفت حاصل کرے گا اللہ اسے اپنا دوست بنالے گا، کیونکہ آزمائش وامتحان کے بعد رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، جیسے عطیہ کے بعد نعمت کا حصول ہوتا ہے۔

اس سورۃ کا ساتواں نام سورۃ النسبت ہے، جیسے اس سورۃ کے شان نزول کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سورۃ اس شخص کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہے جس نے پوچھا تھا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب بیان کیجیے تو آپ ﷺ نے بنو سلیم کے ایک آدمی سے کہا تھا کہ اے بنی سلیم کے بھائی اللہ کی نسبت اچھی بات کیا کرو، تو اس نسبت سے اس سورت کا نام سورت النسبت ہے۔

اس میں ایک باریک بات یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے پوچھا کہ ہمارے لیے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو فرمایا اللہ کی نسبت یہ ہے، نسبوں کی پاسداری اور خیال رکھنا عربوں کا طریقہ کار ہے، اور عرب ان لوگوں پر سختی والا رویہ رکھتے ہیں جو شجرہ ہائے نسب میں کمی بیشی کرتے ہیں، اس لیے اللہ کی نسبت جو اس سورت میں بیان کی گئی ہے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔

آٹھواں نام اس سورت کا سورۃ المعرفۃ ہے، کیونکہ اللہ کی معرفت اس وقت تک مکمل اور تام حاصل نہیں ہوتی جب تک اس سورت کی معرفت حاصل نہ کی جائے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی تو اس نے قل ھو اللہ احد کی تلاوت کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے اپنے رب کی معرفت حاصل کی ہے، اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ المعرفۃ رکھا گیا۔

اس سورۃ کا نواں نام سورۃ الجمال ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، اس پر ان لوگوں نے سوال کیا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ یکتا ہے، بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے کیونکہ جب تک وہ یکتا نہیں ہوگا، عدیم النظیر نہیں ہوگا تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی مثال اور اس کے قائم مقام کوئی ہو سکتا ہے، لیکن ایسا ہے نہیں۔

اس سورۃ کا دسواں نام سورۃ المقشقشہ (سُوْرَةُ الْمُقَشْقِشَةِ) ہے، عربی زبان میں تقشیش المریض کا معنیٰ ہوتا ہے مریض کا تندرست اور ٹھیک ہو جانا، تو جو شخص اس سورت کی معرفت حاصل کرلے گا وہ شرک و نفاق کی بیماری سے تندرست ہو جائے گا، کیونکہ نفاق بیماری ہے، جیسے قرآن کریم نے بھی انکشاف کیا کہ ان کے دلوں میں بیماری ہے اور شرک بہت بڑی بیماری ہے، بلکہ ظلم عظیم ہے۔

اس سورت کا گیارہواں نام سورۃ المعوِّذہ (الْمُعَوِّذَةُ) ہے، حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سورۃ الاخلاص اور اس کے بعد والی دو سورتیں پڑھ کر تعوذ کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سورتوں کے ذریعے تعوذ کرنے کا حکم فرمایا تھا۔

اس سورۃ کا بارہواں نام سورۃ الصمۃ ہے، اس میں صمدیت کا معنیٰ پایا جاتا ہے، چونکہ اس سورت میں اللہ کا نام الصمد ہے اس نسبت سے اس سورت کا نام سورۃ الصمۃ (الصمدیۃ) ہے، یہ اللہ کے ذکر کے ساتھ خاص ہے۔

اس سورۃ کا تیرہواں نام سورۃ الاساس ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا أُسِّسَتِ السَّمٰوٰت

السَّبع وَالأَرضُون السبع عَلَى قُل هُوَ اللهُ أَحَدٌ، سات آسمانوں اور سات زمینوں کی بنیاد قل ھو اللہ احد پر رکھی گئی ہے۔ اس فرمان کی بنیاد پر اس سورۃ کا نام سورۃ الاساس ہے۔

اس سورۃ کا چودھواں نام سورۃ المانعہ ہے، مانعہ کا معنٰی روکنے والی، ابن عباس سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شب معراج میں اپنے نبی ﷺ سے فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کو سورۃ الاخلاص عطا کی ہے، یہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ہے، یہ مانعہ (روکنے والی) ہے، یہ عذاب قبر اور دوزخ کی جھلسا دینے والی آگ سے روکنے والی ہے۔

اس سورۃ کا پندرھواں نام سورۃ المحضر (سُورَةُ الْمَحْضَرِ) ہے، محضر کا معنٰی حاضر ہونے کی جگہ، جب سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی جاتی ہے تو فرشتے اس کو سننے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔

اس سورۃ کا سولھواں نام سورۃ المنفرہ (الْمُنَفِّرَةُ) ہے، منفرہ کا معنٰی بھگانے والی، تو جب اس سورۃ کی تلاوت کی جاتی ہے تو تلاوت کے وقت شیطان بھاگتا ہے۔

اس سورۃ کا سترھواں نام سورۃ البرأت (الْبَرَاءَةُ) ہے، نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سورۃ الاخلاص پڑھتے دیکھا تو فرمایا أَمَّا هٰذَا فَقَدْ بَرِیءَ مِنَ الشِّرْكِ یہ شخص شرک سے بری ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ قَرَأَ سُورَةَ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ مِائَةَ مَرَّةٍ فِي صَلَاةٍ أَوْ فِي غَيْرِهَا كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ، جس نے سورۃ قل ھو اللہ احد سو بار نماز میں پڑھی یا اس کے علاوہ سو بار پڑھی تو اس کے لیے دوزخ سے برأت لکھ دی جاتی ہے۔

اس سورۃ کا اٹھارھواں نام سورۃ المذکرہ (سُورَةُ الْمُذَكِّرَةِ) ہے، مذکرہ کا معنٰی یاد کرانے والی، کیونکہ یہ سورۃ بندے کو خالص توحید کی یاد دلاتی ہے، گویا اس سورۃ کی تلاوت وسمہ (کسی چیز کو یاد کرانے کی نشانی مقرر کر دینا) کی طرح ہے جو انسان کو غفلت سے بیدار کرتی ہے، انسان کو اس کی ضرورت یاد دلاتی ہے۔

اس سورۃ کا انیسواں نام سورۃ النور ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے، تو اللہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے، اور سورۃ الاخلاص

آپ کے دل کو منور کرتی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ نُورٌ وَنُورُ الْقُرْآنِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، ہر چیز کا ایک نور ہے اور قرآن کریم کا نور سورۃ قل ھو اللہ احد ہے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ نورِ انسانی اس کے سب سے چھوٹے عضو یعنی آنکھ کی سیاہی میں ہوتا ہے، تو یہ سورت گویا کہ انسان کے لیے اس سیاہی کی طرح ہوئی۔

اس سورت کا بیسواں نام سورۃ الامان ہے، رحمت دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا إِذَا قَالَ الْعَبْدُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ حِصْنِي وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي أَمِنَ مِنْ عَذَابِي، جب بندہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو میرے قلعے میں داخل ہو جاتا ہے اور جو میرے قلعے میں داخل ہو جاتا ہے وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

احادیث نبویہ میں موجود ہے کہ سورۃ الاخلاص کی تلاوت تہائی قرآن کریم کے برابر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام شریعتوں میں اور تمام عبادات میں مقصود اللہ، اللہ کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت ہے، اور یہ سورت معرفت ذات پر مشتمل ہے، تو یوں یہ سورت تہائی قرآن کریم کے برابر ہوئی۔

بندے کے لیے بلند ترین درجات میں سے یہ ہے کہ اس کا دل اللہ کے نور اور اس کی کبریائی اور عظمت سے روشن ہو اور یہ چیز اس سورت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اگر یہ کہا جائے کہ تمام سورتوں میں عظمت و کبریائی کی صفات بیان کی گئی ہیں تو اس کو تسلیم کرتے ہوئے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ الاخلاص میں یہ صفات کبریائی خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں، اس لیے بھی کہ سورۃ الاخلاص چھوٹی سورت ہے یہ انسانی دلوں میں محفوظ رہ جاتی ہے، اللہ جل جلالہ کی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے اس لیے ان فضائل کی بناء پر تمام سورتوں سے سورۃ الاخلاص کو امتیازی شان ملی۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ: فرما دیجیے وہ اللہ ایک ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ قل میں اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی طرف کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا حکم

ہو رہا ہے اور لفظ اللہ اس ذات کا نام ہے جو واجب الوجود ہے اور تمام کمالات کا جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے۔

اَحَد اور وَاحِدٌ دونوں کا ترجمہ تو ایک ہی کیا جاتا ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے لفظ احد کے معنٰی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ترکیب اور تنزیہ سے اور تعدد سے اور کسی چیز کی مشابہت اور مشاکلت سے پاک ہے یعنی وہ کسی ایک یا متعدد مادوں سے نہیں بنا، نہ اس میں تعدد کا کوئی امکان ہے نہ کسی کے مشابہ ہے، یہ جواب ہو گیا ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کے متعلق پوچھتے تھے کہ وہ سونے چاندی کا ہے یا کسی جوہر کا؟ اس ایک مختصر جملہ میں ذات وصفات کے سب مباحث آ گئے اور لفظ قل میں نبوت ورسالت کا مسئلہ آ گیا، اس میں غور کرو تو یہ ایک مختصر جملہ ان عظیم الشان مباحث کو حاوی ہے جو بڑی بڑی جلدوں میں لکھے جاتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اللّٰهُ الصَّمَدُ: اللہ بے نیاز ہے۔ صمد وہ ذات ہے جس کے سب محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو، صمد وہ ذات ہے جس سے لوگ اپنی حاجات وضروریات کے لیے رجوع کریں اور اسے کسی کی ضرورت نہ ہو۔

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، **هُوَ السَّيِّدُ الَّذِي قَدِ انْتَهَى سُودَدُهُ فِي أَنْوَاعِ الشَّرَفِ وَالسُّودَدِ**، صمد وہ سردار ہے جس کی سرداری مکمل ہے اور وہ شریف ہے جس کا شرف کامل ہے وہ عظیم ہے جس کی عظمت کامل ہے وہ حلیم ہے جس کا حلم پورا ہے اور وہ علیم ہے جس کا علم کامل ہے وہ حکیم ہے جس کی حکمت پوری ہے اور وہ ذات ہے جو شرف اور سرداری کے تمام انواع میں کامل ہے، یہ معنٰی بہت کامل اور اکمل ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **إِنَّهُ الْمُسْتَغْنِي عَنْ كُلِّ أَحَدٍ، وَالْمُحْتَاجُ إِلَيْهِ كُلُّ أَحَدٍ** صمد وہ ہے جو ہر کسی سے بے نیاز ہو اور ہر کوئی اس کا محتاج ہو۔

شیخ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ **الْمَقْصُودُ فِي الرَّغَائِبِ، وَالْمُسْتَعَانُ بِهِ فِي الْمَصَائِبِ،**

الصمد اسے کہتے ہیں جو قیمتی اور مرغوب چیزوں میں مقصود اور مصائب ومشکلات میں مدد گار ہو۔

حسین بن فضل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الَّذِی یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیدُ، صمد وہ ہے جو جو چاہے کرے اور جو چاہے فیصلہ کرے۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں الْکَامِلُ الَّذِی لَا عَیْبَ فِیہِ، صمد اس کامل ذات کو کہتے ہیں جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ صمد کا معنیٰ غنی ہے، قرآن میں اللہ کو الغنی الحمید کہا گیا، صمد وہ ہے جس کے اوپر کوئی نہ ہو، اسے قرآن کریم نے اپنے بندوں پر قاہر بتلایا ہے، صمد وہ ہے جس کی بارگاہ میں حاجات پیش کی جائیں، صمد وہ ہے جو کھلاتا ہے اور خود کھاتا نہیں ہے، صمد وہ ہے جو اس وقت بھی باقی ہوگا جب ساری کائنات فنائیت کے گھاٹ اتر جائے گی۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو لم یزل اور لایزال یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس پر زوال نہیں آئے گا، وہ ہمیشہ سے تھا اور اس کا مکان نہیں ہے، اس کے لیے کہاں اور وقت کی قید نہیں ہے، وہ اب بھی اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صمد وہ ہے جسے موت نہیں آئے گی، جس کے لیے وراثت نہیں ہے جب کہ آسمان وزمین اس کی میراث ہیں، ابو مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صمد وہ ذات ہے جو سوتی نہیں اور بھولتی نہیں، ابن کیسان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جس میں کسی کی صفت کے ساتھ تعریف نہیں کی جاسکتی، ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں صمد وہ ذات ہے جس کا آفات وبلیلات گھیراؤ نہیں کرسکتیں، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں صمد وہ ہوتا ہے جو اپنی تمام صفات اور اپنے تمام افعال میں کامل ہو، امام جعفر صادق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو غالب آتا ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

صمد وہ ہے جسے انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی، محمد قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کی کوئی اولاد ہو، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صمد وہ بہت بڑی ہستی ہے جس کے اوپر کوئی بھی نہیں، صمد وہ ہے جو نقص وزوال قبول کرنے سے پاک ہو، صمد وہ ہے جس پر تغیرات اور تبدلات نہیں آتے، زمانے اور اماکن، آنات اور جہات اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ: اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس آیت کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اولاد کی نفی کی ہے اور پھر دوسرے حصہ میں اس کی نفی کی ہے کہ وہ خود کسی کی اولاد ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی اولاد ہے، البتہ اس کے کئی فرقے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، مشرکین مکہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور یہود یہ کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی یہ کہتے تھے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اولاد اس لئے نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد والد کی جنس سے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ واجب اور قدیم ہے، اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ بھی واجب اور قدیم ہوتی اور جو پیدا ہو وہ واجب اور قدیم نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ممکن اور حادث ہو گا۔

عیسائی یہ کہتے ہیں کہ ہم مسیح کو اللہ کا بیٹا اور اللہ کو اس کا باپ کہتے ہیں، یہ اطلاق مجازی ہے اور یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانی طور پر مسیح کا باپ ہے بلکہ اس کو عزت اور بزرگی کے طور پر باپ کہا جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسے اسماء کا اطلاق کیا جاتا ہے جن میں نقص کا پہلو نہ ہو اور ان صفات کا اطلاق کیا جاتا ہے جو اس کی شان کے لائق ہوں اور باپ ہونے میں نقص کا پہلو ہے کیونکہ اس سے جسمانی رشتہ سے باپ ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے، موجودہ انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو باپ کہتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسا برگزیدہ نبی کب اس بات سے ناواقف ہو گا کہ باپ ہونا اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کو باپ نہیں کہہ سکتے۔

مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کا جواب ہو گیا جنہوں نے کہا تھا کہ اپنے رب کا نسب بیان کریں اس میں واضح طور پر بتا دیا کہ کسی خاندان کی طرف اس کی نسبت نہیں ہے والد اور مولود میں مشابہت و مجانست ہوتی ہے وہ تو بالکل تنہا ہے ہر اعتبار سے واحد اور متوحد ہے وہ کسی کی اولاد ہو یہ بھی محال ہے اور اس کے کوئی اولاد ہو یہ بھی ناممکن ہے۔ سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ

مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا {۹۰} اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا {۹۱} وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا {۹۲} (سورۃ مریم)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کرلی ہے تم نے یہ ایسی سخت حرکت کی ہے اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے ہے اس کا وجود ازلی و ابدی ہے وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور اس کی اولاد ہونا اس کی شان احدیت کے خلاف ہے لہٰذا مشرکین نے اس کے لیے جو اولاد تجویز کی ہے جیسا کہ عرب کے مشرکوں نے فرشتوں کو اس کی بیٹیاں بتایا اور یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت مسیح ابن مریم علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا بتایا، یہ سب باطل اور جھوٹ ہے یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا والد بنے۔ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ، يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ، اس میں ہر طرح کی برابری کی نفی فرمادی کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا مثل نہیں اور برابر نہیں، نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں وہی معبود وحدہ لاشریک ہے صرف وہی حاجتیں پوری فرماتا ہے وہی علیم ہے قدیر ہے حکیم ہے حی لایموت ہے سب اسی کی طرف متوجہ ہوں اسی سے مانگیں اور اسی کی عبادت کریں۔

سورۃ الاخلاص اور سورۃ الشوریٰ کی آیت لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ {۱۱} کو سامنے رکھا جائے، ان دونوں میں بہت جامع طریقے پر اللہ تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی ہے اثبات المحامد بھی اور معایب اور نقائص سے تنزیہہ کا بیان بھی ہے، تجسیم تشبیہ تعطیل سب اس کی شان عالی کے خلاف ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ ہم کفو اس کو کہتے ہیں جو رتبہ میں کسی کے

برابر ہو، اللہ نے فرمایا کہ جس طرح اس کے نہ تو بیٹا ہے نہ بیٹی اسی طرح کوئی اس کے برابر بھی نہیں ہے یعنی وہ کسی بیوی کا بھی محتاج نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے، بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ اس کا کوئی باپ ہے اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ سورۃ الاخلاص کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سورۃ الاخلاص کی پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، دوسری آیت میں فرمایا اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے، رحیم و کریم ہے، سب اس کا قصد کرتے ہیں اور وہ کسی کا قصد نہیں کرتا، تیسری آیت میں فرمایا کہ وہ والد ہے نہ ہی مولود ہے یعنی ممکنات کی صفات سے منزہ اور پاک ہے۔

پہلی آیت میں جب فرمایا کہ اللہ احد ہے، یکتا اور یگانہ ہے تو اس میں ان لوگوں کا رد ہو گیا جو بہت سے الٰہ اور معبود مانتے ہیں، جس طرح مشرکین اور عیسائی، دوسری آیت میں اللہ کی صمدیت کو بیان فرمایا گیا، کہ سب اسی کا قصد کرتے ہیں تو اس میں ان لوگوں کا رد ہو گیا جو اپنی حاجات میں بتوں کا قصد کرتے ہیں، تیسری آیت میں فرمایا کہ وہ والد نہیں ہے تو اس میں یہودیوں کا رد ہو گیا، جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے، عیسائیوں کا رد ہو گیا جو مسیح اللہ کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے، مشرکین مکہ کا رد ہو گیا جو ملائکۃ اللہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، چوتھی آیت میں فرمایا کہ اللہ کا کوئی کفو نہیں ہے اور ہم سر نہیں ہے تو اس میں مشرکین کا رد ہو گیا جو بتوں کو اللہ کے برابر سمجھتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمُتَفَرِّدُ بِالْاُلُوْھِیَّۃِ وَالرُّبُوْبِیَّۃِ وَالْأَسْمَاءِ وَالصِّفَاتِ، لَا یُشَارِکُہٗ أَحَدٌ فِیْھَا، آج سورۃ الاخلاص کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے اور اسے میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اساتذہ و مشائخ کے لیے، میرے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (غوث گارڈن مناواں لاہور)

۲۲ جولائی ۲۰۲۰ء ۳۰ ذیقعد ۱۴۴۱ء بروز بدھ پونے چار بجے علی الصبح

حروف بینی: ۳۰ نومبر ۲۰۲۰ء بروز پیر ۱۰ بجے دن

الفلق

شریروں کی شر انگیزیوں سے اللہ کی پناہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ{۱}مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ{۲}وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ{۳}وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ{۴}وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ{۵}الفلق.

جواب ترجمہ: آپ یوں کہہ دیجئے کہ میں صبح کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا فرمائی۔ اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ پھیل جائے اور گرہوں پر پھونکنے والیوں کے شر سے۔ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ: آپ یوں فرما دیجیے کہ میں صبح کے رب کی پناہ لیتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاخلاص پڑھنے کا حکم فرمایا جس میں اللہ کی ذات وصفات سے متعلق ان چیزوں سے اس کی پاکی اور صفائی بیان کی گئی جو اللہ کے شایان شان نہیں تھیں، جو کہ بہت بڑی بڑی طاعات میں سے تھا تو گویا بندہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار! یہ بہت ہی بڑی نیکی ہے جسے میں اپنے طور پر پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، تو اللہ تعالیٰ نے بندے کے تصورات و تخیلات کے پیش نظر فرمایا کہ تو یوں کہہ دے کہ میں صبح روشن کرنے والے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں، میں اسی کی پناہ میں آتا ہوں، تاکہ وہ عالی ذات اس بندے کو کامل وجوہ سے اس نیکی کو بجالانے کی توفیق مرحمت فرمادے۔

پھر جب کفار نے رسول کریم ﷺ سے اللہ کے نسب اور اللہ کی صفت سے متعلق سوال کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں جاہلوں کی اس جسارت سے کیسے نجات حاصل کروں؟ جس میں انہوں نے وہ بات کہہ دی جو میرے پروردگار کے شایان شان ہی نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ یوں کہیں کہ میں صبح نکالنے والے رب کی پناہ مانگتا ہوں، اللہ بتارہے ہیں کہ آپ میری ذات سے پناہ کے طلب گار بنیں تاکہ میں آپ ﷺ کو ان کفار کی شر

انگیزیوں سے محفوظ رکھوں۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں گویا اللہ تعالیٰ یوں فرمانا چاہتے ہیں کہ جو شخص میرے گھر بیت اللہ شریف میں پناہ پکڑے گا میں اسے بزرگی دے دوں گا اور میں اسے امن دے دوں گا، جیسے سورۃ آل عمران کی آیت ۹۷ میں ارشاد فرمایا کہ جو اس گھر میں داخل ہو گا وہ امن والا ہو جائے گا، اس لیے آپ ﷺ میری پناہ تلاش کریں یہاں تک کہ میں آپ ﷺ کو امن عطا کر دوں، اس لیے آپ فرمادیجیے کہ میں صبح پیدا کرنے والے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ (تفسیر الکبیر)

اہل علم کے درمیان اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا تعویزات اور تعوذ کے ذریعے استعانت جائز ہے یا کہ نہیں؟ تو بعض اہل علم کہتے ہیں کہ جائز ہے اور وہ اِن دلائل سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے تو جبریل اَمین نے آپ ﷺ کا اس دَم کے ذریعے علاج کیا اور یوں کلمات ادا کیے بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، وَاللّٰهُ يَشْفِيكَ (الکبیر) میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کو دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ ﷺ کو تکلیف دے رہی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو شفا عطا فرمائیں گے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے کہ حضرت رسول کریم ﷺ ہمیں ہر قسم کے دردوں اور بخار سے نجات کے لیے یہ دعا سکھایا کرتے تھے بِسْمِ اللّٰهِ الْكَرِيمِ، أَعُوذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ مِنْ شَرِّ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ، وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ (ترمذی، ابن ماجہ) عزت والے اللہ کے نام سے، میں عظمت والے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور جوش مارنے والے (خون سے بھری ہوئی) رگ کے شر سے اور آگ کی گرمی کے شر سے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مریض کے پاس جائے جس کی موت کا وقت نہ آگیا ہو تو تیمارداری کرنے والا سات بار یوں کہے کہ أَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ أَنْ يَشْفِيَكَ (الکبیر) میں عظمت والے اللہ، عرش عظیم کے رب سے سوال کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفا عطا فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے شفاء عطا فرمادیں گے۔

چوتھی دلیل یہ ہے، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مریض کی عیادت کے لیے جاتے تھے تو آپ ﷺ یہ کلمات کہا کرتے تھے،

أَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ، اشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَا شَافِيَ إِلَّا أَنْتَ، اے لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو لے جا، شفا عطا فرمادے تو شفا دینے والا ہے، کوئی شفا دینے والا نہیں ہے مگر تو ہی۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے نواسوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر یوں دم کیا کرتے تھے، أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ (بخاری، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، تفسیر الکبیر) میں اللہ کے بابرکت اور پورے کلمات کے ساتھ تم دونوں کو پناہ میں دیتا ہوں۔ ہر شیطان اور زہریلے کیڑے سے اور ہر نظر بد سے جو مجنون بھی کر دیتی ہے۔

ان کلمات کے ذریعے دم کرنے کے بعد آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میرے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے بیٹوں اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر یہی کلمات پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔

چھٹی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفی فرماتے ہیں کہ میں حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، مجھے اس قدر درد تھا کہ قریب تھا کہ میں ختم ہو جاتا، پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اپنا دائیاں ہاتھ اس درد والی جگہ پر رکھو اور سات مرتبہ یہ کلمات کہو، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عطا فرمادی، وہ کلمات یہ ہیں بِسْمِ اللهِ أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ،

ساتویں دلیل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ جب سفر کیا کرتے اور کسی مقام پر پڑاؤ ڈالتے تو یوں فرماتے تھے يَا أَرْضُ، رَبِّي وَرَبُّكِ اللهُ أَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِيكِ وَشَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْكِ، وَشَرِّ مَا يَدِبُّ عَلَيْكِ، وَأَعُوذُ بِاللهِ مِنْ أَسَدٍ وَأَسْوَدٍ وَحَيَّةٍ وَعَقْرَبٍ، وَمِنْ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ، اے زمین! میرا اور تیرا رب اللہ ہے، میں پناہ مانگتا ہوں

تیرے شر سے اور اس چیز کے شر سے جو کچھ تیرے اندر ہے اور اس چیز سے جو تیرے اندر سے نکلتی ہے، اور اس چیز کے شر سے جو تیرے اوپر رینگتی ہے اور میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی ایک شیر سے اور بہت سے شیروں سے، سانپ سے اور بچھو سے اور شہر کے رہنے والوں کے شر سے اور نقصان دینے والی چیزوں کے باپ اور ان کی اولاد کے شر سے۔

آٹھویں دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جسم میں اگر کوئی بیماری ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ الاخلاص اور آخری دو سورتیں اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر پڑھتے اور اسے اس جگہ پر پھیرتے جہاں تکلیف ہوتی۔

یہ دلائل ان لوگوں کے ہیں جن کے نزدیک دم وغیرہ کرنا جائز ہے، اور اہل علم میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کے ہاں یہ تعویذ وغیرہ ممنوع ہیں، یہ لوگ بھی ادلہ پیش کرتے ہیں، ان کی روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعویذ سے منع کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَا يَكْتُوُونَ وَلَا يَسْتَرْقُونَ وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ، بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو داغتے نہیں اور نہ ہی تعویذ وغیرہ کرتے ہیں وہ تو اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَمْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ مَنِ اكْتَوَى وَاسْتَرْقَى، جس نے داغ لگوایا اور تعویذ کیا اس نے اللہ پر بھروسہ نہیں کیا۔

ان لوگوں کو اہل علم کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ اس میں نہی کے اندر یہ احتمال پایا جاتا کہ ہو سکتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعویذوں سے منع کیا ہو جو مجہول ہوں جن کے حقائق بارے میں علم نہ ہو، لیکن وہ تعویذ جن کی اصل مضبوط ہے ان کی نہی نہیں ہے، ہاں جو تعویذ وغیرہ گلے میں لٹکائے جاتے ہیں ان کے بارے میں اہل علم میں اختلاف موجود ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَنْ عَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ إِلَيْهِ، جس شخص نے کوئی چیز (گلے میں) لٹکائی وہ اسی کے سپرد کیا گیا۔

ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یوں آتا ہے کہ أَنَّهُ رَأَى عَلَى أُمِّ وَلَدِهِ تَمِيمَةً مَرْبُوطَةً بِعَضُدِهَا فَجَذَبَهَا جَذْبًا عَنِيفًا فَقَطَعَهَا، انہوں نے اپنی اُم ولد کو دیکھا کہ اس نے ایک تعویذ اپنے بازو کے ساتھ باندھا ہوا ہے، آپ نے اسے سختی اور غصے کے ساتھ کھینچا پھر اسے کاٹ ڈالا۔

جو لوگ تعویذ وغیرہ کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں کہ حضرت امام باقر رحمہ اللہ سے بچوں کی گردن میں لٹکائے جانے والے تعویذ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بچوں کی گردن میں تعویذ لٹکانے کی اجازت دے دی۔ (تفسیر کبیر)

ہاں البتہ پھونکنے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تھے تو اپنے اوپر معوذات (آخری دو سورتیں) پڑھ کر پھونکا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ کو پھیرا کرتے تھے، پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جس تکلیف میں رحلت فرمائی اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذات پڑھ کر پھونکا کرتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوپر پڑھا کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر اِستراحت پر جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں پر آخری دو سورتیں پڑھ کر پھونکتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے جسم پر پھیرتے تھے۔

یہ ان لوگوں کے دلائل تھے جن کے نزدیک قرآن کریم کی آیات پڑھ کر اپنے جسم پر پھونکنا اور دوسرے کے جسم پر پھونکنا جائز ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک قرآنی آیات پڑھ کر اپنے یا دوسروں کے جسم پر پھونکنا جائز نہیں ہے وہ بھی دلائل دیتے ہیں، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تعویذ کرنے والے کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ قرآنی آیات پڑھ کر پھونکیں مارے، نہ ہاتھ پھیرے اور نہ گرہیں باندھے۔

جناب ابراہیم تعویذ میں پھونک مارنے کو مکروہ جانتے تھے، اہل علم میں سے ایک کا کہنا ہے کہ وہ

حضرت ضحاک رحمہ اللہ کے پاس گئے، جب کہ انہیں تکلیف تھی، تو میں نے ان سے کہا اے ابو محمد! کیا میں آپ کو تعویذ نہ کروں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں، لیکن پھونکیں نہیں، پھر میں نے انہیں آخری دو سورتوں کے ساتھ دم کیا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے ان پھونکوں پر نکیر فرمائی ہے جو گرہوں پر لگائی جاتی ہیں، جو جادوگروں کا مضر طریقہ کار ہے، گرہوں پر پھونکیں لگانے کی مذمت کی گئی ہے، جن سے روح اور بدنوں میں نقصان پہنچتا ہے، ہاں اگر یہ پھونکنا ارواح اور ابدان کی درستی کے لیے ہو تو اس میں یہ بات ضروری ہے کہ کوئی حرام کام اس میں نہ کیا گیا ہو۔

اللہ اور رب: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے آغاز کے لیے سورۃ الاعراف میں جب ذکر فرمایا تو ارشاد ہوا کہ جب قرآن کریم شروع کرو تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو، جب کہ یہاں سورۃ الفلق کے شروع میں رب الفلق سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، سورۃ المومنون میں ہمزات الشیاطین سے پناہ مانگنے کے ذکر میں رب کا ذکر فرمایا گیا، اسی طرح احادیث میں جب پناہ مانگی گئی تو وہاں بکلمات اللہ التامات فرمایا گیا، اور اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں میں سب سے افضل نام اللہ ہی ہے، جہاں تک اللہ کے نام رب کا تعلق ہے تو وہ رب تعالیٰ پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اللہ کی مخلوق کے لیے بھی یہ نام استعمال ہوتا ہے، جیسے سورت یوسف میں مختلف معبودوں کے تذکرے میں ارباب (لفظ رب کی جمع) استعمال کیا گیا، تو یہاں اللہ نے رب الفلق کہنے کا حکم دیا، اعوذ باللہ کہنے کا یہاں حکم نہیں دیا۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی کئی وجوہ ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ نے سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں قرآن کریم پڑھنے کے لیے استعاذہ (پناہ مانگنا) کا حکم دیا، جب کہ اس سورت میں جادو سے حفاظت نفس اور بدن کے لیے استعاذہ کا حکم دیا، تلاوت قرآن کریم سے پہلے تعوذ اہم ترین اور باعظمت موقع تھا، اس لیے یقیناً وہاں پر مناسب اللہ کا اسم اعظم اللہ ہی تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیطان آپ کی روح اور بدن کو تکلیف پہنچانے سے کہیں زیادہ آپ کی

عبادت میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے یقیناً وہاں اسم اعظم ہی کا ذکر کیا جانا تھا، جب کہ یہاں روح اور بدن کا معاملہ تھا اس لیے یہاں اسم اعظم استعمال نہیں فرمایا۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن کریم کی آخری سورتوں میں سے ایک ہے، اس لیے یہاں لفظ رب استعمال فرما کر خبردار کر دیا کہ تجھ سے اللہ کی تربیت اور احسان ختم نہیں ہو گا۔

اب اگر یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی آخری سورۃ میں اسم الالٰہ استعمال فرمایا گیا ہے، ملک الناس، الہ الناس تو امام رازی فرماتے ہیں کہ ہم اس کے جواب میں یوں کہیں گے کہ یہاں ایک باریک اشارہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ آپ فرما دیجیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس ذات کی جو میرا پروردگار ہے، لیکن وہ خناس کے وسوسوں کے لیے الٰہ قاہر بھی ہے، جو ایک شفیق باپ کی طرح ہے، جو اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ تو مشکل مہمات سے جو سیف قاطع اور جلانے والی آگ کی طرح ہیں ان سے واپس اپنے والد کی طرف لوٹ آ، تو یہاں جو یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں تو وہ وعدہ، احسان اور تربیت کی عظیم ترین اقسام میں سے ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ حضرت نبی کریم ﷺ سے یوں فرما رہے ہیں کہ آپ کا قلب اطہر میرے لیے ہے اس میں میرے غیر کو داخل نہ کریں، آپ کی زبان میرے لیے ہے اس سے میرے سوا کسی کا ذکر نہ کریں، آپ کا بدن میرے لیے ہے اسے میرے غیر کی خدمت میں مشغول نہ کیجیے، اگر آپ کو کوئی چیز مطلوب ہے تو وہ مجھ سے مانگیے، اگر آپ علم کے طالب ہیں تو مجھ سے کہیے کہ اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرمائیے، اگر آپ کو دنیا مطلوب ہے تو اللہ سے اس کا فضل مانگیے، اگر آپ کو کسی ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے تو رب الفلق سے پناہ مانگیے، کیونکہ میں وہ ذات ہوں جس نے اپنی تعریف یوں کی ہے میں صبح کا پیدا کرنے والا ہوں، میں دانے اور گٹھلی کو وجود دینے والا ہوں، میں نے یہ اشیاء آپ ہی کے لیے پیدا کی ہیں، تو جب میں نے یہ ساری چیزیں آپ ہی کے لیے پیدا کی ہیں تو کیا میں آپ کو ان آفات، مصائب اور بلاؤں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا؟

فَلَق: ارباب تفسیر نے فلق کے کئی مفاہیم بیان فرمائے ہیں، اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فلق سے

مراد صبح ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ یہاں تعوذ کی اس تخصیص بارے کئی وجوہ ذکر فرماتے ہیں، اس میں پہلی وجہ یہ ہے اس جہان سے ان سخت اندھیروں کو ہٹانے پر قدرت رکھنے والی ذات اس پر بھی قادر ہے کہ وہ پناہ مانگنے والے سے ہر وہ چیز دور کر دے جو اسے خوف زدہ کرے یا اسے ڈرائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ طلوع صبح کی مثال کشادگی کے آنے کی ہے، جیسے ایک انسان رات میں طلوع صبح کا منتظر رہتا ہے اسی طرح ایک خوف زدہ انسان صبح نجات کے طلوع کی انتظار میں رہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ صبح کے وقت کی تخصیص کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت مظلوم اور بے قرار لوگ اپنی حاجات میں اپنے رب سے دعائیں کرتے ہیں، گویا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس وقت کے رب کی پناہ طلب کرتا ہوں، جو ہر رنج اور فکر سے کشادگی عطا فرماتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تو ان کے گھٹنے میں سخت درد اٹھا، انہوں نے رات جاگتے میں گزاری، جو طلوع صبح کا وقت قریب ہوا تو حضرت جبریل علیہ السلام اللہ کے امر سے انہیں تسلی دینے اور یہ کہنے کے لیے تشریف لائے کہ وہ اپنے پروردگار سے دعا مانگیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اے جبریل! آپ دعا کریں تو میں آمین کہوں گا، چنانچہ جبریل امین نے دعا مانگی اور یوسف علیہ السلام نے آمین کہی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور کر دی، جب یوسف علیہ السلام کی خوشحالی کا وقت آیا تو جبریل امین نے کہا کہ میں دعا مانگتا ہوں تو آپ امین کہیں، یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ تمام اہل مصیبت کی مصیبت اس وقت دور کر دے۔

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں میں یوں دعا کی، يَا عُدَّتِي فِي شِدَّتِي وَيَا مُؤْنِسِي فِي وَحْشَتِي وَيَا رَاحِمَ غُرْبَتِي وَيَا كَاشِفَ كُرْبَتِي وَيَا مُجِيبَ دَعْوَتِي، وَيَا إِلَهِي وَإِلَهَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ارْحَمْ صِغَرَ سِنِّي وَضَعْفَ رُكْنِي وَقِلَّةَ حِيلَتِي يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، اے مجھے میری شدت کے زمانے میں سازوسامان فراہم کرنے والے، اے میری وحشت میں غمخواری کرنے والے، اے میرے پردیس میں رحم کرنے والے،

اے میرے غم دور کرنے والے، اے میری دعا قبول کرنے والے، اے میرے معبود، میرے آباء، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے پروردگار! میری چھوٹی عمر پر رحم فرما، میری کمزوری پر رحم فرما، میرے سازوسامان کی کمی پر رحم فرما، اے حی اے قیوم! اے ذی الجلال والاکرام۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ صبح کے وقت کو اس لیے خاص کیا ہو کہ فجر کی نماز قیامت کے تمام احوال کی جامع ہے کیونکہ فجر کی نماز میں انسان لمبا قیام کرتا ہے اور یہ لمبا قیام اسے قیامت کے دن اپنے رب کے حضور پچاس ہزار سال کے قیام کی یاد دلاتا ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (الْمُطَفِّفِينَ: ٦) جس دن تمام لوگ جہانوں کے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔

اور انسان جب نماز میں امام کی قرأت سنتا ہے تو وہ اس کو قیامت کے دن اپنے اعمال نامہ کی قرأت کی یاد دلاتا ہے: (الجاثیہ: ۲۹) یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے سامنے سچ سچ بول رہی ہے۔ اور جب انسان نماز میں رکوع کرتا ہے تو یہ اس کو اس وقت کی یاد دلاتا ہے جب مجرم اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے نَاكِسُوا رُؤُسِهِمْ (السَّجْدَةِ: ۱۲) وہ اپنے سروں کو جھکائے ہوئے ہوں گے۔

اور جب وہ نماز میں سجدہ کرتا ہے تو وہ اس کو اس وقت کی یاد دلاتا ہے جب کافروں کو سجدہ کے لئے بلایا جائے اور وہ سجدہ نہ کر سکیں گے، وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ (الْقَلَمِ: ۴۲) اور ان کو سجدہ کیلئے بلایا جائے گا، سو وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

اور جب وہ قعدہ میں دوزانو بیٹھا ہو گا تو یہ اس کو اس وقت کی یاد دلائے گا جب تمام امتیں گھٹنوں کے بل گری ہوں گی، ارشاد ہے وَتَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً (الْجَاثِيَةِ: ۲۸) اور آپ دیکھیں گے کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہو گی۔

گویا کہ اللہ سے پناہ طلب کرنے والا یہ کہتا ہے إِلَهِي كَمَا خَلَّصْتَنِي مِنْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ فَخَلِّصْنِي مِنْ هَذِهِ الْأَهْوَالِ، اے میرے رب! جس طرح تو نے مجھے رات کے اس اندھیرے سے نجات دی ہے مجھے ان ہولناک مصائب سے بھی نجات عطا فرما۔

چھٹی بات یہ ہے کہ فجر کا وقت بہت سعادت اور قبولیت کا وقت ہے، ارشاد ہے إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوداً (الإسراء: ۷۸) بیشک فجر کے وقت قرآن پڑھنے میں (فرشتے) حاضر ہوتے ہیں۔

اس وقت میں رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں، اس لئے اس وقت پناہ طلب کرنے والے کی قبولیت زیادہ متوقع ہے۔

ساتویں بات یہ ہے کہ فجر کا وقت گڑگڑا کر دعا کرنے اور توبہ واستغفار کرنے کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرنے کے بہت مناسب ہے، ارشاد ہے وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (آل عمران: ۱۷) اور جو لوگ سحر کے وقت اللہ سے استغفار کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

آٹھویں بات یہ ہے فجر کو خاص طور پر ذکر کرنے میں اس بات کا احتمال ہے چونکہ وہ قیامت کے دن کا ایک نمونہ ہے، کیونکہ مخلوق مردوں کی طرح ہے، انسانی گھر قبروں کی طرح ہیں، پھر ان میں سے بعض اپنے گھر سے مفلسی اور عریانی کی حالت میں نکلتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، بعض وہ ہوتے ہیں جو مقروض ہوتے ہیں جنہیں قید خانے کی طرف کھینچا جاتا ہے۔

بعض وہ ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی طرح ہوتے ہیں جن کی بات مانی جاتی ہے، ان کے سامنے سواریاں پیش کی جاتی ہیں لوگ ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، اسی طرح قیامت کے دن ہوگا بعض ثواب کے اعتبار سے مفلس ہوں گے، بعض لباس تقویٰ کے اعتبار سے خالی ہوں گے، جنہیں پروردگار کی طرف کھینچا جائے گا، اور جو عبادت گزار دنیا میں اپنے پروردگار کا اطاعت گزار رہا ہوگا اس کی بادشاہوں کی طرح آخرت میں اطاعت کی جائے گی، براق اس کے سامنے پیش کی جائے گی۔

فلق کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ فلق سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ پیدا کرتے ہیں جیسے زمین کہ اللہ تعالیٰ اس میں سے نباتات پیدا کرتے ہیں، دانے اور گھٹلی پیدا کرتے ہیں، پہاڑوں سے پانی کے چشمے بہاتے ہیں، بادلوں سے بارش برساتے ہیں، ماؤں کے رحموں سے اولاد نکالتے ہیں، انڈے سے چوزے کو باہر لاتے ہیں دلوں سے معارف باہر لاتے ہیں۔

جب آپ مخلوق پر غور کریں گے تو آپ پر یہ بات واضح ہوگی کہ اکثر انقلابات رونما ہوئے

ہیں، اللہ چیزوں کو عدم سے وجود میں لایا ہے، اللہ وہ ذات ہے جو اس وقت بھی تھی جب کچھ نہیں تھا، اسی ذات نے ساری چیزیں پیدا کی ہیں، یہی مراد ہے فلق سے۔

ایک قول یہ ہے کہ فلق جہنم میں ایک وادی کا نام ہے، بعض صحابہ سے مروی ہے کہ جب وہ ملک شام سے واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے کچھ ذمیوں کے مکان دیکھے، جن کی خستہ حالی دیکھ کر انہوں نے کہا کہ کیا ان کے پیچھے فلق نہیں ہے؟ پوچھا گیا کہ فلق کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ فلق جہنم میں ایک گھر ہے، جب اسے کھولا جاتا ہے تو تمام جہنمی اس کی سخت گرمی کی وجہ سے چیخ مارتے ہیں، اس کا یہاں خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جیسا عذاب دینے پر قادر ہے، جو انسانی وہم و گمان سے باہر ہے، پھر یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اللہ کی رحمت اس کے عذاب سے بہت بڑی اور بہت کامل ہے، گویا کہ وہ کہتا ہے کہ اے سخت عذاب والے میں تیری اس رحمت سے پناہ مانگتا ہوں جو بہت بڑی اور بہت کامل، بہت تمام، بہت آگے بڑھی ہوئی اور تیرے عذاب سے بہت آگے ہے۔ (کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ فلق جہنم میں ایک کنوئیں کا نام ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے الفلق کے بارے میں پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے مجھے جواب دیا کہ **هُوَ سِجْنٌ فِی جَهَنَّمَ يُحْبَسُ فِيهِ الْجَبَّارُونَ وَالْمُتَكَبِّرُونَ، وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَتَعُوذُ بِاللهِ تَعَالٰى مِنهُ** (روح المعانی) وہ جہنم میں ایک قید خانہ ہے، جس میں جابروں اور متکبروں کو قید کیا جائے گا، جہنم بھی اللہ کی بارگاہ میں اس سے پناہ مانگتی ہے۔

حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی، اس میں آپ ﷺ نے سورۃ الفلق کی تلاوت کی، پھر مجھ سے پوچھا کہ اے ابن عنبسہ! جانتے ہو تم کہ فلق کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ ہی بہت بہتر جانتے ہیں، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **بِئْرٌ فِی جَهَنَّمَ فَإِذَا سُعِّرَتِ الْبِئْرُ فَمِنهَا تُسَعَّرُ جَهَنَّمُ لَتَتَأَذَّى مِنهُ كَمَا يَتَأَذَّى ابْنُ آدَمَ مِن جَهَنَّمَ** وہ جہنم میں ایک کنواں ہے، جب اس کنویں کو بھڑکایا جاتا ہے تو اس سے جہنم

بھڑک اٹھتی ہے، اسے اس کے بھڑکنے سے اس طرح تکلیف ہوتی ہے جس طرح ابن آدم کو جہنم سے تکلیف ہو گی۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ: رب الفلق کی پناہ لیتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا فرمائی۔ یہاں ما خلق میں عموم ہے، اس میں اللہ کی پیدا کردہ ہر مخلوق آگئی، اللہ کی مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی جارہی ہے، اس عموم میں انسان شامل ہیں، جنات شامل ہیں، حیوانات شامل ہیں، جمادات شامل ہیں، چیر پھاڑ کھانے والے جانور شامل ہیں، ڈسنے والے، ڈنک مارنے والے، بھنبھوڑنے والے، سانپ، بچھو، اژدھے، جلانے والی آگ، ڈبونے والا پانی، اڑانے والی ہوائیں اور بگولے اور ہر وہ چیز اس "ما خلق" کے عموم میں داخل ہے، جس سے کسی کو کوئی اذیت، تکلیف جسمانی ہو یا روحانی پہنچ سکتی ہے حتی کہ اپنے نفس کی شر انگیزیاں بھی اس عموم میں شامل ہیں۔

مفسر قرآن حضرت عطاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ابلیس شیطان خصوصیت سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق اس سے زیادہ شریر پیدا نہیں کی، چونکہ یہ سورت جادو وغیرہ سے پناہ مانگنے سے متعلق ہے تو جادو وغیرہ ابلیس، شیطان اور اس کے اعوان وانصار اور مساعدین ابلیس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لیے ابلیس خصوصی طور پر مراد ہے۔

بعض ارباب تفسیر یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد جہنم ہے، گویا کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ آپ کہہ دیجیے کہ میں جہنم کے رب کی پناہ مانگتا ہوں اور جو کچھ اس نے اس میں پیدا کیا ان کے شدائد اور سختیوں سے پناہ چاہتا ہوں۔

بعض یہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں جیسے بیماریاں، قحط، آزمائشیں، آفات وبلائیں مگر شیخ جبائی اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس تفسیر کو باطل قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے فعل کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کو شر کے ساتھ موصوف کیا جائے، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال حکمت اور صواب پر مبنی ہوتے ہیں، انہیں شر کہنا جائز نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ: اور صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں غاسق سے جب وہ داخل ہوتا ہے۔ غاسق رات کو اس وقت کہتے ہیں جب اس میں گھپ اندھیرا چھا جائے، سورۃ الاسراء کی آیت ۷۸ میں اس گھپ اندھیری رات کا ذکر ہے، اسی طرح عربی زبان میں غسقت العین اس وقت کہتے ہیں جب آنکھ آنسوؤں سے بھر جائے، اسی طرح غسقت الجراحہ اس وقت کہتے ہیں جب زخم خون سے بھر جائے، ابن قیس کہتے ہیں

إِنَّ هٰذَا اللَّيْلَ قَدْ غَسَقَا ... وَاشْتَكَيْتُ الْهَمَّ وَالْأَرَقَا

ترجمہ: بے شک یہ رات خوب گہری اور سیاہ ہو چکی ہے، اور میں نے غم اور بے خوابی کی شکایت کی ہے۔

زجاج کہتے ہیں کہ غاسق کا لغت میں معنیٰ ٹھنڈا، تو اس لحاظ سے رات کو غاسق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن سے ٹھنڈی ہوتی ہے، اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان میں زمہریر کا استعمال ہوا ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ غاسق اور غساق کا معنیٰ بہنے والا، رات کو غاسق کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں اندھیرے زمین پر اترتے ہیں۔

اِذَا وَقَبَ: عربی میں وقوب کا معنیٰ کسی دوسری چیز میں اس طرح داخل ہونا کہ آنکھ سے اوجھل ہو جائے، گڑھے میں داخل ہونا، باب افعال سے ایقاب کا معنیٰ پتھر کے گڑھے میں داخل کرنا، الوقب مصدر ہو تو معنیٰ پتھر کا وہ گڑھا جس میں پانی جمع ہو جائے، آنکھوں کا گڑھا، روشن دان، کاندھوں کے درمیان کی گہرائی۔

حضراتِ اہل تفسیر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ رات کی سیاہی اور تاریکی کے شر سے پناہ مانگنے کا فرمایا گیا ہے کیونکہ رات جب چھا جاتی ہے تو درندے اپنی جھاڑیوں سے، حشرات اپنے رہنے کی جگہوں سے باہر آتے ہیں، چور، ڈاکو اور دشمن حملہ کرتے ہیں، آتش زدگی ہو جائے تو ایسے موقع پر مددگار بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

شیخ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ومن شر غاسق اذا وقب اندھیری کے شر سے جبکہ پھیل جائے، اول تو رات کی اندھیری ہے جو محسوس ہے اور اسی لیے اکثر مفسرین نے غاسق سے مراد

اندھیری رات لی ہے، اندھیری رات میں موذی اور درندے جانور نکلتے ہیں ان سے اذیت پہنچتی ہے اور چور و قزاق بھی نکلتے ہیں، لوگوں کو شر پہنچاتے ہیں، جن و خبائث نکلتے ہیں کس لیے کہ نور سے ان کو نفرت ہے کیونکہ ان کا مادہ ظلمانی ہے، ان سے بھی بنی آدم کو اذیت پہنچتی ہے۔

دوسری بہیمیت اور قوائے شیطانیہ کی اندھیری ہے معاذاللہ جب یہ آکر گھیر لیتی ہے تو پھر شر ہی شر ہے اس میں غصہ ہے تو وہ ہے جو نہیں کرنا تھا وہ کرا دیتا ہے، طمع ہے تو وہ ہے جو دام میں پھنسا کر دارین کے قید خانہ میں قید کرا دیتی ہے اور شہوت وہ بلا ہے کہ الٰہی توبہ! پھر ادراک و شعور میں بھی فرق آجاتا ہے اچھے کام برے اور برے کام اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں وہ نور عقل و ایمان زائل ہو جاتا ہے۔

تیسری حجابات روحانیہ کی اندھیری ہے جو واصلانِ محبوب پر طاری ہو جاتی ہے اور ان کو مشاہدہ سے محروم کر دیتی ہے، پھر اس سے بڑھ کر ان کے لیے کیا شر ہے جو شر محض ہے ان سب شروں سے اسی سے پناہ مانگنی چاہیے جو ان سب اندھیریوں کو دور کر کے روشنی نکالتا ہے اور خدا کے صفات میں سے بالخصوص رب الفلق کو ان شروں سے پناہ مانگنے میں ذکر کرنے کی یہی وجہ ہے۔ (تفسیر حقانی)

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رات کی تاریکی کی شدت کا ذکر ہو رہا ہے کہ جب اس کی ظلمات کائنات کی ہر چیز کو اپنے دامن میں لپیٹ لے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جائے، یہ منظر بذات خود بڑا دہشت ناک اور کرب انگیز ہوتا ہے، نیز رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چور چوری کرتا ہے، قاتل خونریزی کرتا ہے، آبروئیں اور عصمتیں اسی کی اوٹ میں لوٹی جاتی ہیں، شر انگیز قوتیں ہر قسم کی مزاحمت سے بے خوف ہو کر شر انگیزی کی حد کر دیتی ہیں اور جس کو لوٹنا ہوتا ہے، وہ خود خواب غفلت میں بے سدھ پڑا ہوتا ہے، دشمن بے خبری میں ہو تو اس کو اپنے نرغے میں لے لیا جاتا ہے، اسے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ وہ مدد کے لیے اپنے کسی دوست کو پکار سکے، اس لیے رات کی تاریکی کے شر سے بالخصوص پناہ مانگنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

غاسق کا ایک معنیٰ چاند ہے، ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ غاسق کو چاند کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اسے

گہن لگتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے، یعنی اس کی روشنی گم ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے، ترمذی اور مسند احمد میں روایت ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تھام کر چاند کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ یَا عَائِشَةُ اِسْتَعِيْذِی بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ هٰذَا، فَإِنَّ هٰذَا هُوَ الْغَاسِقُ إِذَا وَقَبَ، اے عائشہ! اللہ کی پناہ لو اس کے شر سے یہ اندھیری ڈالنے والا ہے جب ڈوبے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ تو اللہ کی پناہ مانگ اس کے شر سے جب اسے گہن لگ جائے، امام رازی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ چاند اپنے جسم میں غیر مستنیر ہوتا ہے بلکہ اس میں تاریکی ہوتی ہے، پس یہی اس کے غاسق ہونے کی مراد ہے، اور اس کے وقوب سے مراد یہ ہے کہ مہینہ کے آخر میں اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے، اہل نجوم کہتے ہیں کہ مہینہ کے آخر میں یہ منحوس ہوتا ہے کیونکہ اس کی روشنی مسلسل کم ہوتی چلی جاتی ہے، اس کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے، اس سبب سے اس کی نحوست میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی جادوگروں کی جادوگری کے لیے مناسب وقت ہوتا ہے جس میں وہ جادو کرتے ہیں۔

ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ الغاسق اذا وقب سے مراد ثریا ستارے کا گرنا ہے، اس کے گرنے کے وقت بیماریوں میں اضافہ ہوتا ہے، ثریا ستارہ اس کے طلوع کے وقت میں بلند ہوتا ہے، اسی لیے ثریا ستارے کا نام غاسق بھی ہے۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ غاسق سے سانپوں میں سے کالا سانپ مراد لینا بھی جائز ہے اور وقوب سے مراد اسے مارنا ہے، عربی میں وقب اور نقب دونوں کا معنیٰ ایک ہی ہے، امام رازی نے صاحب کشاف کی اس تفسیر کو کئی وجوہ کی بناء پر کمزور اور ضعیف قرار دیا ہے۔ بعض اہل تفسیر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ من شر غاسق اذا وقب سے مراد سورج ہے جب وہ غروب ہو جائے، اسے غاسق اس لیے کہا گیا کہ چونکہ سورج آسمان میں تیرتا ہے، اس کی نقل و حرکت کو غسق کہا گیا اور وقوب سے مراد اس کا زمین کے نیچے ڈوبنا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ: اور پناہ مانگتا ہوں میں گرہوں پر پھونکنے والیوں کے شر سے۔ امام قرطبی اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اَلْعُقَدُ جمع ہے عُقْدَۃٌ کی جس کے معنی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً دھاگے یا رسی میں ڈالی جاتی ہے۔

نَفَثَ کے معنی پھونکنے کے ہیں، نَفّٰثَات جمع ہے نفاثہ کی جس کو اگر علامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں اور نفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں، گرہ میں پھونکنے کا لفظ اکثر، بلکہ تمام تر مفسرین کے نزدیک جادو کے لیے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا دھاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے جاتے ہیں۔

پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے، اس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آکر حضور ﷺ کو معوذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی اور معوذتین میں یہی ایک فقرہ ہے جو براہ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔

ابو مسلم اصفہانی اور زمخشری نے نفاثات فی العقد کا ایک اور مفہوم بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری، اور مردوں کے عزائم اور آراء اور خیالات پر ان کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر اگرچہ پر لطف ہے، لیکن اس تفسیر کے خلاف ہے جو سلف سے مسلم چلی آتی ہے، اور ان حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں معوذتین نازل ہوئی ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ: اور پناہ مانگتا ہوں میں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔ حاسد وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اس بات کا شدید خواہش

مند ہو کہ یہ نعمت اس شخص سے ختم ہو جائے۔

حسد کی تشریح کرتے ہوئے ابن منظور رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **إِذا تَمَنَّى أَن تَتَحَوَّلَ إِلَيهِ نِعْمَتُهُ وَفَضِيلَتُهُ أَو يُسْلَبَهُمَا هُوَ** یعنی کسی کی خوشحالی اور عزت کو دیکھ کر جلنا اور یہ آرزو کرنا کہ کاش یہ دولت اس کے بجائے مجھے ملتی، اس عزت و فضیلت سے اس کے بجائے میں بہرہ ور ہوتا اور اگر یہ چیزیں میرے نصیب میں تھیں، تو کم از کم اس سے چھین لی جاتیں، اس کو بھی ان سے محروم کر دیا جاتا۔ (لسان العرب)

یہ جذبہ انسان کی کمینگی اور خست طبع پر دلالت کرتا ہے، لیکن بات یہاں تک محدود نہیں رہتی، بسا اوقات یہ بڑے بڑے جور و ستم کا سبب بن جاتی ہے، جو انسان حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا نہیں رہتا بلکہ ایسی تدبیریں سوچتا ہے، ایسی سازشیں کرتا ہے، اس قسم کے گٹھ جوڑ کرتا ہے جس سے وہ اپنی ناپاک آرزو کو پورا کر سکے، اس سے ایسی ایسی مذموم حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جو شرف انسانی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، قابیل نے ہابیل کو حسد کی وجہ سے ہی قتل کیا تھا، ابو جہل اور دیگر کفار قریش یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضور سچے نبی ہیں، محض حسد کی وجہ سے دین اسلام کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (قرطبی)

جس انسان پر اللہ تعالیٰ کا کوئی خصوصی کرم ہوتا ہے، اس کے بدخواہ اکثر پیدا ہو جاتے ہیں، حاسدو کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، وہ بلاوجہ جلتے رہتے ہیں، انسان نہ تو خود ہر حاسد کو پہچان سکتا ہے اور نہ حاسدوں کے منصوبوں سے آگاہ ہو سکتا ہے اور اگر آگاہ ہو بھی جائے تو بسا اوقات ان کا تدارک کرنے سے قاصر ہوتا ہے، اس لیے حکم دیا جارہا ہے کہ تم اپنے رب کریم کے دامن عافیت میں پناہ لے لو، بیشک ان حاسدوں کی شر انگیزیوں سے وہی بچ سکتا ہے جسے اس کی پناہ حاصل ہو جائے۔

آسمان پر سب سے پہلے حسد شیطان نے کیا، اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، یوں آسمان میں رب العالمین کی سب سے پہلی نافرمانی حسد کی وجہ سے شیطان نے کی تھی اور زمین

میں حسد کی وجہ سے سب سے پہلی نافرمانی قابیل نے کی تھی کہ اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا۔

اس سورت کے نزول پر نبی کریم ﷺ خوش ہوئے تھے کیونکہ اس سورت میں ہمہ قسم کے شرور سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس وقت اس کی ٹوک لگ جاتی ہے، بیشک ٹوک یا نظر لگ جانا ایک امر واقع ہے، لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک و من شر حاسد اذا حسد کا مطلب یہ ہے کہ حاسد جب اپنی قلبی کیفیت کو ضبط نہ کر سکے اور عملی طور پر حسد کا اظہار کرنے لگے، اس کی بدی سے پناہ مانگنا چاہیے۔

اگر ایک شخص کے دل میں بے اختیار حسد پیدا ہو مگر وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر محسود کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کرے وہ اس سے خارج ہے، نیز یاد رکھنا چاہیے کہ حسد کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے سے اللہ کی دی ہوئی نعمت کے زوال کا متمنی ہو، باقی یہ آرزو کرنا کہ مجھے بھی ایسی نعمت یا اس سے زائد عطا ہو جو فلاں کو عطا ہوئی ہے، حسد میں داخل نہیں، اس کو غبطہ کہتے ہیں، بخاری کی حدیث لا حسد الا فی اثنتین الخ میں لفظ حسد سے یہی غبطہ مراد ہے۔ (تفسیر عثمانی)

دوسروں کے پاس نعمت دیکھ کر جل جانے اور اس سے چھن جانے کی خواہش کو حسد مذموم کہا گیا ہے، جب کہ دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے یا اس سے اچھی مل جائے تو اسے تنافس اور غبطہ کہا جاتا ہے جو محمود ہے۔

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حسد بری بلا ہے انسان کا ناس کھو دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی کو علوم سے اعمال سے یا جمال سے یا اموال اور کمال سے نواز دیتا ہے تو دیکھنے والے اس سے جلنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے بعض لوگ تو صرف اتنی آرزو ہی سے اپنے نفس کی خواہش کا کام چلا لیتے ہیں اور بعض لوگ اس میں اضافہ کر لیتے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے پاس نہ رہے بلکہ ہمیں مل جائے۔

اور بعض لوگ صرف آرزو ہی پر بس نہیں کرتے، صاحب نعمت کو تکلیف پہنچانے کے درپے

ہو جاتے ہیں اسے پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں اس کے مقابل کسی کو کھڑا کر دیتے ہیں لوگوں کو اس کی دشمنی پر ابھارتے ہیں، حکام اور اصحاب اقتدار کو اس کی مخالفت پر آمادہ کرتے ہیں اور حسد اور جلن میں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

حسد کرنے والے جنات بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی اپنے بھی اور پرائے بھی مسلم بھی اور کافر بھی، رسول اللہ ﷺ پر لبید بن اعصم یہودی نے جو جادو کیا تھا وہ حسد ہی کی وجہ سے تھا، حسد دل و دماغ کا ناس کھو دیتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے اَلْحَسَدُ حسك مَن تَعَلَّقَ بِهِ هَلَكَ، حسد ایک کانٹا ہے جس نے اسے پکڑا ہلاک ہوا۔

حسد کرنا حرام ہے اس کے حرام ہونے کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ دیا ہے حکمت کے بغیر نہیں دیا ہے اب جو حسد کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کے پاس نہ رہے تو در حقیقت یہ اللہ پر اعتراض ہے کہ اس نے اس کو کیوں نوازا اور حکمت کے خلاف اس کو اس حال میں کیوں رکھا، ظاہر ہے کہ مخلوق کو خالق کے کام میں دخل دینے کا کچھ حق نہیں ہے اور نہ مخلوق اس لائق ہے کہ اس کو یہ حق دیا جائے۔

ہم اپنے دنیاوی انتظام میں اور خانگی امور میں روزانہ ایسے کام کر گزرتے ہیں جو ہمارے بیوی بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں اگر ہمارے بیوی بچے ہمارے کام میں دخل دیں تو ہمیں کس قدر برا معلوم ہوتا ہے پھر اللہ رب العزت فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ کی تقسیم میں کسی کو دخل دینے کا کیا حق ہے؟

جب کسی کو حسد ہو جاتا ہے تو جس سے حسد کرتا ہے اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے اس کی غیبت کرتا ہے اور اس کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے گناہوں میں گھر جاتا ہے پھر اول تو نیکی کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور اگر کوئی نیکی کر گزرتا ہے تو چونکہ وہ آخرت میں اسے ملے گی جس سے حسد کیا ہے تو نیکی کرنا نہ کرنا برابر ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حسد سے بچو کیونکہ وہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے (ابو داؤد)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ارشاد فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ پہلی امتوں کا مرض یعنی حسد تم تک آپہنچا ہے اور بغض تو مونڈ دینے والا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتا ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔ (مسند احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)۔

سید عالم ﷺ نے بغض کو دین کو مونڈنے والا فرمایا، تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح استرہ ہر بال کو مونڈتا چلا جاتا ہے اور ہر چھوٹے بڑے بال کو علیحد کر دیتا ہے اسی طرح بغض کی وجہ سے سب نیکیاں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔

حاسد دنیا و آخرت میں اپنا برا کرتا ہے نیکیوں سے بھی محروم رہتا ہے اور کوئی نیکی ہو بھی جاتی ہے تو حسد کی آگ اسے راکھ بنا کر رکھ دیتی ہے، دنیا میں حاسد کے لیے حسد ایک عذاب ہے، حسد کی آگ حاسد کے سینہ میں بھڑکتی رہتی ہے اور جس سے حسد کیا ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ کسی کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا

دَعِ الْحَسُوْدَ وَمَا يَلْقَاهُ مِنْ كَمَدِهٖ كَفَاكَ مِنْهُ لَهِيْبُ النَّارِ فِيْ كَبِدِهٖ
اِذَا لُمْتَ ذَا حَسَدٍ نَفَّثْتَ كُرْبَتَهٗ وَاِنْ سَكَتَّ فَقَدْ عَذَّبْتَهٗ بِيَدِهٖ

ترجمہ: حسد کرنے والوں کو چھوڑ دو اور ان کے غم و جلن کو ان کے حال پر رہنے دو، کیونکہ ان کے سینے میں جلنے والی حسد کی آگ ہی ان کے لیے کافی عذاب ہے۔ اگر تم حسد کرنے والے کو ملامت کرو گے تو تم اس کے دل کی گھٹن اور تکلیف کو باہر نکال دو گے، اور اگر تم خاموش رہو گے تو وہ خود اپنی حسد کی آگ میں جلتا رہے گا — اور یہی خاموشی تمہاری طرف سے اس کی سزا ہے۔

کیسا اچھا کلمہ حکمت ہے جو کسی نے کہا ہے، كَفٰى بِالْحَاسِدِ اَنَّهٗ يُنْتَقَمُ وَقْتَ سُرُوْرِكَ حاسد سے انتقام لینے کے خیال میں پڑنے کی ضرورت نہیں، یہی انتقام کافی ہے کہ تمہاری خوشی کی وجہ سے اسے رنج پہنچتا ہے۔

حسد ایسی بری بلا ہے جو انسان کو جانتے بوجھتے ہوئے حق قبول کرنے سے روک دیتا ہے، یہودی اسی مرض میں مبتلا ہوئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچان لیا کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں

لیکن اس وجہ سے ایمان قبول نہیں کیا کہ ہمارے علاوہ دوسری قوم میں نبی کیوں آیا؟ انہیں ناگوار تھا کہ بنی اسماعیل میں سے اللہ نے رسول بھیجا اور یہ بات اپنے طور پر بنالی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ہمیشہ ان کی ذریت میں سے کوئی نہ کوئی نبی ضرور رہے گا۔ (کمارواہ النسائی)

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ یہ سورۂ آل عمران میں ہے اور سورۂ نساء میں فرمایا اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (بلکہ وہ لوگوں سے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے عطا فرمایا)۔

یہودی نہ صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتے تھے بلکہ یوں چاہتے تھے کہ جنہوں نے اسلام قبول کرلیا وہ بھی مرتد ہوجائیں اسی کو سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ، بہت سے اہل کتاب نے یہ آرزو کی کہ کاش تم لوگوں کو ایمان قبول کرنے کے بعد واپس لوٹا کر کافر بنادیں اپنی جانوں کی طرف سے حسد کرتے ہوئے اس کے بعد کہ ان کے لیے حق ظاہر ہوگیا۔

جس طرح یہودی حسد میں برباد ہوگئے حق کو قبول نہیں کیا اسی طرح بہت سے مشرکین بھی اسی مصیبت میں مبتلا تھے جب ایک مرتبہ اخنس بن شریق نے ابوجہل سے تنہائی میں کہا کہ اس وقت یہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے تو اپنے دل کی بات سچ بتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صادق ہیں یا کاذب ہیں، اس پر ابوجہل نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم وہ سچے ہیں انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن بات یہ ہے کہ بنو قصی ہی جھنڈے کے ذمہ دار ہیں اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت بھی انہی کے سپرد ہو چکی ہے اور کعبہ کے چابی بردار بھی وہی ہیں اور نبوت بھی ان ہی میں چلی جائے تو باقی قریش کے لیے کیا بچے گا، اس پر آیت کریمہ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ نازل ہوئی۔

منکرین کو حسد کھائے جارہا تھا کہ فلاں فلاں خدمات تو بنو قصی کو مل گئیں اب ان کے کسی آدمی کے لیے ہم نبوت کیسے تسلیم کریں؟ ان لوگوں نے کفر پر مرنا گوارا کرلیا اور دوزخ میں جانے کے لیے تیار ہوگئے لیکن حسد کی پوٹلی کو اپنے دلوں سے نہیں نکال سکے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ شَرِّ الْحُسَّادِ وَلَا

جَعَلَنَا اللّٰہ مِنھم۔

آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض خاندانوں پر حسد کی مصیبت سوار ہو جاتی ہے فلاں شخص کیوں علم حاصل کر رہا ہے فلاں شخص کے پاس کیوں اٹھیں بیٹھیں، وہ تو ایسے خاندان کا فرد ہے جسے دنیا والے اپنی نظروں میں گھٹیا سمجھتے ہیں اور وہ مال کے اعتبار سے بھی کمزور ہے اور فلاں شخص کے پاس باغ نہیں مال نہیں جائیداد نہیں اس کو علم کیسے مل گیا، اور عجیب بات یہ ہے کہ علوم اسلامیہ اور اعمال صالحہ کی طرف نہ خود بڑھتے ہیں اور نہ قوم وقبیلہ کو بڑھاتے ہیں اور اس جلن کی وجہ سے کہ فلاں شخص جو نسب اور نسل میں ہم سے کم ہے اس کے پاس کیوں جائیں جاہل رہنے کو پسند کر لیتے ہیں اور جاہل ہی رہ جاتے ہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معوذتین میں چند احادیث نقل فرما کر قرآن کریم کی ان آخری دو سورتوں پر خوب روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کیا تم کو وہ آیتیں معلوم نہیں جو آج کی رات نازل ہوئیں اور جن کی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی، وہ آیتیں یہ ہیں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔

ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ مذکور سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا میں تمہیں وہ کلمات بتاؤں جو ان تمام کلمات سے بہتر ہیں جن کے ذریعہ سے کبھی کسی پناہ مانگنے والے نے پناہ مانگی ہے، عقبہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ! ضرور فرما دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔

ترمذی نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہر ایک نماز کے بعد معوذتین (سورۃ فلق اور سورۃ ناس) پڑھنے کا حکم دیا، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد میں عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک اندھیری رات میں جبکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے اپنے گھروں سے نکلے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کریں، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پہنچے

تو ارشاد ہوا کہ کہو کیا کام ہے؟ میں چپ رہا، آپ نے پھر فرمایا کہو؟ میں پھر بھی چپ رہا تو آپ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا صبح وشام قل ھو اللہ احد اور معوذتین پڑھا کرو، تم ہر ایک قسم کے شر سے محفوظ رہو گے، ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جنوں کے شر سے اور آدمیوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، لیکن جب معوذتین نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہی کا پڑھنا اپنا معمول بنالیا اور دوسری تمام عبادتوں کو چھوڑ دیا، ترمذی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اسی کے ہم معنیٰ ایک حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے (ترمذی، تفسیر معوذتین)

نبی کریم ﷺ پر یہود کا جادو

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک شخص نے جادو کر دیا تھا جسے لبید بن اعصم کہا جاتا تھا اس کے اثر سے آپ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ آپ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ میں نے فلاں کام کیا ہے حالانکہ وہ کام ہوا نہیں تھا، یہاں تک کہ جب ایک رات رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پھر فرمایا کہ عائشہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے جو کچھ میں نے اپنے مرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا تھا میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔

ان میں سے ایک نے دوسرے سے دریافت کیا کہ ان کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے، پھر اس نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا ہے؟ جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے، پھر دریافت کیا کہ کس چیز پر کیا ہے؟ جواب دیا کہ کنگھی سے نکالے ہوئے بالوں پر اور کھجور کے پٹھوں پر جادو کیا ہے، پھر سائل نے دریافت کیا کہ یہ چیزیں کہاں ہیں؟ جواب دیا کہ ذروان نامی کنوئیں میں ہیں۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس خواب کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لے گئے وہاں جا کر دیکھا کہ اس کنوئیں کا پانی ایسا رنگین ہو چکا ہے جیسے اس میں مہندی

ڈال دی گئی ہو اور وہاں جو کھجور کے درخت تھے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شیاطین کے سر ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ نے ان چیزوں کو نکالا کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے عافیت دے دی تو مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ لوگوں میں شر پھیلاؤں (یعنی مجھے اس کا چرچا ہونا پسند نہیں) لہٰذا میں نے اس کو دفن کر دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا اس کی وجہ سے چند دن آپ کو تکلیف رہی، حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ فلاں یہودی نے آپ پر جادو کیا ہے، اس نے بالوں میں گرہیں لگا دی ہیں جو فلاں فلاں کنوئیں میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھیجا، انہوں نے اس میں سے ان بالوں کو نکالا جب آپ کی خدمت میں ان کو لایا گیا تو آپ اپنے مرض سے اس طرح شفایاب ہو گئے جیسے کوئی شخص رسی میں بندھا ہوا ہو پھر اس کو کھول دیا جائے اس یہودی سے اس بات کا تذکرہ نہیں فرمایا اور نہ اس کے بعد کبھی اسے اپنے سامنے دیکھا۔ (سنن نسائی)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذروان کے کنوئیں سے جب کھجوروں کا گچھا نکالا گیا تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھی بھی تھی اور مبارک بال بھی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت شریفہ بھی جو موم سے بنائی گئی تھی اس میں سوئیاں گڑی ہوئی تھیں اور ان بالوں میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ (روح المعانی)

حضرت جبریل علیہ السلام سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی گیارہ آیات لے کر خدمت نبوی میں تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو سورتوں کی ایک ایک آیت کی تلاوت کرتے گئے اور ایک ایک گرہ کھولتے گئے اور سوئیاں نکالتے گئے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل شفایاب ہو گئے۔

امام اہل سنت شیخ سرفراز صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں ایک یہودی تھا لبید بن اعصم، یہ جادو کے فن کا امام تھا، اس کی فیس زیادہ تھی، ہر آدمی اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا، خیبر کے یہودیوں نے اس کو آ کر کہا اَنْتَ اَعْلَمُنَا فِی السِّحْرِ تو ہم سے جادو کو زیادہ جانتا ہے، جادو کا استاذ ہے

جتنی فیس مانگے ہم دینے کے لیے تیار ہیں محمد ﷺ کو راستے سے ہٹا دے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ اس نے تین دینار لے کر کارروائی شروع کی، اس طرح کہ آنحضرت ﷺ کا اس نے مجسمہ بنایا موم کا، اس میں اس نے گیارہ سوئیاں چبھوئیں اور ایک لمبی رسی لے کر اس پر گیارہ گرہیں لگائیں، ان گرہوں پر اس نے اور اس کی شاگردات (چیلیوں) نے کچھ پڑھا بھی، اس موقع پر یہ آخری دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ (ذخیرۃ الجنان)

یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کے سر کے بال اور کنگھی کے دندانے حاصل کرنے کے لیے ایک نوعمر بچہ جس کا نام عبد القدوس تھا آپ ﷺ کی خدمت کے لیے بھیجا بڑی ہوشیاری کے ساتھ کہ آپ ﷺ کی خدمت کرے گا اور اس بچے کو کہا کہ جب تو کنگھی کرے تو ان کے سر (مبارک) کے جو بال کنگھی میں پھنسیں ان کو سنبھال لینا اور جو میل کچیل کنگھی میں ہو اس کو بھی سنبھال لینا اور کنگھی کے جو دندانے گریں وہ بھی رکھ لینا، بچہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے چند دن آپ ﷺ کی خدمت کی اور یہ ساری چیزیں اکٹھی کر کے لبید بن اعصم کو پہنچا دیں۔

اس نے موم سے آنحضرت ﷺ کا مجسمہ بنایا، اس میں گیارہ سوئیاں چبھوئیں اور ایک لمبی ڈوری لی، اس میں آنحضرت ﷺ کے سر کے بال جوڑے، میل کچیل ملی اور نر کھجور کا کھابا بھی تھا، کچھ ٹسر کے دھاگے تھے، اس ڈوری پر اس نے گیارہ گرہیں لگائیں، ہر گرہ پر جادو کے کلمات خود بھی پڑھ کر پھونکتا تھا اور شاگردات (چیلیاں) رکھی ہوئی تھیں، وہ بھی پڑھ کر پھونکتی تھیں۔ (درسی تفسیر ذخیرۃ الجنان شیخ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ)

اس جادو کا دینی لحاظ سے تو آپ ﷺ پر کوئی اثر نہ ہوا، نہ تبلیغ کے سلسلے میں اور نہ نمازوں کے سلسلے میں، لیکن دنیاوی معاملات میں ہوا، وہ اس طرح کہ کھانا کھایا یاد نہ رہتا کہ کھایا ہے یا نہیں؟ پانی پیا یاد نہ رہتا پیا ہے کہ نہیں اور آپ ﷺ بڑے پریشان اور مغموم رہنے لگے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پہلے جب آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تھے تو بڑے ہشاش بشاش اور خوش ہوتے تھے، مگر اب آتے تو خاموش ہو کر بیٹھ جاتے، نماز پڑھتے، اللہ اللہ کرتے مگر چہرے پر

پہلے کی طرح خوشی نہ ہوتی اور آپ ﷺ کا وزن بھی کچھ کم ہو گیا۔

یہ اثر آپ ﷺ پر کتنا عرصہ رہا؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ روایت نقل کرتے ہیں کہ چھ ماہ رہا، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فتح الباری میں نقل کرتے ہیں کہ ایک سال رہا، آپ ﷺ نے بہت دعا کی اے پروردگار! مجھے سمجھ نہیں آرہی مجھے کیا ہے؟ میری طبیعت پہلے کی طرح نہیں ہے، بار بار دعا کی۔ (ذخیرۃ)

بئر ذروان مدینہ سے باہر ایک غیر آباد کنواں تھا، جبریل اور میکائیل آپ ﷺ کے سرہانے اور پاؤں کی طرف ایک دوسرے سے اسی کنوئیں میں ایک چٹان کے نیچے نبی کریم ﷺ کی کنگھی کے دندانے، آپ ﷺ کے بالوں میں گیارہ گرہوں کا ذکر کر رہے تھے، نبی کریم ﷺ کو اس جادو کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ صبح اٹھے تو خوش تھے کہ اللہ نے انہیں اس جادو کی اطلاع کروا دی، آپ ﷺ اپنے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ اس کنوئیں پر پہنچے، جہاں ذروان کنوئیں کے اوپر آپ ﷺ کھڑے ہوئے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نیچے اترے اور پتھر کے نیچے سے وہ چیزیں نکالیں، یہ دو سورتیں اس موقع پر نازل ہوئیں۔

آپ ﷺ ان دو سورتوں کی ایک ایک آیت تلاوت کرتے جاتے اور ایک ایک گرہ کھولتے جاتے، جب ساری آیات مکمل پڑھ چکے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کے جسم پر کسی قسم کے اثرات باقی نہیں رہے، ذروان نامی کنوئیں سے نکالی گئیں ان چیزوں کو آپ ﷺ فتنہ کے خوف کی وجہ سے مدینہ شریف لے کر نہیں گئے بلکہ اسی کنوئیں کے اندر دفن کروادیں اور حکم دے دیا کہ اس کنوئیں کو مٹی سے بھر دیا جائے، اس کے بعد آپ ﷺ کا معمول بن گیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے ان دونوں سورتوں کو پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور اپنے جسم پر پھیرتے تھے۔

حو دمل لمن حو دمل آج سورۃ الفلق کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول و منظور فرما کر ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی، (حال وارد حدوٹ، مری)

۲۸ جولائی ۲۰۲۰ء بمطابق ۶ ذوالحج ۱۴۴۱ھ بروز منگل بوقت پونے بارہ شب

حروف بینی: ۳۰ نومبر ۲۰۲۰ء بروز پیر سوا گیارہ بجے شب

اَلنَّاس

جنات اور انسانی وساوس کا توڑ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ{۱}مَلِكِ النَّاسِ{۲}اِلٰهِ النَّاسِ ۙ{۳}مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ {۴}الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۚ{۵}مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ{۶} الناس.

جواب ترجمہ: آپ یوں فرمادیجئے کہ میں لوگوں کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ جو لوگوں کا بادشاہ ہے۔ لوگوں کا معبود ہے۔ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے ہٹ جانے والا ہے۔ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ چاہے وہ جنات میں سے ہو، یا انسانوں میں سے۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ إِلٰهِ النَّاسِ: فرمادیجیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس کی جو رب ہے سب لوگوں کا جو کہ سب کا خالق ومالک بھی ہے اور قاہر و قادر بھی اور وہی ہر کسی کے خیر وشر کو پوری طرح جانتا ہے اور ہر شر سے بچانے کی پوری قدرت بھی رکھتا ہے پس وہی پناہ دینے کے لائق ہے، اس لیے ہمیشہ اسی سے اس کی پناہ مانگنی چاہیے۔

یہاں اللہ کی تین صفات کا ذکر ہے رب الناس یعنی سب لوگوں کا رب ملک الناس یعنی سب لوگوں کا بادشاہ اور الہ الناس یعنی سب لوگوں کا معبود کیونکہ یہ تینوں صفات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہی ہے پناہ دینے والا اور وہی پناہ دے سکتا ہے اور اسی کی شان ہے پناہ دینا پھر ان تینوں میں سے سب سے پہلے صفت ربوبیت کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی نعمتوں میں سے وہ سب سے پہلی نعمت ہے جس سے اس کے بندوں کو سرفرازی نصیب ہوتی ہے، اس کے بعد اس کی مالکیت اور بادشاہی کی صفت کو بیان فرمایا گیا ہے کیونکہ اس کا علم وادراک بندے کو اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ عقل وفکر والا ہو جاتا ہے اس کے بعد اس کی الوہیت اور معبودیت کی صفت کا ذکر فرمایا گیا کیونکہ جب انسان عقل و شعور کے اعتبار سے کامل ہو جاتا ہے تو وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ معبود برحق وہی اور صرف وہی

وحدہ لاشریک ہے اور ہر قسم کی عبادت و بندگی اسی اور صرف اسی کا حق ہے۔

سورۃ الناس کی پہلی آیت میں رب الناس فرمایا گیا ہے، رب کے معنی پالنے والے اور ہر حال کی اصلاح کرنے والے کے ہیں اس جگہ رب کی اضافت ناس کی طرف کی گئی اور پہلی سورت میں فلق کی طرف وجہ یہ ہے کہ سورۃ فلق میں ظاہری اور جسمانی آفات سے پناہ مانگنا مقصود ہے اور وہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، جانوروں کو بھی بدنی آفات و مصائب پہنچتے ہیں بخلاف وسوسہ شیطانی کے کہ اس کا نقصان انسان کے ساتھ مخصوص ہے اور جنات بھی اس میں تبعاً شامل ہیں، اس لئے یہاں رب کی اضافت ناس کی طرف کی گئی۔ (مظہری، بیضاوی، معارف القرآن)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ملک الناس یعنی لوگوں کا بادشاہ، اِلٰہ الناس لوگوں کا معبود، ان دو صفتوں کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ لفظ رب جب کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا بھی دوسروں کے لئے بولا جاتا ہے جیسا رب الدار گھر کے مالک کو، رب المال، مال کے مالک کو کہا جاتا ہے اور ہر مالک بادشاہ نہیں ہوتا اس لئے ملک کا اضافہ کیا کہ وہ رب یعنی مالک بھی ہے اور ملک یعنی بادشاہ بھی، پھر ہر بادشاہ معبود نہیں ہوتا اس لئے تیسری صفت ذکر فرمائی الہ الناس۔

ان تین صفتوں کو جمع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر صفت حفاظت کی داعی ہے کیونکہ ہر مالک اپنے مملوک کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح ہر بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کرتا ہے اور معبود کا اپنے عابد کے لئے محافظ ہونا تو سب سے اظہر ہے۔

یہ تینوں صفتیں صرف حق تعالیٰ میں جمع ہیں اُس کے سوا کوئی ان صفتوں کا جامع نہیں اس لئے اس کی پناہ حاصل کرنا سب سے بڑی پناہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے ان تین صفتوں کے ساتھ پناہ مانگنا دعا کی قبولیت کے لئے اقرب ہے کہ یا اللہ آپ ہی ان صفات کے جامع ہیں ہم صرف آپ ہی سے پناہ مانگتے ہیں، یہاں جبکہ پہلے جملہ میں رب الناس آچکا تو بظاہر تقاضا مقام کا یہ تھا کہ آگے اس کی طرف ضمیریں راجع کرنے سے کام لیا جاتا ملکھم والھھم فرمایا جاتا مگر اس لفظ کا بار بار تکرار اس لئے ہے کہ

مقام دعا اور مدح وثناء کا ہے اس میں تکرار ہی بہتر ہے۔

اور بعض حضرات نے لفظ ناس کے بار بار تکرار میں یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ اس سورت میں یہ لفظ پانچ مرتبہ آیا ہے، پہلے لفظ ناس سے مراد بچے ہیں اور لفظ رب اور ربوبیت اس کا قرینہ ہے کیونکہ پرورش کی حاجت سب سے زیادہ بچوں کو ہوتی ہے اور دوسرے لفظ ناس سے جوان مراد ہیں اور لفظ ملک اس کا قرینہ ہے جو ایک سیاست کے معنی رکھتا ہے وہ جوانوں کے مناسب ہے اور تیسرے لفظ ناس سے بوڑھے مراد ہیں جو دنیا سے منقطع ہو کر عبادت میں مشغول ہوں اور لفظ الٰہ اس کا قرینہ ہے جو عبادت کی طرف مشیر ہے اور چوتھے لفظ ناس سے مراد اللہ کے صالح بندے ہیں اور لفظ وسوسہ اس کا قرینہ ہے کیونکہ شیطان نیک بندوں کا دشمن ہے ان کے دلوں میں وسوسے ڈالنا اس کا مشغلہ ہے اور پانچویں لفظ ناس سے مراد مفسد لوگ ہیں کیونکہ ان کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ (معارف القرآن)

یہاں فرمایا گیا کہ رب الناس، کہ لوگوں کا رب، اس میں لوگوں کو خاص کیوں کیا گیا؟ رب تو ساری مخلوق کا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابن القیم جوزی فرماتے ہیں کہ اس میں انسانی عظمت کو ظاہر کرنے اور دوسروں سے اسے ممتاز کرنے کے لیے رب الناس فرمایا گیا ہے (زاد المسیر)

امام رازی رحمہ اللہ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے رب الناس فرمایا گیا، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ استعاذہ (پناہ مانگنے) کا حکم انسان کو دیا گیا ہے، جب انسان اس کو پڑھتا اور اس کی تلاوت کرتا ہے تو گویا یوں کہتا ہے اے میرے رب، اے میرے الٰہ، اے میرے بادشاہ۔ (تفسیر کبیر)

امام ابن القیم جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی تین صفات مذکور ہیں، اس میں پوری توحید آگئی اور توحید کی تمام اقسام اور تمام نکات کو اپنے دامن میں سمو لیا ہے، رب الناس یہ توحید ربوبیت ہے، اللہ رب العزت پوری کائنات کا مالک وخالق اور پوری کائنات کا آمر ہے، سب پر اُس کا امر اور اُس کا تصرف چلتا ہے، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کے حکم سے ہو رہا ہے اور چونکہ یہ مقام پناہ ہے تو اللہ کی صفت ربوبیت ذکر کر دی گئی کہ وہ رب الناس ہے اور قادر ہے تم کو پناہ دینے پر،

تمہارے شر کو ختم کرنے اور تم کو آسائش، امن وسلامتی اور سکون عطا فرمانے پر کیونکہ وہ رب الناس ہے۔

ملک الناس یہ توحید اسماء وصفات ہے کہ وہ ملک الناس ہے، تمام لوگوں کا بادشاہ بلکہ بادشاہوں کا بادشاہ، ملک الملوک، ملک الاملاک، اللہ کی صفت، دنیا کے بادشاہ جن کے پاس کچھ نہیں، وہ بھی بعض وقت پناہ دیتے ہیں لیکن وہ ایک عارضی امر ہے جبکہ آپ نے پناہ کی درخواست کی اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تو ملک (بکسر لام) ہے، احکم الحاکمین ہے۔ بیدہ الملک، اس کے ہاتھ میں کل کائنات کی بادشاہت ہے۔

اللہ نے اپنی اس صفت کا خاص طور پر ذکر کیا تاکہ اللہ سے پناہ طلب کرنے والے مطمئن ہو جائیں کہ جس ذات کی پناہ ہم طلب کرنا چاہتے ہیں وہ ملک، وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، قیامت کا دن ہو گا یہ زمین اور آسمان اللہ کی انگلیوں پر اچھل رہے ہوں گے، اللہ ان کو ہلا رہا ہو گا اور فرما رہا ہو گا این ملوک الارض (زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟) این الجبارون (سرکش کہاں ہیں؟) این المتکبرون (تکبر کرنے والے کہاں ہیں؟)

اللہ تعالیٰ تو زبردستوں کا زبردست اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اللہ کی پناہ طلب کرنے والے! جس ذات کی تو پناہ طلب کرنا چاہتا ہے وہ ملک الناس ہے، وہ تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، کل کائنات کی بادشاہت اور حکومت اس اللہ کے ہاتھ میں ہے تو وہ پناہ دے گا، اس کی پناہ طلب کر، ایسی پناہ دے گا کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی شر کوئی فتنہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے سکے گا۔

الٰہ الناس یہ توحید الوہیت یا توحید عبادت ہے، وہ تمام لوگوں کا معبود ہے، اس کا خالق ومالک ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے کیونکہ جو خالق ہے وہی معبود ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ ۲۱) اے لوگو! عبادت کرو اس رب کی جو تمہارا خالق ہے۔

وہ خالق ہے اور کوئی خالق نہیں، تو خالق ہی عبادت کے لائق ہوتا ہے، ہر قسم کی عبادت اسی کے لیے ہے اور ان عبادات میں سے ایک اور عبادت استعاذہ کی ہے اور پناہ کی ہے اور پناہ اللہ ہی کی طلب کرو، وہی پناہ دینے والا ہے۔ (تفسیر معوذتین)

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ: وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے ہٹ جانے والا ہے۔ امام فراء اس کا معنٰی بیان کرتے ہیں کہ شیطان کے شر سے، معنٰی ہے وسواس والے کے شر سے، مضاف کو حذف کر دیا گیا، وَسواس (واؤ کے فتحہ) کا معنٰی وسوسہ کرنے والا، وِسواس کا معنٰی وسوسہ ہے، وسوسہ سے مراد دل کی بات ہے، وَسوسہ، وِسوسہ شکاری اور کتوں کی آہٹ اور زیورات کی جھنکار اور آوازوں کو عربی میں وسواس کہا جاتا ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وسواس خناس ابلیس کے بیٹے کو کہتے ہیں۔

شیطان کی صفت خناس ذکر کی گئی ہے، اس کا معنٰی چھپنا، چونکہ یہ بھی بہت زیادہ چھپا رہتا ہے اسی لیے اسے خناس کہا جاتا ہے، ایک قول یہ کیا گیا کہ جب بندہ ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ الشَّيْطَانَ وَاضِعٌ خَطْمَهُ عَلَى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ، فَإِذَا ذُكِرَ اللهُ خَنَسَ، وَإِذَا نُسِيَ اللهُ الْتَقَمَ قَلْبَهُ فَوَسْوَسَ، شیطان اپنی ناک انسان کے دل پر رکھے ہوئے ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جائے تو اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے اور اس میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بندہ جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان اس کے دل سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چلا جاتا ہے اور جب بندہ غافل ہوتا ہے تو اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے تو اسے آرزو بھی دلاتا ہے۔ ابراہیم تیمی نے کہا وسوسہ ڈالنے والا اپنے عمل کا آغاز وضو سے کرتا ہے، ایک قول یہ کیا گیا کہ اسے خناس اس لیے کہتے ہیں کیونکہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو وہ شیطان لوٹ آتا ہے، خنس کا معنٰی لوٹنا ہے۔

حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ الوسواس الخناس میں دو توجیہیں ہیں ① وہ وسوسہ کے ذریعے ہدایت سے پھیرنے والا ہے، ② وہ وسوسہ کے ذریعے یقین سے لوٹانے والا ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الخناس سے مراد شیطان ہے جس کی سونڈ کتے کی سونڈ کی طرح ہوتی ہے، جب انسان غافل ہو جاتا ہے تو شیطان اس میں وسوسہ ڈالتا ہے، جب انسان رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جاتا ہے تو یہ چھپ جاتا ہے۔

ابن قیم الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ الفلق میں ان شرور سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے جو خارج سے انسان کو پیش آتے ہیں اور سورۃ الناس میں اس شر عظیم کا ذکر ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جس سے بچنا خود اس کی اپنی قوت مدافعت پر منحصر ہے، دنیا میں شر کی دو ہی بڑی قسمیں ہیں ایک ذنوب اور معاصی کا شر، دوسرا مصائب اور تکالیف کا شر، سورۃ الفلق میں مصائب اور تکالیف کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے اور سورۃ الناس میں ذنوب اور معاصی کے شر سے پناہ طلب کی گئی ہے، جس کا اصل ہمیشہ شیطان کا وسوسہ ہوتا ہے لیکن انسان کو اس کے اثرات روکنے کا اختیار حاصل ہے اور آدمی اس پر غالب آسکتا ہے۔ (تفسیر معوذتین)

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیطان کا وسوسہ تمام گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی جڑ ہے اور شیطان کا وسوسہ ایک ایسا شر ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور اس کا تعلق انسان کے کسب اور اختیار سے ہے اور اس لیے اس سے بچنے کا وہ خود ذمہ دار ہے کیونکہ شیطان کا وسوسہ اس وقت تک کچھ بھی شر نہیں پیدا کرتا جب تک آدمی خود اس کو قبول نہ کرے اور اس پر عمل پیرا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں ہماری تنبیہ کے لیے شیطان کا ایک مکالمہ نقل فرمایا ہے جو قیامت کے روز وقوع میں آئے گا، شیطان کا قول ہے کہ میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا ہاں میں نے تمہیں (گمراہی اور باطل کی طرف) بلایا تو تم نے (جلدی سے اور بے دلیل) میرا کہا مان لیا تو (آج) مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ (سورت ابراہیم، تفسیر معوذتین)

فرماتے ہیں کہ وسواس کے شر سے، خناس کے شر سے، یہاں یا تو دو نام ہیں شیطان کے، وسواس اور خناس، یا دو صفتیں ہیں شیطان کی، اس شیطان کے شر سے پناہ مانگتا ہوں وہ الوسواس بھی ہے اور الخناس بھی، الوسواس کا معنیٰ وسوسے پیدا کرنے والا، وسوسے خوب کرنے والا، تکرار ہے جس چیز میں

وسوسہ کرے بندہ قبول نہ کرے وہ اور کرے خوب کرے، کبھی باز نہ آئے، یہاں تک کہ بندے کی موت واقع ہو جائے، شیطان وسواس ہے، خوب وسوسے پیدا کرتا ہے، بندے کو ورغلاتا ہے، دشمن ہے ہمارا ازلی۔ شیطان سے کئی قسم کے شر صادر ہوتے ہیں جن سے پناہ مانگنا لازم تھا اس لیے شر کو اس کی ذات کی طرف مضاف کیا گیا ہے تاکہ استعاذہ اس کے تمام شرور پر مشتمل ہو، وسوسہ کو چھوڑ کر شیطان کے دوسرے شرور بھی ہیں مثلاً

① وہ چور ہے اور لوگوں کے مال چراتا ہے، جس کھانے یا پینے کی چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ ذکر کیا جائے اس سے اپنا حصہ چرا لینے میں وہ کامیاب ہوتا ہے، اسی طرح جس گھر میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے لوگ غافل ہوں وہ اس گھر میں شب باش ہوتا ہے۔

② ایک شر اس کا یہ ہے کہ جس کے دل میں وسوسہ ڈال کر اس سے گناہ کراتا ہے پھر خود ہی اس کا پردہ فاش کر کے لوگوں میں اس کو رسوا و ذلیل اور بدنام کرتا ہے، بسا اوقات ایک شخص پوشیدہ طور پر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہوتا، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے دن اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی ہے اور لوگوں کا موضوع سخن اسی کا گناہ ہے، یہ تمام شیطان کی کارستانی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ستار ہے اپنے بندہ کے گناہوں اور اس کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے لیکن شیطان جو اس کا دشمن ہے اس کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے، بہت سے لوگ اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔

③ شیطان کا ایک شر یہ بھی ہے کہ انسان کوئی نیکی کا کام کرنا چاہے تو وہ اس کا راستہ روکتا ہے اور اس کو نیکی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، دنیا میں جتنی بھی نیکیاں ہیں ہر ایک نیکی کے راستہ پر شیطان بیٹھا راستہ روک رہا ہے اور اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس راستہ پر کوئی نہ چلے اور اگر کوئی اس کی مخالفت کر کے چل پڑے تو وہ رہزن کی طرح اس کو تشویش میں ڈال کر اور ہر قسم کی رکاوٹ اس کے سامنے لا کر اسے آخر تک پہنچنے نہیں دیتا لیکن اگر کوئی خوش قسمت اور باہمت انسان نیکی کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو ایسی باتوں پر آمادہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے جس سے اس کا وہ عمل برباد ہو جائے، اس نے قسمیں کھا کر کہا تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔

شیطان نے کہا تھا کہ یقیناً میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تیرے صراط مستقیم پر بیٹھ جاوں گا اور پھر ان کا راستہ روکنے کے لیے ان کے آگے کی طرف سے اور ان کے پیچھے کی طرف سے اور ان کی دائیں اور بائیں جانب سے آکر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی کوشش کروں گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تو ان میں سے اکثروں کو ناشکر گزار پائے گا۔

④ شیطان کا ایک شر یہ ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے تو وہ اس کی گدی پر تین گرہیں لگا دیتا ہے جو اس کے لیے تہجد کے واسطے اٹھنے میں رکاوٹ بنتی ہے، صحیح بخاری و مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان آدمی کے سر کے پیچھے رات میں سوتے وقت تین گرہیں لگا دیتا ہے اور ہر گرہ پر یہ افسوں بھی پھونک دیتا ہے کہ سو جا، ابھی رات بہت باقی ہے۔

پھر اگر کوئی بیدار ہو کر اللہ کی یاد کرنے لگا تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، پھر وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، پھر اگر (فرض یا نفل) پڑھے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے، اس طرح صبح کے وقت چاق و چوبند، خوش مزاج رہتا ہے ورنہ سست اور بد باطن رہتا ہے۔ جو اٹھا، وضو کیا اور نماز پڑھی وہ بندہ نشیط ہو گیا، اگر وہ نہ اٹھا نہ اللہ کا ذکر کیا، نہ وضو کیا اور نہ نماز پڑھی، ویسے ہی نہائے، خوشبو لگائی اور اپٹوڈیٹ صاف ستھرا بن جائے، دفتر میں جا رہا ہے، گاڑی میں جا رہا ہے، اللہ کے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے وہ کسلان بھی ہے اور خبیث النفس بھی ہے۔

انسان سو رہا ہوتا ہے اور دشمن اپنی کارروائیاں کر رہا ہوتا ہے، اللہ اکبر اس نے وسوسے کے ذریعے ہمارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحیح بخاری و مسلم، ترمذی و نسائی اور مسند احمد کی ایک قدسی روایت میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا جہنم کا گروہ نکال کر جہنم میں ڈال دو، پوچھا جائے گا کہ اے اللہ! بعث النار کیا ہے؟ جہنم کی جماعت کہاں ہے؟ جہنم کی فوج کہاں ہے؟ تو اللہ فرمائے گا ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔

ہمارے ماں باپ کو جنت سے نکالا، اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت آدم کی ذریت کو اتنا ورغلایا، اتنا صراط مستقیم سے دور کیا کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے شیطان کے چیلے بن گئے اور جہنم

کالقمہ بن گئے اور صرف ایک شخص ہدایت کے اور جنت کے قابل قرار پایا۔

⑤ شیطان اپنی پرستش چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اللہ کی توحید اور عبادت دنیا سے مٹ جائے اور دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے حصے میں اس کی دعوت کا بول بالا ہو اور لوگ اپنے معبود برحق کو چھوڑ کر اس کی پرستش میں مشغول ہو جائیں۔

⑥ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوانا بھی اسی شیطان کی کارستانی تھی کہ اہل بابل کو اس پر آمادہ کیا کہ رئیس الموحدین ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل الرحمان علیہ السلام کو آگ میں پھینکیں۔

⑦ اس نے یہودیوں کو ورغلایا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کے لیے جدوجہد کریں، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی حمایت کی اور کافروں کے شر سے انہیں محفوظ رکھا، پہلے کے حق میں فرمایا یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلٰمًا عَلٰٓى إِبْرٰهِيمَ (انبیاء ۶۹) اے آگ! ابراہیم کے حق میں ٹھنڈی اور سلامتی کا موجب ہو جا۔

جب کہ دوسرے کے بارے میں بتایا وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (نساء ۱۵۷) انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو صلیب دینے میں کامیاب ہوئے بلکہ ایک شبہہ میں ڈال دیے گئے۔

⑧ شیطان ہی کے کرتوت تھے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو کافروں کے ہاتھ سے شہید کرایا، فرعون کو خدائی کا دعویٰ کرنے، ملک میں سخت فساد پھیلانے اور غریبوں پر مظالم ڈھانے پر آمادہ کیا اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے برخلاف کافروں کو اکسایا کہ ان کے قتل کی سازش کریں اور ان کی رسالت کو ناکام بنانے کے لیے ان کے ساتھ لڑائیاں لڑیں۔

⑨ رسول اکرم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ وہ انگارہ لے کر سامنے سے نمودار ہوا اور قریب تھا کہ آپ ﷺ کو اس سے نقصان پہنچے، لیکن آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے پناہ لی اور اس پر اللہ کی لعنت بھیجی جس پر وہ بھاگ گیا۔

⑩ اسی طرح یہودیوں کو ورغلایا اور انہوں نے آپ ﷺ پر جادو کیا۔

الغرض جب اس کی یہ حالت تھی کہ وہ انبیاء تک سے نہیں چوکتا اور سید الانبیاء کو نماز کی حالت میں چھیڑا تو اس سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے شر سے مخلصی پانا کس قدر دشوار ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کا فضل شامل نہ ہو تو معاملہ نہایت سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی انسان کو اپنے فضل و کرم اور احسان سے شیطانی داؤ پیچ اور شرارتوں سے محفوظ رکھے، شیطان ہماری تباہی، بربادی اور ہلاکت کے لیے ہمہ وقت چوکس رہتا ہے، رحمت کائنات ﷺ نے فرمایا کہ شیطان خون کی طرح انسان کے بدن میں دوڑتا رہتا ہے، انسانی خون کی حرارت اور اس کا سیلان جن لوگوں نے دیکھا انہیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ جسم انسانی میں کس تیز رفتاری سے دوڑتا اور رواں دواں رہتا ہے، شیطان بھی اسی سریع الحرکتی سے انسانوں کو تباہ کرنے میں کمربستہ ہے، وہ انسان کو ورغلاتا ہے اسے جادہ حق سے ہٹا کر چاہ ضلالت میں پھینک دیتا ہے، ایسا وار کرتا ہے کہ انسانی آہ و بکا سننے اور اس کی فریاد رسی کرنے والا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

ابن جوزی رحمہ اللہ شیطانی شر کی اقسام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہیں گننا اور شمار کرنا دشوار اور مشکل کام ہے، لیکن شیطانی شر کی بڑی بڑی چھ قسمیں ہیں،

① ان میں پہلی قسم شرک و کفر ہے، سب سے بڑا شر شرک و کفر ہے، جس کا نتیجہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دشمنی ہوتی ہے اور جس کی عقوبت، آخرت میں ابدی جہنم ہے، شیطان سب سے پہلے انسان کو اسی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو گویا اس کے دل کی مراد پوری ہو جاتی ہے کیونکہ ایسا شخص العیاذ باللہ ابلیس کا داعی اور اس کا نائب بن جاتا ہے۔

② شیطانی شر کی دوسری قسم بدعت کو عام کرنا ہے، اگر وہ پہلی قسم میں کامیاب نہ ہو تو پھر وہ آدمی کو بدعت کی طرف بلاتا ہے اور اس کو وہ فسق و فجور پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ پہلی قسم کا تعلق اعتقاد سے ہے اور دوسری قسم کا تعلق عمل کی خرابی سے ہے، جب انسان گناہ کرتا ہے تو اکثر اوقات انسان کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے اس لیے وہ عموماً توبہ پر مائل ہو جاتا ہے لیکن چونکہ بدعت کو آدمی اپنے زعم میں برا سمجھتا ہی نہیں بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ میں ایک اچھا کام کر رہا ہوں اس لیے وہ اس سے تائب نہیں

ہوتا اور نہ ہی اس کے تائب ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

بدعت کی بنیاد مخالفت رسول ﷺ پر ہے اس لیے اس کا درجہ شرک اور کفر کے قریب قریب ہے، لہٰذا بدعت کی طرف بلانا شیطان لعین کا مرغوب اور پسندیدہ مشغلہ ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے نائبوں کی تعداد میں ایک اور کا اضافہ کر دیا، دراصل بدعت کا نقصان کفر اور شرک سے کچھ کم نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا شر ان سے بڑھ کر خرابی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کا دوست نما دشمن اور اس کا بدعت کی طرف بلانا شہد میں زہر ملا کر دینے کی حیثیت رکھتا ہے۔

③ شیطانی شر کی تیسری قسم کبائر کا ارتکاب ہے، اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے سنت پر ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشی ہو تو شیطان کا تیسرا داؤ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو کبائر کے ارتکاب پر آمادہ اور اس میں مبتلا کر دے اور اگر وہ شخص عالم ہے اور وہ لوگ اس کو قابل اقتدا سمجھتے ہیں تو شیطان لعین کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کو پھسلا دے تاکہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں اور اس کے فیض صحبت سے جو تھوڑا بہت فائدہ ہو رہا تھا اس کا دروازہ بند ہو جائے۔

جب وہ بدقسمتی سے گناہ کر بیٹھتا ہے تو پھر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو لوگوں میں شہرت دے اور عوام میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو ابلیس کے نائب بن کر اس عالم کی اس لغزش کو مشہور کرتے پھرتے ہیں اور بزعم خود اس کو ایک ثواب کا کام سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کو ابلیس کا نائب اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے "جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کی بری بات مشہور ہو جائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ (توبہ ۱۹)

④ شیطانی شر کی چوتھی قسم صغائر کا ارتکاب ہے، اگر شیطان کو اس کوشش میں بھی مایوسی ہو اور وہ کبیرہ کے ارتکاب پر بھی کسی کو مائل نہ کر سکے تو وہ صغائر کرا لینے پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ صغائر بھی جمع ہو کر کبیرہ کی طرح انسان کی ہلاکت کا باعث ہو سکتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے "حقیر گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، کیونکہ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی

قوم بیابان میں اتر پڑے اور ہر ایک ان میں سے جا کر جنگل سے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لائے، یہ ٹکڑے جمع کر کے ایک بڑی آگ مشتعل کی جا سکتی ہے، جس پر روٹی پکا سکتے اور کباب بھون سکتے ہیں۔

صغائر کے ارتکاب میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ مرتکب ان کو بہت ہلکا اور ناقابل اعتناء سمجھ کر ان کا ارتکاب کرتا ہے لیکن کسی کبیرہ کا کرنے والا جو اپنی عاقبت کی بابت، ہراساں ہے اس سے بہت بہتر ہے جو صغائر کو حقیر سمجھ کر ان کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔

⑤ شیطانی شر کی پانچویں قسم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صغائر کا بھی ارتکاب نہیں کرتا تو وہ اس کو ایسے مباحات (جن کے کرنے نہ کرنے میں ثواب عذاب نہیں) میں مشغول کر دیتا ہے، جن میں مشغول رہ کر انسان ثواب کے کاموں سے محروم رہتا ہے اور جن کا ثواب باوجود قدرت کے کھو بیٹھنا نقصان عظیم ہے، شیطان کو اس سے بھی خوشی ہوتی ہے کہ وہ کسی کو ثواب اور درجات کے حاصل کرنے سے محروم کر دے۔

⑥ شیطانی شر کی چھٹی قسم یہ ہے کہ وہ انسان کو افضل عمل سے روکتا ہے، اگر کوئی صاحب بصیرت شخص اپنے وقتِ عزیز کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ اس کو مباحات میں بھی ضائع نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ اس کا ایک ایک لمحہ اگر کسی نیک کام میں صرف کیا جائے تو اس سے ملک ابد کے درجات عالیہ خریدے جا سکتے ہیں۔

تو ایسے شخص کے ساتھ شیطان ایک اور داؤ کھیلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ افضل عمل سے باز رکھ کر عمل مفضول (جو پہلے کے مقابلہ میں کم تر ثواب کا موجب ہو) میں مشغول کر دیتا ہے تاکہ ان کو کم از کم ثواب کی زیادتی سے محروم کر دے۔

یہ ایک ایسا دامِ فریب ہے کہ جس کا پول اکثر لوگوں پر نہیں کھلتا اور بڑے بڑے عابد اس میں گر پڑتے ہیں کیونکہ جب ایک شخص اپنے دل میں کسی نیکی اور کارِ ثواب کے کرنے کی رغبت پاتا ہے تو اسے گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کا محرک اور ترغیب دہندہ شیطان ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور شیطان اس کو کسی نیکی کے کرنے کی اس لیے ترغیب دیتا ہے کہ اس کو اس بہتر نیکی سے مانع ہو جس کے کرنے سے اس کو بہت زیادہ ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔ (تفسیر معوذتین)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب میں دو گھر ہیں ایک میں فرشتہ رہتا ہے دوسرے میں شیطان (فرشتہ اس کو نیک کاموں کی رغبت دلاتا رہتا ہے اور شیطان برے کاموں کی) پھر جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب تک وہ ذکر اللہ میں مشغول نہیں ہوتا تو اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اس میں برائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے (ابو یعلی، مظہری، تفسیر معارف القرآن)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ من شر الوسواس برے خیال کے اثر سے اور یہ اعوذ کے ساتھ متعلق ہے یعنی میں برے خیالات کی برائی سے پناہ لیتا ہوں اور برا خیال چند طریقوں سے نقصان دیتا ہے، ایک تو مزاج خراب کرنے میں، دوسرا تدبیر نفس میں، تیسرا معرفت میں، چوتھا عبادت میں، پانچواں قرب خداوندی حاصل کرنے میں اور آدمی کی عمر کی ابتدا سے لے کر انتہاء تک اسے یہی کام درپیش آتے ہیں اور جب یہ کام خلل میں پڑ گئے تو اس کی عمر برباد ہو گئی۔ (تفسیر عزیزی)

اَلْخَنَّاسُ: وہ جو بھاگتا ہے، یہ وسوسے کی صفت ہے، صاحب وسوسہ کے اعتبار سے اس لیے کہ شیطان ، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن پاک اور فرشتوں کی حاضری سے طبعی طور پر بھاگتا ہے اور یہ صفت لانا اس لیے ہے کہ شیطان کا کام بہت مشکل ہے اور اس کے شر سے محفوظ رہنا رب الناس کے حضور التجا کیے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ جب کوئی دشمن مقابلے میں کھڑا ہو، اسے دفع کرنا آسان ہوتا ہے اور جب وہ کھڑا نہ رہے، بار بار عداوت کرے تو ہر وقت حفاظت اور احتیاط سے گزارنا چاہیے، اور یہ کام بہت دشوار ہے اسی لیے ارباب حکومت وسلطنت کے لیے ان دشمنوں کو دفع کرنا جو کہ ایک دم ہجوم کر کے جنگ شروع کر دیں، ان ڈاکوؤں اور چوروں کو دفع کرنے سے زیادہ آسان ہے جو کہ قابو پانے کے وقت اپنا کام کر کے غائب ہو جائیں اور ان کا تدارک ہر غیب و مخفی کا علم رکھنے والی ذات یعنی رب العزت جل شانہ کے سوا بہت دشوار ہوتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ: جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں شیطان خنزیر کی شکل میں ہوتا ہے وہ انسان میں یوں دوڑتا ہے جس طرح رگوں میں خون دوڑتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس امر پر تسلط عطا کیا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مقصود ہے، بخاری کی روایت کے مطابق شیطان انسان میں خون کے دوڑنے کی طرح دوڑتا ہے، مقاتل رحمہ اللہ کے قول کو اس روایت سے قوت ملتی ہے۔

ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ سے التجا کی کہ وہ مجھے شیطان دکھائے اور ابن آدم جو اس کا مکان ہے وہ مجھے دکھائے، میں نے اسے دیکھا اس کے ہاتھ انسان کے ہاتھوں میں ہیں، اس کے پاؤں انسان کے پاؤں میں ہیں، اس کے راستے انسان کے جسم میں ہیں مگر اس کی ناک ہے جو کتے کی ناک کی طرح ہے، انسان جب بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموش ہوتا ہے تو شیطان اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، ابو ثعلبہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے مطابق شیطان انسان کے جسم میں منتشر ہوتا ہے اور انسان کے ہر عضو میں اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت عبد الرحمٰن بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ بوڑھے ہو گئے تو اس وقت فرمایا کہ میں بدکاری سے اب بھی محفوظ نہیں ہوں اور مجھے شیطان سے کوئی اطمینان نہیں ہے کہ وہ شرم گاہ میں داخل ہو جائے اور اس میں کیل ٹھونک دے، اس قول سے پتا چلتا ہے کہ شیطان انسانی جسم میں کس طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے، حضرت مقاتل رحمہ اللہ کے فرمان کا بھی یہی مفہوم ہے، وسوسہ سے مراد یہ ہے کہ وہ مخفی کلام کے ذریعے اپنی طاقت کی طرف بلاتا ہے، آواز سنے بغیر اس کا مفہوم اس کے دل تک جا پہنچتا ہے۔

شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اور سینوں کو وسوسوں کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں نفس ناطقہ کے اثرات حیوانیت کے ساتھ مخلوط ہو کر فساد کا رنگ جلد قبول کرتے ہیں، بخلاف دوسرے اعضاء کے، اس لیے کہ جگر میں ردی وسوسے نہیں ہیں، نفس ناطقہ اپنے نفس نباتی کے ساتھ کام کرتا ہے اور دماغ میں اگرچہ فساد کی توقع ہے کیونکہ قوت وہمیہ عقلی قوت کو پریشان کرتی ہے لیکن

اس کا زیادہ تر فساد نفس حیوانی سے اثرات بلند کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ حکمت والوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ: خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ اس آیت سے پتا چلا کہ انسانی قلوب میں وسوسہ ڈالنے والے صرف جنات وشیاطین ہی نہیں ہوتے انسانوں میں سے بھی شیطانی صفات کے حامل لوگ یہ کام کرتے ہیں، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں شیاطین ہیں جہاں تک جنوں کے شیاطین کا تعلق ہے وہ لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے جہاں تک انسانوں کے شیطان کا تعلق ہے وہ علانیہ اس کے پاس آتا ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جنوں میں سے شیاطین ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے شیاطین ہوتے ہیں، انسانوں اور جنوں کے شیاطن میں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی سے کہا کہ کیا تو نے انسانوں اور جنوں کے شیاطین سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی ہے؟ اس نے پوچھا کیا انسانوں میں سے بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اسی طرح ہم نے بنایا ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن۔ (الانعام ۱۱۲)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قوم اس طرف گئی ہے یہاں ناس سے مراد جن ہیں، انہیں ناس اس طرح نام دیا گیا ہے جس طرح انہیں رجال قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ** (الْجِنّ: ٦) اسی طرح انہیں قوم اور نفر کا نام بھی دیا گیا ہے، اس تعبیر کی بنا پر الناس کا عطف الجنۃ پر ہے یہاں تکرار الفاظ کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہے۔

ایک عرب جب یہ واقعہ بیان کر رہا تھا تو اس سے ذکر کیا گیا تو اس نے کہا **جَاءَ قَوْمٌ مِنَ الْجِنِّ فَوَقَفُوا فَقِيلَ: مَنْ أَنْتُمْ؟ فَقَالُوا: نَاسٌ مِّنَ الْجِنِّ**، جنوں کی ایک قوم آئی، وہ آکر کھڑی ہو گئی، ان سے پوچھا گیا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم جنوں میں سے ناس ہیں، یہی فراء کے قول کا معنیٰ ہے۔ (قرطبی)

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وسواس سے مراد شیطان ہے اور من الجنہ یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ وہ جنوں میں سے ہیں اور الناس کا عطف الوسواس پر ہے معنیٰ یہ ہو گا کہہ دیجیے میں وسواس کے شر سے لوگوں کے رب کی پناہ چاہتا ہوں، جو جنوں میں سے ہے اور لوگوں کے شر سے بھی پناہ چاہتا ہوں، اسی وجہ سے مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انسانوں اور جنوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے، جنہ یہ جنی کی جمع ہے، جس طرح انس اور انسی کہا جاتا ہے، ھاء جماعت کی تانیث کے لیے ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ابلیس جنوں کے سینوں میں یوں وسوسہ اندازی کرتا ہے جس طرح لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے، اس تعبیر کی بنا پر فی صدور الناس تمام کے لیے عام ہے اور من الجنۃ والناس اس کا بیان ہے، جو اس کے سینے میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ من شر الوسواس کا معنیٰ وہ وسوسہ ہے جو جنوں اور لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے میری امت کے اس فعل سے درگزر فرمایا ہے جو اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے مطابق عمل نہ کرے یا اس کے مطابق گفتگو نہ کرے۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں من الجنہ میں وسواس کا بیان ہے، یعنی برے خیالات والا، خواہ جنوں کی جنس سے ہو جیسے شیاطین کہ دھوئیں کے غلبے کی وجہ سے ان میں طبعی تاریکی پختہ اور راسخ ہے اور انتظامات میں خلل ڈالنے، فاسد مشورے اور تدابیر طبعی طور پر ان کا خاصہ ہیں اور آگ ہونے اور لطیف ہونے کے باہم امتزاج کی وجہ سے ان اجسام کا انسانی ارواح کے مساموں میں سرایت کرنا جلدی اور آسان ہوتا ہے اور جب وہ اجسام جو کہ ان فاسد تدابیر اور باطل آراء کے حامل ہوتے ہیں، ارواح کے ساتھ مخلوط ہوتے ہیں تو ان کا اثر ارواح کو پہنچتا ہے اور ارواح ان تدابیر اور آراء کی حامل ہو جاتی ہیں اور اسی کے مطابق بدن میں حرکت اور سکون پیدا کرتی ہیں اور گناہ صادر ہوتے ہیں، اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ شیطان آدمی کے رگ وپے میں خون کی جگہ دوڑتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کی کوئی حد نہیں ہے، زیادہ تر برائی، فسق

اور فجور کی طرف بلاتا ہے، اگر کبھی نادر طور پر طاعت اور نیکی کی طرف دعوت دیتا ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو چاہتا ہے کہ آسان نیکی میں مصروف کر کے عظیم نیکی ضائع کر دے جیسا کہ نماز کا وقت کسی بیمار کی مزاج پرسی میں بلاوجہ گزار دیں یا چاہتا ہے کہ آسان نیکی کو بہت بڑی برائی کا سبب بنا دے جیسے کسی منگتے کو روٹی دینا اور پھر اس پر احسان رکھنا اور ہنسی مذاق کرنا۔ (تفسیر عزیزی)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ شیطانی وساوس کے بارے فرماتے ہیں کہ وہ زیادہ تر دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ عام لوگوں کے دلوں میں ذات وصفات الٰہی، اسرار نبوت اور امور اخروی کی تحقیق، جبر واختیار کے مسئلہ اور قضاوقدر کے راز کی تحقیق اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لڑائیوں کے اختلافات میں حق کے تفتیش کا وسوسہ ڈالتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ تحقیق کے دوران وہ ان حقائق کا انکار کر دیں اس لیے وہ ان کی سمجھ کے مرتبے سے بالاتر ہیں۔

اور بعض کو بے بنیاد شبہات کے ساتھ بزرگوں سے امید شفاعت، معمولی نیکیوں پر ثواب عظیم کی امید، کرم الٰہی کا عام ہونا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونا، دل میں ڈالتا ہے اور بعض کو اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ثواب سے ناامیدی اور محرومی کا وسوسہ ڈالتا ہے اور بت پرستوں کو قرب خداوندی حاصل کرنے کا فریب دیتا ہے اور دیوؤں، پریوں اور جنوں کی پوجا چھوڑنے میں دنیوی نقصان پہنچنے سے ڈراتا ہے جیسے بچوں کا فوت ہونا اور مال میں نقصان ہونا۔

اور نماز پڑھنے والوں کے لیے پہلے ان کی نیت میں ریاء شامل کر دیتا ہے، پھر رکعات کی گنتی اور ارکان کی ادائیگی میں سہو اور بھول جانے کو داخل کر دیتا ہے اور بعض کو نیت اور نغمہ قرأت درست کرنے اور حروف کے مخارج کو صحیح کرنے میں گرفتار کرتا ہے اور زکوٰۃ دینے میں فقر سے ڈراتا ہے اور اگر کبھی زکوٰۃ دی ہو تو ریاء، سمعہ، خودبینی اور منگتوں پر احسان چڑھا کر اسے ضائع کرتا ہے، حرام طریقے میں خرچ کرنے کو نیک اور اچھا کر دکھاتا ہے اور خیال میں یوں بات ڈالتا ہے کہ لذت تو صرف شہوت اور مرتبے میں ہے۔

اور غصے کے وقت دل میں یوں خیال گزارتا ہے کہ اگر تو غصے کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا تو تجھ

پر ہمیشہ عجز اور ذلت کا داغ رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جہاں بھی کوئی مشکل وارد ہو، اسے کئی گناہ بڑھا کر دکھاتا ہے جبکہ کفار کے لیے بتوں کی پوجا میں سخت مشکلات کو برداشت کرنا انہیں بالکل آسان اور سہل دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے کو ناجائز اور ممنوع ظاہر کرتا ہے اور جان کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔

اور کفار کو بتوں کی راہ میں اپنے آپ کو قتل کرنے اور بیٹے اور شوہر کی محبت میں جل جانے پر ابھارتا ہے اور جن کے ہاں حلال طور پر خوبصورت، آراستہ اور معطر عورتیں موجود ہوں، انہیں چکلہ میں بدذات، بدخلق، نجس اور ناپاک عورتوں کے ساتھ بدکاری کی دعوت دیتا ہے اور سرداروں کو وافر دولت پاس ہونے کے باوجود لوگوں کے اموال میں گرفتار کرتا ہے اور ان کے دلوں میں معمولی خیال کے ساتھ جان کو ضائع کرنا آسان کر دیتا ہے اور اس قدر جو بیان ہوا اس کے وسوسوں کے طلسمات کا ایک حصہ ہے۔ (تفسیر عزیزی)

ابن قیم جوزی رحمہ اللہ من الجنہ والناس کے تحت لکھتے ہیں کہ جن وانسان موذی بھی ہوسکتے ہیں، وسواس بھی ہوسکتے ہیں، کچھ شیطان جن ہوتے ہیں، کچھ شیطان انسان ہوتے ہیں، کچھ انسان شیطان ہوتے ہیں بلکہ شیطانوں سے بدتر ہوتے ہیں، اتنے بدتر کہ شیطان بھی ان کے شر سے متاثر ہو کر، ان کے پلید لباس سے متاثر ہو کر ان کے چیلے بن جاتے ہیں، جس طرح بعض نیک لوگ ہوتے ہیں جن کا علم، ان کا زہد، ان کا تقویٰ مثالی ہوتا ہے تو نیک جن ان کے پاس آجاتے ہیں، ان سے تلمذ کرتے ہیں، ان سے پڑھتے ہیں، کسب فیض کرتے ہیں، ان کی صحبت سے متمتع ہوتے ہیں، اسی طرح بعض شیطان کی طرح خبیث ہوتے ہیں، اتنے بدکردار، اتنا ان کا سازشی ذہن ہوتا ہے کہ شیطان بذات خود حیران ہوتا ہے کہ یہ تو مجھ سے بھی آگے ہیں، یہ تو ہمیں بھی کاٹ گیا، اس کے پاس آتے ہیں اور آکر کہتے ہیں تو ہمارا گرو ہے ہم تیرے چیلے ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں انسانی شیطان کے شر سے مراد خود اپنے نفس کا وسوسہ ہے کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دل میں برے کاموں کی طرف رغبت ڈالتا

ہے اسی طرح خود انسان کا اپنا نفس بھی برے ہی کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنا سکھلایا ہے۔ (فوائد فی مشکلات القرآن، معارف)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان با اختیار خود مشغول ہو اور غیر اختیاری وسوسہ و خیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اس پر کوئی گناہ ہے۔

مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ فلق میں تو اللہ تعالیٰ، جس کی پناہ مانگی گئی ہے اس کی صرف ایک صفت پر اکتفا کیا گیا یعنی رب الفلق، اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی وہ بہت ہیں جن کو اولا من شر ما خلق میں اجمالاً ذکر کیا، پھر ان میں سے خاص تین آفات کو الگ بیان فرمایا اور سورۃ ناس میں جس چیز سے پناہ مانگی گئی ہے وہ تو صرف ایک ہی ہے یعنی وسواس اور جس کی پناہ مانگی ہے اس کی اس جگہ تین صفات بیان کر کے پناہ کی دعا کی گئی ہے۔

انسان کے دو دشمن ہیں، ایک انسان اور دوسرا شیطان، قرآن و سنت کی روشن تعلیمات میں ان دونوں دشمنوں کو رام کرنے کے طریقے بیان فرمائے گئے ہیں، مفسر قرآن علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں جگہ جگہ ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے ان دونوں انسانی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پورے قرآن میں تین ہی آیتیں اس مضمون کی آئی ہیں۔ ایک آیت سورہ اعراف میں ہے کہ اول فرمایا، {خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الْأَعْرَافِ: ۱۹۹) یہ تو انسانی دشمن کے مقابلے کی تدبیر ارشاد فرمائی جس کا حاصل عفو و درگزر اور اس کو نیک کام کی تلقین اور اس کی برائی سے چشم پوشی بتلائی۔ اسی آیت میں آگے فرمایا وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یہ تلقین دشمن شیطانی کے مقابلے میں فرمائی جس کا حاصل اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔

دوسری آیت سورۃ المومنون میں اول دشمن انسانی کے مقابلے کے علاج میں ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ

أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ (المؤمنون ۹۶) یعنی برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو پھر دشمن شیطانی کے مقابلے کے لئے فرمایا وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ * وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ، یعنی اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ (المومنون ۹۸، ۹۷)

اور تیسری آیت سورۃ حم سجدہ کی ہے جس میں اول دشمن انسانی کی مدافعت کے لئے ارشاد فرمایا ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۳۴) وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (فصلت ۳۵) یعنی تم برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو اگر ایسا کرلو گے تو مشاہدہ ہو گا کہ تمہارا دشمن تمہارا مخلص دوست بن جائیگا۔ اور یہ بات صرف انہی کو عطا ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور یہ بات اسی کو عطا ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو۔

اسی آیت میں دوسرا جز دشمن شیطانی کے مقابلے میں یہ فرمایا وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ لیجیے، بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

سورۃ الاعراف میں بھی شیطانی وساوس اور شیطانی کچوکوں سے بچاؤ اور حفاظت کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، یہاں سورۃ فصلت میں بھی یہی تلقین کی جارہی ہے کہ جب شیطان تمہیں کچوکے لگائے یا تمہارے دلوں میں وساوس پیدا کرے تو وساوس سے بچانے اور محفوظ رکھنے والی ذات اللہ جل شانہ سے پناہ مانگ لو، اس طرح شیطانی حربوں اور اہداف سے تم بچ جاؤ گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں یہ آیات نقل فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جنی اور انسی شیاطین سے بچاؤ کے لیے یہی تین آیات ہیں ان کے علاوہ چوتھی کوئی آیت اس معنیٰ اور مفہوم میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ انسانی دشمن سے بچاؤ کے لیے اس کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، جب کہ شیطان دشمن سے یقینی طور پر بچاؤ اور حفاظت کا طریقہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنا ہے کیونکہ شیطان کے سامنے کوئی محبت اور احسان کا طریقہ کار کارگر

نہیں ہوتا۔

شیطانی دشمن ابن آدم کی ہلاکت ہی کا طلب گار ہوتا ہے، اس لیے کہ شیطان کی اولاد آدم اور آدم کے ساتھ سخت عداوت اور دشمنی ہے، اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ، اے اولاد آدم! شیطان تمہیں کسی آزمائش میں نہ ڈال دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکالا تھا۔ (سورۃ الاعراف ۲۷)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں شیطان کو انسانی دشمن قرار دیا ہے، انسانوں کو خبردار کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ شیطان کو اپنا دشمن سمجھتے رہو وہ اپنے پیروکاروں کو دوزخ میں لے جانے کی دعوت دیتا رہتا ہے، وہ ہر حربہ استعمال کرکے انہیں دوزخ کی طرف کھینچتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ [فَاطِرٍ: ٦] یقین جانو کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو۔ وہ تو اپنے ماننے والوں کو جو دعوت دیتا ہے وہ اس لیے دیتا ہے تاکہ وہ دوزخ کے باسی بن جائیں۔

شیطان کو اگر اس بات پر دکھ اور تکلیف ہے کہ اسے آدم کی وجہ سے جنت سے دھتکارا گیا، راندہ درگاہ کیا گیا تو رب العالمین کو بھی سخت جلال آیا ہوا ہے، ان کے فرمان کی اس نے مخالفت کی تھی، اللہ کے حکم کے سامنے کوئی سرتابی نہیں کرسکتا مگر اس بدبخت شیطان نے اللہ کے حکم کو نہیں مانا تھا۔

اسی موقع پر جب اسے جنت سے نکالنے کا حکم دیا گیا تو اس نے طیش میں آکر کر قسمیں کھائیں تھیں، اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: آدم کے آگے سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا،

چنانچہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، اس کے بعد اللہ فرماتے ہیں أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا (الْكَهْفِ: ۵۰) کیا پھر بھی تم میرے بجائے اسے اور اس کی ذریت کو اپنا رکھوالا بناتے ہو۔ حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن

ہیں؟ (اللہ تعالیٰ کا) کتنا برا متبادل ہے جو ظالموں کو ملا ہے۔

یہ شیطان ہی تھا جس نے انسانوں کے باپ آدم علیہ السلام کے سامنے قسمیں کھا کر انہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ اور مخلص ہوں، وہ مخلص اور خیر خواہ نہیں تھا، اس نے انہیں دھوکہ دیا تھا اور ان کے سامنے جھوٹ بولا تھا، جب ہمارے والدین کے ساتھ وہ مخلص نہیں تھا تو ہمارے ساتھ کیسے مخلص ہو سکتا ہے، یہ وہی شیطان ہے جس نے کہا تھا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (٨٢) إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ [ص: ٨٣] تیری عزت کی قسم میں گمراہ کر کے رہوں گا ان سب کو، سوائے تیرے برگزیدہ بندوں کے۔

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ شیطان کا بس ایسے لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان لائے ہیں، اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

شیطانی مکر و فریب، دجل و دسیسہ کاریوں سے بچاؤ کے لیے معوذتین کی تلاوت بہت ہی کارآمد اور مفید ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اس کے اور جنت میں داخل ہونے کے درمیان موت کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہیں (نسائی) جو لوگ اسے رات کو پڑھ کر سوئیں گے تو صبح ہونے تک فرشتے اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں (بخاری) جو شخص دن میں سو بار لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر پڑھ لے گا وہ اس دن شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا۔ (صحیح الجامع)

اسی طرح کثرت کے ساتھ ذکر کیا جائے، نبی کریم ﷺ صبح و شام معوذتین کی تلاوت کرتے تھے، فجر کی نماز کے بعد تین بار اور مغرب کی نماز کے بعد تین بار یہ سورتیں پڑھتے تھے، ہر نماز کے بعد ایک ایک بار اور سوتے وقت تین بار ان سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے اور ان کے شروع میں سورۃ الاخلاص بھی پڑھتے تھے۔

کثرت سے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا جائے، گھروں میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کی جائے، آیۃ الکرسی کے علاوہ سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں پڑھنا لازمی ہے، اسی

طرح انسان اپنے غصے پر قابو رکھے کیونکہ غصہ شیطانی راستوں کو ہموار کرتا ہے، فضول اور لغویات سے پرہیز کیا جائے یہ باتیں شیطانی تسلط کا باعث بنتی ہیں، شکم سیری سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ پیٹ بھر کر کھانے سے شیطان کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔

خاتمۃ التفسیر

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج مورخہ ۳۰جولائی ۲۰۲۰ء بمطابق ۸ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ بروز جمعرات پونے ایک بجے دن تفسیر معارف الفرقان کی سولہویں جلد پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع اور عاجزانہ کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول اور منظور فرمائے، اسے میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اعزہ اور اقارب کے لیے، میرے برادران وہمشیرگان کے لیے، میرے دادا، دادی، نانا، نانی، میرے ددھیالی رشتہ داروں، میرے ننھیالی رشتہ داروں اور میرے سسرالی رشتہ داروں کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، میرے مشفق ومہربان اساتذہ کرام، میرے مشائخ کرام اور میرے مخلص معاونین ومساعدین کے لیے اس تفسیر کو صدقہ جاریہ بنائے۔

اظہار تشکر

میں یہاں اپنی تفسیر کے اختتام پر اپنے بہت ہی مخلص، بہت ہی مہربان، بہت ہی شفیق، بہت ہی ہمدرد، بہت ہی بہی خواہ، دینی کاموں میں پیش پیش، صدقات جاریہ میں مخلصانہ خدمات پیش کرنے والے بھائی، دوست اور بزرگ جناب الحاج خواجہ عارف قاسم صاحب حفظہ اللہ کے لیے خصوصیت سے دعاگو ہوں کہ اللہ انہیں صحت وعافیت والی زندگی عطافرمائے، ان کی اھلیہ محترمہ، ان کے صاحبزادگان جناب حافظ محمد احمد عارف، جناب اسجد عارف، جناب اسامہ عارف، ان کی بڑی صاحبزادی محترمہ رابعہ عارف اور چھوٹی صاحبزادی محترمہ رافعہ عارف کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ ان سب کو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطافرمائے، اس تفسیر کو خواجہ عارف قاسم صاحب کے والدین ماجدین اور ان کی فیملی کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اس تفسیر کو طبع کروانے اور عامۃ الناس اور خواص

تک پہنچانے میں خواجہ صاحب حفظہ اللہ کا بڑا واضح کردار رہا ہے، جسے میں ہمیشہ پوشیدہ رکھتا رہا، مگر آج میرے قلم کو ان کے تذکرہ سے کوئی روک نہیں سکا، اللہ ان کی خدمات جلیلہ کو قبول و منظور فرمائے۔ آمین

قریباً پانچ سال تک دن رات کی مشغولیت کے بعد آج میرے کریم ورحیم رب نے فضل و کرم فرمایا تو یہ کام کسی حد تک پایہ تکمیل کو پہنچ گیا. دوست احباب اور پڑھنے والے بھائیوں سے درخواست ہے کہ وہ دعا کرتے رہیں، اللہ ہماری ساری دینی کاوشوں کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم ﷺ

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

حال وارد کاشانہ فقیر حدوٹی۔ حدوٹ مری

۳۰ جولائی ۲۰۲۰ء ۸ ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ بروز جمعرات ایک بجے دن

حروف بینی: یکم دسمبر ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت پونے ایک بجے شب (مناواں لاہور)

☆☆☆☆